زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد:۱۷ شمارہ ستمبر،اکتوبر ۲۰۰۸ء

مجلسِ مشاورت
قارئینِ چہارسُو

زرِ سالانہ
دلِ مضطرب نگاہِ التفات

چہارسُو کا زیرِ نظر شمارہ !
حوا کی اُن تمام بیٹیوں سے
منسوب ہے
جو دورِ جاہلیت کی نا واجب رسومات کی پیروی میں
اپنے حقوق
بلکہ
زندگیوں سے
محروم ہو رہی ہیں!!!

بانی مدیرِ اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیرِ مسؤل

گلزار جاوید

مدیرِ معاون

بینا جاوید

رابطہ: 537، ویسٹرج-III، راولپنڈی۔ فون: 5462495-51-92 فیکس: 5467235 ای میل: waqars_oma@yahoo.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس، مرکس بازار، راولپنڈی

متاع

سرورق، پس ورق...... شعیب حیدر زیدی

کمپوزنگ..........حافظ انعام الحق

قرطاسِ اعزاز (منظوم) ......سرور انبالوی

نیم روں ....ڈاکٹر وحید احمد 4

اُوڑم..........ڈاکٹر منیرالدین احمد 5

کس نے انھیں تحریر کیا...ڈاکٹر منیرالدین احمد 11

براہِ راست.......... گلزار جاوید 14

مولوی کی فضلی.......پروفیسر سمیع اللہ قریشی 25

انسانی نفسیات کی تفہیم....پروفیسر فتح محمد ملک 28

ایک باغی کی داستان..........انتظار حسین 30

سوچیاں اور منٹو..........جمیل یوسف 31

تہذیبی سفر کا استعارہ..........امجد علی شاکر 33

زخمی سترلہ..........ڈاکٹر منیرالدین احمد 37

نقلانے..........ڈاکٹر منیرالدین احمد 45

مالک رام کا مذہب....ڈاکٹر منیرالدین احمد 49

لافانی عشق..........ڈاکٹر منیرالدین احمد 56

مزاجِ دوستانہ..........قاری شا 60

نقشِ کفِ پا 63

شبنم رومانی، شہریار، محمود شام، رب نواز مائل، شبنم شکیل، مظفر حنفی، صابر آفاقی، ہارون ایمن، پی ایس جین جوہر، یوگیندر بہل تشنہ، غالب عرفان، کرشن کمار طور، ملک زادہ جاوید، ضیا شبنمی۔

افسانے

اپنی مٹی میں گم..........جوگندر پال 69

چہارسُو

گرداب..........مقصود الٰہی شیخ 73

اُبکائی کے بعد..........انل ٹھکر 79

قربانی..........وقار بن الٰہی 84

فاقہ..........نند کشور وکرم 87

نقش بہ سنگ..........ڈاکٹر فیروز عالم 89

جبری مشقت.......... گلزار جاوید 92

تجدیدِ ہنر 95

صدیق شاہد، فراق مرزا، عرش صہبائی، سہیل غازی پوری، بہرام طارق، افق دہلوی، حمیر نوری، سیفی سرونجی، کرامت بخاری، اطہر عزیز، سجاد مرزا، انجم امروہوی، صابر عظیم آبادی، حنیف ساجد، شگفتہ نازلی۔

تخلیقِ عصر 100

ناز انشائیہ کا تعارف...... عطیہ سکندر علی

طائرِ قبلہ نما 103

ستیہ پال آنند، محمود شام، انور سدید، شباب للت، منظور حسین ایاز، عبدالعزیز خالد، محمود الحسن، یوگیندر بہل تشنہ، صبا اکرام، غالب عرفان، قیصر نجفی، فیصل عظیم، بھگوان داس اعجاز، سرور انبالوی، حامد لطیف، علی محمد فرشی، خیال آفاقی، بے دل بیدلی۔

ڈرامہ 114

قصہ کہانی کا.......... نعیم احمد بشیر

رس رابطے 118

جستجو، ترتیب، تدوین..........وقار جاوید

قرطاسِ اعزاز

ذکر انسانیت کی ہے کہ جس پہ یہ روانہ ہے
اسی باعث تو اِس کا معترف سارا زمانہ ہے

امینِ فہم و دانش اور خلوص و مہر کا جویا
دیارِ غیر میں اِس سے وطن کا نام ہے اونچا

کمایا نام اِس نے علم و حکمت اور تدبّر سے
نہیں ہے واسطہ کوئی تفاخر اور تکبّر سے

نگارش کی ہیں نظریں اِس نے مہر و ماہ و حکمت پر
ہے شاہد اِس کا فکر و فن سدا سے اِس کی عظمت پر

رہیگا نام روشن اس کا تاریخِ ادب میں بھی
کہ جگمگ کہکشاں کی طرح ہر تحریر ہے اس کی

"مزاجِ دوستاں"، "لافانی عشق" اور "نورِ حرم" کیا ہے
یہ ہیں شہکار اِس کے اِن میں اِس کا دل دھڑکتا ہے

ڈاکٹر منیر الدین احمد

نوازا تیرا مداحوں نے تیری کاوشوں کو بھی
کہ تیری ایک اِک تحریر ہے شمعِ خود آگاہی

یہ تُو نے خون سے جو "داستانِ زندگی" لکھدی
لہو سے آندھیوں میں شمع روشن کر کے یوں رکھدی

رہیں گی زیست کی راہیں ہمیشہ ان سے تابندہ
رہیگا اُن سے تیرا نام زندہ اور پائندہ

امانت سے ہی "ادا" کی چراغِ صدق روشن ہے
جو سچ پوچھو اُسی کی ضو سے ہی جگمگ ترا فن ہے

لکھی ہے داستاں یاروں نے تیری یوں عقیدت سے
کہ اِک اِک حرف مملو جس کا ہے سوزِ محبت سے

دکھائے ہیں نئے گوشے تیری فہم و فراست کے
وہ گوشے جو کہ شاہد ہیں سراسر تیری عظمت کے

کے نام

یہ "امجد شاکر" اور یوسف بھی سب مداح ہیں تیرے
"سمیع اللہ قریشی"، انتظار اور جاوید کہتے ہیں

نئے انداز سے تو نے لکھی ہے داستاں دل کی
خبر دیتی ہے ہر تحریر تیری راہ و منزل کی

اُگائے پھول تو نے علم و حکمت اور صداقت کے
نہیں بکھرے دیے تو نے "دیے" فہم و فراست کے

حدیثِ دلبری تو نے لہو سے یوں رقم کر دی
کہ گویا طاقِ علم و فہم کی "اِدراک" سے بھر دی

ملک مداح تیرا اور تیرے فن کا شیدا ہے
کہ اِک اِک حرف سے اُس کے خلوصِ قلب پیدا ہے

دعا دل سے سُرور انبالوی کی ہے تُو شاداں ہو
کہ ہر اِک گام ساتھی تیرا فہم و علم و عرفاں ہو

سُرور انبالوی

۹ ستمبر ۲۰۰۸ء، راولپنڈی، صحت و فتح میں لکھی گئی

۱۔ ڈاکٹر عطا احمد　۲۔ جناب جمیل یوسف　۳۔ جناب انتظار حسین　۴۔ گوہر جاوید　۵۔ پروفیسر فتح محمد ملک

پیہم رواں

ڈاکٹر لوتا احمد (جرمنی)

نام — حالیہ۔ منیر الدین احمد
پیدائشی۔ محمد یحییٰ
قلمی۔ یحییٰ فضلی

والدین — راجہ عبدالرؤف خان (۱۸۹۹ء۔۱۹۶۶ء)
امۃ العزیز بیگم (۱۹۰۵ء۔۱۹۵۳ء)

دادا — مولوی محمد فضل خان چنگوی (مؤلف "اسرارِ شریعت" مترجم "فتوحاتِ کبیر")

پیدائش — ۲۳ نومبر ۱۹۳۳ء بمقام راولپنڈی

تعلیم — میٹرک (اسلامیہ ہائی سکول، راولپنڈی) ۱۹۵۱ء
مولوی فاضل (جامعہ احمدیہ۔ ربوہ) ۱۹۵۶ء
شاہد (جامعۃ المبشرین۔ ربوہ) ۱۹۵۹ء
بی اے (پنجاب یونیورسٹی) ۱۹۵۸ء
ڈی فل (ہمبرگ یونیورسٹی۔ جرمنی) ۱۹۶۷ء

ملازمت — مبلغ جماعت احمدیہ جرمنی (اکتوبر ۱۹۶۰ء۔ فروری ۱۹۶۲ء)
ریسرچ سکالر (جرمن اورینٹ انسٹی ٹیوٹ، ہمبرگ)
۱۹۶۷ء۔۱۹۹۹ء
استاد (ہمبرگ یونیورسٹی) ۱۹۶۸ء۔۱۹۹۳ء

شادی — ۱۴ نومبر ۱۹۶۶ء (اہلیہ ڈاکٹر لوتا احمد)

مطبوعات

افسانوں کے مجموعے

۱۔ زرد ستارہ۔ لاہور۔ (پہلا ایڈیشن) ۱۹۸۸ء (دوسرا ایڈیشن) ہمبرگ ۱۹۹۱ء
۲۔ شجرِ ممنوعہ۔ لاہور۔ ۱۹۹۱ء
۳۔ بنتِ حرام۔ نئی دہلی۔ ۱۹۹۹ء
۴۔ گجری ہوئی کونج۔ دہلی۔ (پہلا ایڈیشن) ۲۰۰۰ء۔ لاہور (دوسرا ایڈیشن) ۲۰۰۲ء
۵۔ لافانی عشق۔ لاہور۔ ۲۰۰۸ء

آپ بیتی

۶۔ لمحے سایہ زندگی کا میرا۔ لاہور۔ ۲۰۰۶ء

مراسلات

۷۔ حدیثِ یاراں۔ مکتبات۔ دہلی ۱۹۹۹ء
۸۔ آغا بابر سے مراسلت۔ زیرِ طبع

تراجم

۹۔ معاصر جرمن ادب۔ نمائندہ ادیبوں کا مجموعہ۔ ہمبرگ۔ ۱۹۸۶ء
۱۰۔ آدمی جس نے اپنے آپ کو کھلا دیا۔ جرمن کہانیاں۔ لاہور۔ ۱۹۹۵ء
۱۱۔ یخ محل۔ کہانیاں، افسانے، خطبات بیچتا۔ لاہور۔ ۱۹۹۵ء
۱۲۔ جون سایہ۔ جرمن شاعر ایرِیش فرِیڈ کی ایک سو نظمیں۔ لاہور۔ ۱۹۹۳ء
۱۳۔ میں اسے ڈھونڈتا پھرا۔ دس جرمن شاعروں کی ایک سو نظمیں۔ دہلی۔ ۱۹۹۹ء
۱۴۔ ہوری دروازے۔ جرمن شاعر وولفگانگ بیشلر کی ایک سو نظمیں۔ دہلی۔ ۱۹۹۹ء

15. Pakistanische Literatur. Übersetzungen aus den pakistanischen Sprachen. Herausgegeben von Munir D. Ahmed unter Mitwirkung von Annemarie Schimmel. Hamburg 1986

(پاکستانی ادب۔ پاکستان کی زبانوں سے تراجم)

سوانح حیات

۱۶۔ مولوی محمد فضل خان۔ ایک عالم باعمل کی سوانح حیات۔ کرلیلز۔ ۲۰۰۳ء

تحقیق

17. Muslim Education and the Scholars' Social Status upto the 5th century Muslim Era (11th century Christian Era) in the light of TahkhBaghdadZürich1968

۱۸۔ نظامِ آموزش اسلامی۔ پایگاہ اجتماعی دانشمندان مسلمان در پرتو تاریخ بغداد۔ پارسی کردہ محمد حسین ساکت۔ طبع اول۔ مشہد ۱۳۶۸ ہجری شمسی۔ طبع دوم۔ تہران۔ ۱۳۸۲ ہجری شمسی۔

۱۹۔ تاریخ التعلیم عند المسلمین و المکانۃ الاجتماعیۃ لعلمائهم مستقاۃ من "تاریخ بغداد" "للخطیب البغدادی۔ قلم بالترجمہ والتلخیص والتعلیق الدکتور سامی الصقار۔ الریاض۔ المملکۃ العربیۃ السعودیۃ۔ ۱۹۸۱م۔ ۱۴۰۱ھ

متعدد مطبوعات مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کے سیاسی و مذہبی مسائل کے بارے میں ہیں جو مختلف زبانوں میں چھپیں۔ ان میں باضابطہ کتابوں کے علاوہ پچاس کے لگ بھگ علمی رسائل میں چھپنے والے مضامین اور کتابوں کے جواب شامل ہیں۔ طوالت سے بچنے کے لئے انہیں یہاں پر الگ الگ درج نہیں کیا جا رہا۔

افورسم

ادب کی ایک باغی صنف

ڈاکٹر منیر الدین احمد

افورسم (Aphorism) ادب کی قدیم ترین اصناف میں سے ہے۔ یہ اصطلاح یونانی زبان سے ماخوذ ہے جس کا لفظی معنی "مختصرات" ہے۔ اس کا پہلا استعمال طب میں ملتا ہے جہاں پر اس کا مقصد حکمت اور طب کے قواعد کو مختصر الفاظ میں بیان کرنا تھا۔ چنانچہ اس معنی میں اس کا استعمال زمانہ ہائے وسطیٰ تک ملتا ہے۔ آگے چل کر اس کا استعمال علوم طبیعی اور علم قانون میں بھی ہونے لگا۔ بطور ادبی صنف کے اس کا اطلاق اختصار کے ساتھ کہی گئی دانشمندی کی بات پر ہوتا ہے۔ اپنی ہیئت کے اعتبار سے اسے ادب کی مختصر ترین صنف کا نام دیا جا سکتا ہے جس کے بارے میں گابریل لاؤب نے کہا تھا کہ ادب کا مستقبل افورسم میں ہے کیونکہ اس کی قلم نہیں چلائی جا سکتی۔ اس کا خالق اپنے مافی الضمیر کو اکثر صورتوں میں محض ایک جملے میں ادا کرتا ہے اگرچہ ایک جملے کی قید ضروری نہیں ہے۔ البتہ اختصار اس صنف کی بنیادی شرائط میں سے ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر مختصر جملہ افورسم کا درجہ رکھتا ہے۔ مثلاً "[illegible]" اپنے اختصار کے باوجود افورسم نہیں کہلا سکتا۔

عربی زبان میں اسے حِکمۃ مُوجزۃ (مختصر حکیمانہ بات) کہتے ہیں۔ اردو میں اس صنف کے لئے قولِ محال، مقولہ، کہاوت، مثل اور محاورہ کی اصطلاحات پائی جاتی ہیں۔ اخباروں اور رسائل کے کالموں میں بچی کھچی جگہوں کو "اقوالِ زریں" سے پُر کیا جاتا ہے جن کا طرزِ تخاطب اکثر ناصحانہ ہوتا ہے۔ یہی رنگ "حکمت کی باتوں" پر بھی حاوی نظر آتا ہے۔ یورپ کے عصری ادب میں اقوال کے اندر حکمت اور بلاغت کا عنصر ضرور پایا جاتا ہے مگر نصیحت کی خاطر انگلی کا اٹھانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مشفق خواجہ نے افورسم کے لئے "بلیغیات" کی اصطلاح ایجاد کی تھی۔

اس صنف کا دوسرا نام یورپی زبانوں میں Sentence بھی ہے جسے عربی میں "قول ماثور" کہتے ہیں۔ فارسی میں اسے "حکمت" کا نام دیا جاتا ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ "جملہ جامع" اور "قولِ محال" بھی کیا جاتا ہے۔ البتہ مستعمل اصطلاح "ضرب المثل" یا "مقولہ" ہے۔

یورپی زبانوں میں اس کا ایک پرتو Maxime کہلاتا ہے۔ اردو میں اس کے لئے گُر، اصول، قاعدہ، حکیمانہ قول اور دانشمندوں کا مقولہ کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔

اس صنف کی ایک کڑی قدیم یونانی ادب میں Gnome کے نام سے پائی جاتی تھی اور شاعری کا حصہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کا لفظی ترجمہ "مکمل ادراک" ہے۔ ہندوستان کی زبانوں میں اس سے ملتی جلتی صنف "کہاوت" کے رنگ میں پیدا ہوئی اور اپنی ہیئت کے اعتبار سے شاعری کا ہی حصہ قرار پائی۔ چنانچہ قدیم کہاوتیں منظوم ہوا کرتی تھیں۔ مشرق کی بہت سی زبانوں میں آج تک "بیت" کا رواج پایا جاتا ہے۔

اس صنف کو انسانی معاشرے کی قدیم ترین ادبی اور فنی ایجاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس بات کی گواہی محاورات سے ملتی ہے جن کی عمر کوئی نہیں جانتا۔ اس کے باوجود یہ امر لازمی ہے کہ کوئی شخص ان کو پہلی بار استعمال کرتا ہے۔ دوسرے اس کی نقل کرتے ہیں اور حسبِ توفیق اس میں ردوبدل کرتے چلے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک وقت آتا ہے کہ محاورہ مکمل ترین شکل اختیار کر لیتا ہے اور زبان زدِ عام ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر افریقہ میں رائج یہ محاورات ملاحظہ کریں۔

☆ دنیا جس کی مچھلیاں ہم نہیں کھاتے، اس میں ہم نہاتے بھی نہیں۔
☆ اپنی جھونپڑی میں کبھی اتنا اندھیرا نہیں ہوتا، جتنا غیر جگہوں میں۔
☆ امیر اور نادار جنگل کی ایک ہی پگڈنڈی پر چلتے ہیں۔
☆ شیر کی وحشت دور سے نظر آ جاتی ہے، انسانوں کی دکھائی نہیں دیتی۔
☆ کتے کو شکار والے روز نہیں سدھاتے۔
☆ لکڑی کا ٹکڑا اگر دس برس تک بھی پانی میں پڑا رہے تب بھی وہ مگرمچھ نہیں بن سکتا۔
☆ اجنبی خواہ کتنی بڑی آنکھیں کیوں نہ رکھتا ہو، اسے وہ کچھ نظر نہیں آتا، جسے گاؤں والے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔

اس صنف کی قدامت مسلمہ امر ہے۔ بلکہ اس کا ہر ملک اور ہر معاشرے میں پیدا ہونا تصور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ قدیم مصری تہذیب میں اس کے آثار ملتے ہیں۔ دسویں صدی قبل از مسیح کی یہ تحریر ایک پتھر پر کندہ ملی ہے۔

☆ سارے اتنی شیخی نہ بگھارو، جیسے تم لاجواب ہوتے ہو۔
☆ جس کے پاس دولت کی فراوانی ہوتی ہے وہ دوسروں کو کھانے پر قدرت رکھتا ہے۔

چینی تہذیب میں بھی اس صنف کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ فلاسفر لاؤ تسے کا قول ہے۔

☆ ایک اچھا حکمران اس بات کا اہتمام کرتا ہے کہ لوگوں کے پیٹ بھرے ہوں، مگر ذہن خالی ہوں۔

توریت (انجیل کا پرانا عہدنامہ) بالخصوص ایسے اقوال سے بھری پڑی ہے جن پر اس صنف کی تعریف کا اطلاق ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ قول ملاحظہ کریں۔

☆ حد سے بڑھ کر نیک منصف بنو اور نہ ہی عقل مند سوائے اس کے کہ تم اپنی تباہی چاہتے ہو۔

پرانی تہذیبوں میں ایسے ایسے اقوال ملتے ہیں جو ہمارے زمانے کے خیالات لگتے ہیں۔ چنانچہ پولش طنز نگار بروڈسکی کا کہنا ہے کہ ہمارے وقتوں میں افورزم لکھنے والے خوشی سے پھولے نہیں سماتے، اگر انہیں ایک ایسی بات کہنے میں کامیابی ہو جائے، جو در حقیقت قدیم چینیوں کے ہاں ضرب المثل تھی۔

یونانی فلاسفر چلیاسخ نے بادشاہوں اور دوسرے معتبر لوگوں کے اقوال کو کتابی صورت میں جمع کیا تھا۔ عربی زبان میں بھی اس کا رواج پایا جاتا تھا۔ چنانچہ عربی ادب کے اندر بالخصوص طبقات کی کتابوں میں، جو سوانح عمریوں کا مجموعہ ہیں، ایسے اقوال کی روایت پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

مذہبی کتابوں میں بھی اس صنف کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ چنانچہ ہندوؤں کے اندر بدھ مت کے پرانوں میں، کنفوشس کی تحریروں میں اور یہودیوں کی تفسیرات میں اس کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ یورپی زبانوں میں کئی ایک نامور ادیبوں، فلاسفروں اور شاعروں نے اس صنف کو اپنایا ہے۔ مشہور ترین ان میں سے پاسکال، سوفٹ، گوئٹے، جان پول، ہائنے، شوپن ہاور اور نیٹشے (جس کو ہمارے ہاں نطشے لکھا جاتا ہے) برنارڈ شا اور مارک ٹوین شامل ہیں۔

کسی کا قول ہے کہ شاعری اور فلاسفی دونوں اس صنف کا منبع ہیں۔ فلاسفی اسے غور و فکر کرنے کی ترغیب دیتی ہے اور شاعری اسے الفاظ کے مناسب انتخاب کا ڈھنگ سکھاتی ہے۔ البتہ افورزم کے اندر لطیفے کے برعکس صرف ایک مطلب کا بیان مقصود نہیں ہوتا، بلکہ اس میں مطالب کے کئی پہلو پوشیدہ ہوتے ہیں جن کو قاری اپنے اپنے ظرف اور حالات کے مطابق سمجھ پاتا ہے یا نہیں سمجھ سکتا۔ در حقیقت یہ امر ادب کی بنیادی ضروریات میں سے ہے۔ جب تک قاری تخلیق کار کے ساتھ تعاون نہیں کرتا، اس وقت تک ادب اپنا مقصود حاصل نہیں کر پاتا۔ اپنے اختصار کے سبب اس تعاون کی ضرورت بالخصوص افورزم کو دوسری تمام اصناف سے زیادہ ہوتی ہے حتیٰ کہ جدید نظم سے بھی بڑھ کر۔ کیونکہ جدید نظم کو زیادہ سے زیادہ یہ امر پیش آ سکتا ہے کہ قاری اسے نہ سمجھ پائے گا، جب کہ افورزم کو یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ قاری کہیں اس کا مطلب الٹا نہ لے لے۔

افورزم کو سمجھنے کے لئے حاضر دماغی اور عقل و دانش کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور قاری کو ان حالات اور تقاضات کا علم ہونا چاہئے، جن کے تحت ان کی تخلیق ہوئی تھی۔ طنز افورزم کی بنیادی شرط ہے۔ ایسی طنز جس کی کاٹ کا کوئی مداوا نہ پایا جاتا ہو۔ پولش ادیب سٹانسلاو یرزی لیٹز کا قول ہے۔ "حقیقی طنز زخمی نہیں کرتی، وہ جان سے مار ڈالتی ہے۔" حملہ در اصل ایک آدھ شخص پر نہیں ہونا چاہئے، بلکہ سارے معاشرے پر۔ اس طرح کہ معاشرے کے فرسودہ قواعد و ضوابط اور رسوم و رواج کا خاتمہ ہو جائے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر سوچ بچار کے نئے خطوط کے لئے ابھر کر رکھ دیتا ہو۔

افورزم کے بارے میں کسی نے کہا تھا کہ اس میں نصف سچائی مضمر ہوتی ہے۔ سگمنڈ یل اوڈب کا کہنا ہے کہ یہ نصف سچائی والی بات افورزم کے لئے بہت بڑا اعزاز ہے۔ در اصل افورزم جھوٹ میں لپٹی ہوئی سچائی کے مترادف ہے۔ افورزم کا خالق بڑی بے باکی کے ساتھ اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے، تو اس صنف کو ادب کی دوسری تمام اصناف پر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے۔ ہمارے وقتوں میں لوگوں نے اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اس امر پر چوٹ کرتے ہوئے سٹانسلاو یرزی لیٹز نے کہا تھا۔ "میں ایک رائے رکھتا ہوں، مگر مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔"

ذیل میں جرمن، پولش اور یوگوسلاوین ادب کے چند نمائندہ ادیبوں کے افورزم پیش کئے جا رہے ہیں۔

جرمن ادب

گیورگ کرسٹوف لیختمبرگ (Georg Christoph Lichetenberg) (۱۷۴۲ء۔۱۷۹۹ء)

☆ کسی شخص پر چابک بازی کی جائے تو کسی بال کے اوپر جا کر تھمتی ہے۔

☆ جس قدر چھوٹی حیثیت کا کوئی افسر ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ اکڑفوں کرتا ہے۔

☆ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ دنیا کے اہم ترین منصب (بادشاہت) کے لئے وہ امتحان بھی پاس نہیں کرنے پڑتے، جس کی توقع پتھری کاٹنے والے کے استاد سے رکھی جاتی ہے۔

☆ بعض لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو اتنی دیر تک سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے، جب تک ان کے کان نہ کاٹ دیئے جائیں۔

☆ تیر قسمت کے طوفانوں کے مقابلے کے لئے بہترین لنگر ہے۔

☆ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ہر وہ کام عقلمندی کا ہوتا ہے جسے انسان سنجیدہ چہرے کے ساتھ کرتا ہے۔

☆ کیا حال چال ہے، اندھا ایک لنگڑے سے پوچھتا ہے۔ جیسے آپ دیکھ رہے ہیں، لنگڑا جواب دیتا ہے۔

☆ بعض نامور شخصیتوں کی کتابوں میں مجھے ان تحریروں کو پڑھنے کی خواہش ہے جن کو انہوں نے کاٹ دیا تھا، بجائے ان حصوں کو پڑھنے کے جن کو انہوں نے رہنے دیا تھا۔

☆ مکمل ترین بندر بھی کسی بندر کی تصویر نہیں بنا سکتا۔ یہ کام صرف انسان کر سکتا ہے مگر صرف انسان اس امر کو خوبی سے تعبیر کرتا ہے۔

☆ انسان کتنی ہی بڑی تاریخی شخصیتوں کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ کس قدر

اچھا کام کر سکتے تھے، جو انہوں نے نہیں کیے۔ اس کا جواب وہ ان الفاظ میں دے سکتے ہیں۔ ذرا غور کرو کہ ہم کس قدر بُرے کام کر سکتے تھے، مگر ان سے درگزر کر گئے۔

یوہان وولفگانگ گوئٹے (Johann Wolfgang Goethe) (۱۷۴۹ء۔۱۸۳۲ء)

☆ جس چیز کو انسان نہیں سمجھتا اس کی ملکیت کا وہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔

☆ بعض لوگ اپنے دوستوں کی کمزوریوں پر نظر رکھتے ہیں۔ اس سے انسان کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ میں نے ہمیشہ اپنے مخالفوں کی خوبیوں پر غور کیا ہے اور ان سے سبق سیکھا ہے۔

☆ پہلے انسان اپنے آپ کو سبق دیتا ہے، پھر وہ دوسروں سے سیکھنے کے قابل بنتا ہے۔

☆ جو شخص غیر زبانیں نہیں جانتا وہ اپنی زبان سے بالکل ناواقف ہے۔

☆ انسان کو کبھی دھوکا نہیں دیا جاتا۔ انسان خود اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔

☆ پاگل اور عقلمند دونوں بے ضرر ہوتے ہیں۔ صرف نیم پاگل اور نیم عقلمند خطرناک ہوتے ہیں۔

☆ اگر انسان تمام قانون پڑھنا چاہے تو اس کے پاس قانون کی خلاف ورزی کے لئے کوئی وقت نہ بچے۔

☆ مینڈک ہر اس جگہ پر نہیں ہوتے، جہاں پر پانی پایا جاتا ہے مگر اس جگہ پر جہاں پر مینڈک ہوتے ہیں وہاں پر پانی ضرور پایا جاتا ہے۔

ہائنرش ہائنے (Heinrich Heine)(۱۷۹۷ء۔۱۸۵۶ء)

☆ زندگی بہتا نہیں ہے۔ وہ صرف اس شخص کی غلطی سے بہتا تی ہے جس کی روح بیدار کرنے والی آواز پر کان نہیں دھرتی۔

☆ عقلمند نئے خیالات سوچتے ہیں اور بے وقوف ان کو پھیلاتے پھرتے ہیں۔

☆ ادب کا تقاضا ہے کہ جب آدمی بادشاہ کی مرمت کوس سے کرتا ہے تو ساتھ کے ساتھ بادشاہ سلامت زندہ باد کا نعرہ بھی لگاتا جائے۔

☆ جب میں کمین لوگوں کی بات کرتا ہوں، تو ان تمام لوگوں کا استثنا کرتا ہوں، جن کے نام ڈائرکٹری میں درج ہیں اور ان تمام لوگوں کا، جن کے نام درج نہیں ہیں۔

☆ سوروں کا نوجوان چودھاہ دولت ملنے کی صورت میں گھوڑے پر سوار ہو کر چودھاہٹ کرنے کے خواب دیکھتا ہے۔ اور بنک ڈائرکٹر اونچے قد کے گھوڑوں پر سوار ہیں اور آج تک وہی پرانا پیشہ اپنائے ہوئے ہیں۔

☆ نپولین اس لکڑی کا بنا ہوا نہیں تھا، جس سے بادشاہ بنائے جاتے ہیں۔۔۔ وہ اس سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا، جس سے دیوتا تراشے جاتے ہیں۔

☆ بعض لوگ پرندے کو پوری طرح جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے اس انڈے کو دیکھا ہوا ہے، جس میں سے وہ نکلا تھا۔

فریڈرش ہیبل (Friedrich Hebbel)(۱۸۱۳ء۔۱۸۶۳ء)

☆ بیٹھے رہنے کا بیانہ ضرور ہے کہ انسان گرتا نہیں۔

☆ چونکہ سورج کسی کی ملکیت نہیں ہے اس لئے سب اس کے مالک ہیں۔

☆ ہر عظیم انسان خود اپنی تلوار کی کاٹ جانتا ہے۔ صرف لوگوں کو اس بات کا پتا نہیں چلتا۔

☆ روحوں کے چکر کے سبب یہ ممکن ہے کہ افلاطون آج مدرسے میں ڈسک پر بیٹھا ہوا استاد سے مار کھا رہا ہو، کیونکہ اسے افلاطون کا مسئلہ سمجھ نہیں آ رہا۔

☆ چڑیاں اڑنے کے قابل ضرور ہیں۔ مگر اپنے گھونسلے میں وہ صرف گھاس پھونس لاتی ہیں۔

☆ کئی لوگ اپنا مقابلہ اپنے سائے سے کرتے ہیں۔

☆ اگر سنگ مرمر میں احساسات ہوتے تو وہ ہتھوڑوں کی ضرب پر ضرور احتجاج کرتا، جو اسے دیوتاؤں کا بت بناتے ہیں۔

☆ چونکہ شاہین پرواز کر سکتا ہے اس لئے اسے چلنا نہیں آتا۔

☆ آسمانی بجلی کے ساتھ دنیا کو منور کیا جا سکتا ہے مگر ایک تنور گرم نہیں کر سکتے۔

☆ انقلاب قوموں کی بیماری کا نام ہے جو بادشاہوں کی موت کا سبب بنتی ہے۔

☆ سپاہی، جس کا ساتھی اس کے پہلو میں گولی کا نشانہ بنتا ہے، صبر کا سبق پاتا ہے۔

☆ انسانی تاریخ مجھ پر یہ اثر چھوڑتی ہے جیسے وہ کسی دیوتا کا خواب ہو۔

☆ چوہے کی سب سے بڑی بیوقوفی یہ ہے کہ چوہے دانی میں پھنسنے کے بعد وہ چربی کے اس ٹکڑے کو بھی نہیں کھاتا، جو اس کو چوہے دانی میں پھانسنے کا سبب بنا تھا۔

☆ بعض اوقات مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں نے خود اپنے آپ کو کھا لیا ہے۔

☆ ایسے آئینے بھی پائے جاتے ہیں جن میں انسان دیکھ سکتا ہے کہ اس میں کیا کمی پائی جاتی ہے۔

☆ قدرت نے انسانوں کو جوڑے کی صورت میں رکھا ہے اور وہ سمجھتا اپنا سرمایہ ہار جائے گی۔

☆ ہمارے اکثر قاتل صرف اس لئے جلاد بن گئے ہیں کیونکہ وہ بادشاہ نہ بن سکے تھے۔

☆ آدمی کو قوس قزح جیسے کپڑے سو کھنے کے لئے نہیں لٹکانے چاہئیں۔

☆ اگر انسانیت بروقت زمین سے رخصت نہیں لیتی، تو زمین خود اس سے

رخصت لے لے گی۔

فریڈرش نطشے (iedrich Nietzsche)(۱۸۴۴ء-۱۹۰۰ء)

☆ خودکشی کرنے والے کے رشتہ دار اس سے اس وجہ سے ناراض ہوتے ہیں کہ اس نے خاندانی نام کا خیال کرتے ہوئے زندہ رہنے کو کیوں ترجیح نہیں دی۔

☆ کوئی شخص اب مار ڈالنے والی سچائیوں کے سبب نہیں مرتا، کیونکہ تریاق بہت ہو گئے ہیں۔

☆ جس شخص کی زندگی کا مطمح نظر اپنے دشمن کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے اس کے لئے دشمن کا زندہ رہنا بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

☆ کمزور حافظے کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی اچھی چیزوں کا بار بار پہلی بار مزا اٹھاتا ہے۔

☆ بعض لوگ صرف اس وجہ سے مفکر نہیں بن سکے، کیونکہ ان کا حافظہ بہت اچھا ہوتا ہے۔

☆ اگر ہم سچائی کو سر کے بل کھڑا کر دیتے ہیں، تو ہمیں عام طور سے پتا نہیں چلتا کہ ہمارا سر بھی اس جگہ پر نہیں ہوتا، جہاں پر اسے ہونا چاہئے۔

☆ یہ امر احسن ہے کہ کسی بات کو دو مختلف انداز میں بیان کیا جائے اسے دایاں اور بایاں پاؤں عطا کیا جائے۔ سچائی ایک پاؤں پر بھی کھڑی رہ سکتی ہے مگر دو پاؤں پر وہ چل پھر سکتی ہے اور دور دور تک ٹہل سکتی ہے۔

☆ اس کا ارتکاب مجھ سے ہوا ہے، میرا حافظہ کہتا ہے۔ یہ امر مجھ سے سرزد نہیں ہو سکتا۔ میرا غرور کہتا ہے اور اپنی بات پر اڑ جاتا ہے۔۔۔ بالآخر میرا حافظہ شکست مان لیتا ہے۔

☆ امن و سلامتی کے حالات میں جنگجو انسان خود اپنے آپ پر حملہ کر دیتا ہے۔

☆ جہاں پر معرفت کا درخت کھڑا ہے وہاں پر ہمیشہ جنت پائی جاتی ہے یوں کہتے ہیں بڑے سے بڑے اور جوان ترین سانپ۔

☆ ہر سچائی سیدھی سادی ہوتی ہے کیا یہ بات دوہرا جھوٹ نہیں ہے۔

☆ کچلا جانے والا کیڑا اکڑ جاتا ہے۔ یہ عقل مندی کی بات ہے اس طرح وہ دوسرے سے کچلے جانے کے امکانات کو گھٹاتا ہے۔۔۔ اخلاق کی زبان میں (اس کا نام ہے) عاجزی۔

☆ تم نے اسے کردار کی عظمت دکھانے کا موقع دیا اور اس نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا۔ یہ امر وہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔

گابریل لاؤب (Gabriel Laub)(۱۹۲۸ء-۱۹۹۸ء)

☆ خیالات صرف اس وقت ختم ہوتے ہیں جب انسان انہیں اگل دیتا ہے۔

☆ انسان اصلی دانتوں کے ساتھ بھی نقلی مسکراہٹ پیدا کر سکتا ہے۔

☆ امن اس کو کہتے ہیں جب جنگ کسی دوسری جگہ پر ہو رہی ہو۔

☆ اگر انسان یادگاروں کی اونچائی کا حساب کرے، جو طاقتوروں نے اپنی ہیں تو ان دیواروں کی چوڑائی نکل آتی ہے جن کے پیچھے انہوں نے اپنے آپ کو عوام سے چھپا رکھا تھا۔

☆ انقلاب ان بے شرم وقتوں کا نام ہے جب سچائی کھلے بندوں ننگی دھڑنگی گلیوں میں گھومتی پھرتی ہے اور پولیس کو جرأت نہیں ہوتی اس کو گرفتار کرنے کی۔

☆ جو شخص صرف ایک سچائی جانتا ہے اس کو اکثر جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔

☆ ہمیں کوئی چیز اتنی مہنگی نہیں پڑتی، جتنی سستی سچائیاں۔

☆ جب بھی لوگ ڈرے ہوں، تو بیانات ڈرانے کے لئے کافی ہے۔

☆ راستے جو کہیں نہیں جاتے وہ انتہائی پرامن ہوتے ہیں۔

☆ ٹریفک کے حادثوں میں مجرم وہ ہوتا ہے جو زندہ بچ نکلے۔ سیاسی حادثوں میں معاملہ الٹ ہوتا ہے۔

☆ دو کشتیوں پر انسان بیک وقت نہیں بیٹھ سکتا مگر ان پر لیٹ ضرور سکتا ہے۔

☆ انسان ہمیشہ بدلتا رہتا ہے مگر انسانیت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

☆ بونے اپنے اعضاء کے بڑے ہونے کی تمنا رکھتے ہیں مگر اپنے دماغ کے حجم سے وہ پوری طرح مطمئن ہیں۔

☆ عظیم شخصیتیں بھی جیتے جی پست قامت تھیں۔ ان کا قد مرنے کے بعد بڑھتا چلا گیا۔

☆ نسلوں کے درمیان فرق صرف اتنا ہے کہ ان میں سے ہر کوئی کسی اور طریقے سے دھوکا کھاتی ہے۔

☆ کم از کم ایک محبت ایسی ہے جس سے انسان بے وفائی نہیں کرتا۔ اور وہ ہے اپنی ذات کی محبت۔

☆ وہ اتنا طاقتور اور مشہور بادشاہ تھا کہ اس کے بارے میں ایک لطیفہ آج بھی سنایا جاتا ہے۔

☆ جہاں پر طاقت تلوار کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہاں پر ساری اسٹراٹیجی کا انحصار لٹکے ہوئے بٹوں پر ہوتا ہے۔

☆ زندگی کی کتاب کا غیر مختصر شدہ ایڈیشن پڑھنے کی سختی کے ساتھ ممانعت ہے۔

☆ لوگ پیغمبروں کی یادگاریں انہی پتھروں کے ساتھ تعمیر کرتے ہیں جن کے ساتھ انہیں سنگسار کیا گیا تھا۔

☆ پاگل پن پرمٹ کے بغیر ممنوع ہے۔

☆ بدقسمتی سے وہ پل، جسے انسان اپنے پیچھے توڑنا چاہتا ہے، بہت سخت قسم کے آہنی سیمنٹ سے بنا ہوتا ہے۔

☆ بھوکے کو آپ یہ سمجھانے کی کوشش نہ کریں کہ آپ اپنا وزن کم کرنے کی خاطر فاقہ کرتے ہیں۔

☆ تاریخ میں آج تک خطرے کا پیچھا نہیں کیا گیا۔ اگر پیچھا کیا گیا تو اس سچائی کو

جو اس میں بھی ہوتی ہے۔

☆ انسان ---- ایک بندر جو شکر کی تلاش میں آنے سے بچ نکلا۔

☆ اپنی کرتوتوں کا نظریاتی جواز پیدا کرنے کا نام فلاسفی ہے۔

پولش ادب

سٹانسلاو یرزی لَیٹز (Stanislaw Jerzy Lec) (۱۹۰۹ء۔۱۹۶۶ء)

☆ اس کی جیب میں بھی لُکنت پائی جاتی تھی۔

☆ انسان ایک جنگل میں آسانی کے ساتھ راستہ کھو سکتا ہے بالخصوص اگر وہ کاٹا جا چکا ہو۔

☆ ہم تقریروں اور آتار تقدیر میں فرق کرنا بھول چکے ہیں۔

☆ ایسے اسکیمو ہمیشہ پائے جاتے رہیں گے جو کانگو کے باشندوں کو گرمی کا مقابلہ کرنے کے گُر بتائیں گے۔

☆ لافانی بننے کے لئے پہلی شرط مرنا ہے۔

☆ چتائیں اندھیروں کو اجاگر نہیں کیا کرتیں۔

☆ گھوڑا بغیر سوار کے بھی گھوڑا ہوتا ہے مگر گھوڑ سوار گھوڑے کے بغیر محض انسان ہوتا ہے۔

☆ قصے کہانیوں پر نہ جاؤ۔ وہ کسی زمانے میں سچی تھیں۔

☆ منبع تک پہنچنے کے لئے انسان کو بہاؤ کے الٹ تیرنا پڑتا ہے۔

☆ اس شخص کو مکوں سے نہ مارو جسے تم مہذب کرنا چاہتے ہو۔

☆ وہ مذہبی خیالات رکھنے والا بلادین شخص تھا۔ وہ اس بات کو مانتا تھا کہ انسان بندروں کی ترقی یافتہ شکل ہیں۔ مگر ان بندروں کی جو حضرت نوح کی کشتی میں طوفان سے بچ نکلے تھے۔

☆ برا ہو اس چیز کا جسے انسان غلط پتے پر بھیجے اور وہ صحیح جگہ پر پہنچ جائے۔

☆ شاعر اس نہر میں مچھلیاں پکڑتا ہے جو اس کے اندر بہتی ہے۔

☆ مجھے ایسے فلاسفر پسند نہیں، جو بال کی کھال دوسروں کے سر پر اتارتے ہیں اور وہ بھی کلہاڑی کے ساتھ۔

☆ انصاف کے راستے سے ہٹ جاؤ۔ وہ اندھا ہے۔

☆ مسکین دھرتی۔ ہمارے سارے سائے اس پر پڑتے ہیں۔

☆ انسانوں کی سوجھ بوجھ بہت سست رو ہے۔ وہ باتوں کو اگلی نسل میں جا کر سمجھ پاتے ہیں۔

☆ کیا انسان اس وقت بھی اسی طرح مرتے تھے۔ جب ابھی اتنی بے شمار بیماریوں کا لوگوں کو علم نہ تھا۔

☆ جب سے انسان سیدھا ہو کر چلنے لگا ہے اس کا سایہ لمبا ہو گیا ہے۔

☆ وقتوں کی ترتیب محض دھوکہ ہے۔ لوگ اس ماضی سے ڈرتے ہیں جو ابھی آنے والا ہے۔

☆ دانت بھوک مٹنے کے ساتھ ساتھ نکل آتے ہیں۔

☆ اگر تم جھوٹ کو دیکھنا چاہتے ہو تو سچ کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھو۔

☆ اس شاخ کو نہ کاٹو، جس پر تم بیٹھے ہوئے ہو۔ یہ بات ڈارون کے نظریے کا مکمل ثبوت ہے۔

☆ عرصہ دراز سے ہم کیچڑ سے بنے ہوئے نہیں رہے مگر کیچڑ میں اب بھی جا سکتے ہیں۔

☆ میں نہیں جانتا کہ دنیا کو کس نے بنایا تھا۔ مگر میں خوب جانتا ہوں کہ کون اس کو تباہ کرے گا۔

☆ روح لافانی ہے مگر بدقسمتی سے ہمارے لئے نہیں، بلکہ ہمارے جسم سے باہر۔

☆ نیندوں کے خواب انسان صرف کھلی آنکھوں کے ساتھ دیکھ سکتا ہے۔

☆ ننگے پاؤں چلنا صرف ان لوگوں کو جچتا ہے جن کے پاس جوتے موجود ہوں۔

یوگوسلاوین ادب

ولادا بلاتووچ وِب (MadaBulatovic-Vib) (پیدائش ۱۹۲۱ء)

☆ بعض لوگ سیلاب آنے پر خوش ہوتے ہیں کہ انہیں لیڈر بننے کا موقع مل سکتا ہے۔

☆ ایک تندرست سیب میں کیڑا بھی تندرست ہوتا ہے۔

☆ جنگ میں قوم کے بہترین بیٹے سامنے آتے ہیں۔ اُن کے کفن میں بہترین۔

برانا سرنچے وچ (Brana Crncecic)

☆ اتنے جلادوں کے ہوتے ہوئے خودکشی کرنا سراسر حماقت ہے۔

☆ ریڈیو کے ذریعہ انسان حماقتیں سننے لگ گیا تھا۔ ٹیلی ویژن کے ذریعہ وہ انہیں دیکھ بھی سکتا ہے۔

☆ شاعر صرف اس بات کے لئے جوابدہ ہے جو اس نے نہیں کہی تھی۔

☆ وہ لافانی تھا، جب تک وہ زندہ تھا۔

رادیوئے ڈینگوبچ (Radivoje Dangubic) (پیدائش ۱۹۲۵ء)

☆ اندھا کیئر لاٹھی کے ذریعہ اپنا راستہ ڈھونڈتا ہے۔

☆ گھڑیوں کی ہڑتال وقت کی رفتار کو نہیں روک سکتی۔

☆ منزل اس قدر بلند و بالا ہے کہ بعض لوگ اس کے سائے میں آرام کر رہے ہیں۔

☆ جب تک انسان کا سایہ پایا جاتا ہے اسی دیر تک انسان اندھیرے میں نہیں ہوتا۔

☆ خوش قسمت ہیں بدنصیب جو اپنی موت آپ مرتے ہیں۔

لیوبیشا منوجلووچ (Ljubisa Manojlovic) (پیدائش ۱۹۲۵ء)

☆ جن کے گھروں پر چھت نہیں ہوتی وہ زلزلوں سے محفوظ رہتے ہیں۔
☆ کوئی چیز بری نہیں ہے، برے ہیں بالخصوص وہ شخص جو چیز پر کر ماتا ہے۔
☆ جو شخص اپنے وقت سے قبل آتا ہے وہ اس ڈر سے بھاگ رہا ہے کہ کہیں وقت اس کو اپنے قدموں تلے کچل نہ دے۔
☆ جنت میں خواب پائے جاتے ہیں جہنم میں ان کو لانا ہونا چاہیئے۔
☆ ان لوگوں کو خوش قسمت جاننا چاہیئے، جن کا دوسرے مذاق اڑاتے ہیں۔ بد قسمت لوگوں پر ہم آنسو بہایا کرتے ہیں۔

دوشان رادووچ (Dusan Radovic) (پیدائش ۱۹۲۲ء)

☆ جو شخص ہمیشہ اپنی بات منوانی چاہتا ہے اسے اپنی بات اکثر بدلنی پڑتی ہے۔
☆ تجربوں، فتوحات کو لوگ جلد فراموش کر دیتے ہیں۔ شکستوں کو وہ نہیں بھولتے۔
☆ ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ جن کو رشوت نہیں دی جا سکتی۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔
☆ انسان ہر کسی کی برائی کر سکتا ہے مگر وہ صرف روح فتح نہیں کی ہے۔
☆ ہر محبت لازمی ہوتی ہے مگر کوئی محبت اتنی لازمی نہیں ہوتی، جتنی اپنی ذات کی محبت۔

میلان ویتزیوچ (Milan Vitzivic)

☆ تمدن کی تاریخ کا ثبوت کھنڈرات سے ملتا ہے۔
☆ ہمارا ماضی قطعاً غیر یقینی ہے۔
☆ یہ سمجھنا سراسر غلط فہمی ہے کہ سیاستدان ہم سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ وہ دراصل ہماری نبض دیکھنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔
☆ چاند سے ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ہماری ضروریات کے مطابق پھیلائے۔
☆ سونے کی زنجیروں سے کوئی اپنے آپ کو آزاد نہیں کرایا کرتا۔
☆ قوم آزادی کے خواب دیکھتی ہے۔ مگر سیاستدان ان خوابوں کی کتاب مرتب کرتے ہیں۔
☆ ڈکٹیٹر عوام کو ملک کی گرد کو اپنے پیروں پر سے چھونے پر مجبور کرتا ہے۔
☆ وہ قوم جو خواب دیکھنے کی اہل نہیں وہ بیدار بھی مشکل سے ہوتی ہے۔
☆ کولمبس ابھی تک ہندوستان نہیں پہنچا۔
☆ اس بات کو نہ بھولو کہ حال ہمارے بچوں کا ماضی ہوگا۔
☆ دلیروں کے گروہ میں بزدل بننے کے لئے بہت دلیری کی ضرورت ہوتی ہے۔
☆ آسانی کے ساتھ ایمان لانے والوں کے لئے ٹیلی ویژن سیٹ کی خریداری کے ساتھ ہی جنت کا آغاز ہوجاتا ہے۔

☆

قطع بند غزل

میں جو کما کے لایا ہوں محنت کی روٹیاں
مجھ کو عزیز تر ہیں قناعت کی روٹیاں
کتنی مزے کی ہوتی ہیں اک بار کھا کے دیکھ!!
تو خود ہی کہہ اٹھیگا ہیں جنت کی روٹیاں
کھاتے ہیں زر پرست بھی مخمل پہ بیٹھ کر؟
اوون میں پکنے والی حماقت کی روٹیاں
زاہد بھی کھا رہا ہے بڑے طمطراق سے
چندوں کی ہوں وہ یا ہوں امامت کی روٹیاں
نیتا ہے قوم کے یہ لٹیرے ہیں دیش کے
کھاتے ہیں رات دن یہ فراغت کی روٹیاں
ان میں ہوس پرست ہیں خونی بھی زانی بھی
گھر بیٹھے توڑتے ہیں سیاست کی روٹیاں
اپنے شکم کی آگ بجھانی بھی ہے مجھے!!
کھاتا ہوں میں بھی حق و صداقت کی روٹیاں
ماں باپ بیوی بچے، مرے شوق سے سدا!!
کھاتے ہیں صبح و شام کفالت کی روٹیاں
باسی بھی ہوں اگر تو میں کھاتا ہوں بے جھجک
میرے لیے ہیں یہ بھی عقیدت کی روٹیاں
جانا پڑے سفر پہ کہیں، شہر چھوڑ کر!!
رکھتا ہوں اپنے ساتھ مسافت کی روٹیاں
کھانے میں روز مرغ و مسلّم نہ کھا سدا!!
صحت کے واسطے ہیں کرامت کی روٹیاں
تھوڑی سی دال بھاجی بھی مل جائے ٹھیک ہے
کھالے تو سیر ہو کے! شرافت کی روٹیاں
خوشبو جو آرہی ہے بڑی سوندھی سوندھی ہے
بیوی بنا رہی ہے نزاکت کی روٹیاں
گیہوں جوار کی ہوں کہ پھر باجرے کی ہوں
میرے لیے جناب ہیں چاہت کی روٹیاں
پکتی تھیں روز رات میں، لکڑی کے چولہے پر
ہاتھوں سے تپ تپا کے مشقت کی روٹیاں
انجم میں کیا بتاؤں، تمہیں ماں کے ہاتھ کی!
خوابوں میں آرہی ہیں، محبت کی روٹیاں

حفیظ انجم (کریم نگر بھارت)

کس نے انھیں تعمیر کیا ...... (جرمن نظموں سے تراجم)

ترجمہ: منیر الدین احمد

برتھولٹ بریشت

Bertolt Brecht

ایک مزدور کے سوالات

سات دروازوں والے شہر تھیبز کو کس نے بسایا؟
کتابوں میں بادشاہوں کے نام لکھے ہیں
کیا بادشاہ پہاڑوں سے پتھر کاٹ کے لائے؟
اور وہ بار بار اجڑنے والا بابل......
کون اسے اتنی بار تعمیر کرتا رہا؟
اور کن مکانوں میں بستے تھے سونے جیسے چمکتے دمکتے لیما کے معمار؟
اور کس سمت گئے اس شام مزدور
جس روز چین کی دیوار مکمل ہوئی؟
اور روم بھرا ہوا ہے فتح کی محرابوں سے
کس نے انہیں تعمیر کیا، اور کس پر قیصر فتح مناتے تھے؟
اور کیا بازنطین میں، جس کی بےحد تعریف کی گئی ہے
سب لوگ محلات میں آباد تھے؟
خود قصے کہانیوں کے شہر اطلانطس میں
اس رات، جب کہ سمندر اسے نگل رہا تھا
ڈوبنے والے اپنے غلاموں کو پکارتے تھے
نوجوان اسکندر نے ہندوستان کو فتح کیا
اکیلے نے کیا؟
سیزر نے گالیر کو شکست دی
وہ اپنے ساتھ کیا ایک باورچی کو بھی نہ لے کر گیا تھا؟
سپین کا بادشاہ فلپ رویا، جب اس کا بیڑا سمندر کی نذر ہوا
کیا اس کے سوا اور کوئی نہ رویا؟
فریڈرک دوم سات سالہ جنگ جیتا
کیا اس کے سوا اور کوئی بھی جیتا؟
ہر ورق ایک فتح
فتح کے جشن میں کھانا کس نے پکایا؟
ہر دس سال میں ایک شخصیت
اس کی قیمت بھلا کون ادا کرتا رہا؟
اتنی ساری خبریں
اتنے ہی سوالات

ایرِش فریڈ

Erich Fried

تین پتھر

''میں کتنے عرصے تک زندہ رہ سکتا ہوں
اگر امید میرا
ساتھ چھوڑ دے؟''
پوچھا میں نے تین پتھروں سے

پہلے پتھر نے کہا
''جتنے لمحوں تک تم پانی کے نیچے دم روک سکتے ہو
اتنے برسوں تک''

دوسرے پتھر نے کہا
تم امید کے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہو
اتنی دیر تک جب تک تم زندہ رہنا چاہو

تیسرا پتھر ہنس دیا
''اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ تم
کس چیز کو زندگی کے نام سے پکارتے ہو
جب تمہاری امید کا جنازہ نکل چکا ہے''

☆

لٹز راتھنو

Lutz Rathenow

مشورہ

اگر چاند خودکشی کرنی چاہتا ہے
تو اسے اپنے آپ کو یکسر بدلنا ہوگا
اور زرخیز بننا ہوگا
تاکہ زندگی جنم لے سکے
اور خوب پنپ سکے
اور جب وہ وجود میں آجائیں گے
عقل و دانش کے مالک
تو وہ میزائل بنائیں گے اور وہ چیز

پھر وہ کسی روز اپنے آپ کو
بھک سے اڑا دیں گے
چاند سمیت

☆

روزے آوسلینڈر
Rose Ausländer

کہتے ہیں

کہتے ہیں
کہ سمندر گول ہے
زمین گول ہے
آسمان گول ہے

کیا
اس قدر گول چیز کی
اتنی ساری نکڑیں ہو سکتی ہیں؟

☆

ہانس ماگنس اینسنز برگر
Hans Magnus Enzensberger

سرحد

اس سے کہیں کم جو تم سوچتے ہو
تین روز تک بجلی
خراب ہیٹنگ سسٹم
ٹوکیو کے تجارتی حلقوں میں اختیار کی کمی
ایٹمی پلانٹ میں بال برابر دراڑیں
سمندری سنسناہٹ
آکسیجن کی کمی
دانتوں کا درد

اور اکیسویں صدی جاتی رہتی ہے
اور تمہاری آنکھوں تلے اندھیرا چھا جاتا ہے
اور تم سے یہ سطر
آخر تک نہیں پڑھی جاتی

☆

کرسٹوف میکل
Christph Meckel

میں اسے ڈھونڈتا پھرا

میں اسے ڈھونڈتا پھرا
گھروں میں، دریاؤں میں، صحرا کے کناروں پر
ہرے بھرے جنگلوں کی وسعت میں
اسے ڈھونڈتا پھرا اور اس کا نام لے کر پکارتا رہا
مگر وہ گھروں میں، دریاؤں میں نہیں ملتا
صحراؤں کے کناروں پر یا ہرے بھرے جنگلوں میں

تم اسے مینڈک کے پاس
ڈھونڈتے ہو کنویں میں
اندھیرے پانی کے گھروں میں
جہاں پر مرنے والے بادشاہ سرگوشی کرتے ہیں
مگر وہ نہیں ملتا کنویں میں مینڈک کے پاس
اندھیرے پانی کے گھروں میں
جہاں پر مرنے والے بادشاہ سرگوشی کرتے ہیں

اور تم اسے ڈھونڈتے ہو
جگمگاتے ہوئے ابوالہول کے مقام پر
موروں اور الوؤں میں
تم اسے ڈھونڈتے ہو اور اس کا نام پکارتے ہو
مگر وہ نہیں ملتا ابوالہول کے مقام پر
نہ موروں میں اور نہ الوؤں میں

وہ تمہارے بہت قریب
چل رہا ہے اور سیٹی بجا رہا ہے
چل رہا ہے
سیٹی بجا رہا ہے
جس کو تم ڈھونڈتے پھرتے ہو
وہ چل رہا ہے اور سیٹی بجا رہا ہے

گونتھر کونرٹ

Günter Kunert

جنگ کے بعد

جب آدمی کو
اس کے بم زدہ مکان
کے ملبے میں سے
نکالا گیا
تو اس نے اپنے آپ کو جھاڑا
اور کہا
پھر کبھی نہیں

بہر صورت فوراً نہیں

☆

ہائنر کپہارڈ

Heiner Kipphadt

سورج

جب میں چھوٹا تھا
تو انہوں نے سورج کا مارا
جب میں جوان ہوا
تو انہوں نے سورج کو پھانسی دے دی
اب لگتا ہے کہ وہ اسے دفن کرنا چاہتے ہیں

☆

ارسلا کرے خل

Ursula Krechel

مستقبل

جب ہم کرایہ ادا کر چکیں گے
اپنے حصے کے نوٹ گن کر رکھ دیں گے
گیس اور پانی کی سہولت کی قیمت
جب ہم دہی اور پنیر
اور ساگ کے بڑے پیکٹ کو کھا چکے ہوں گے
جو فریج میں دھرا ہے
جب تمہاری چکٹ پتلون گھس جائے گی
تو ہم بے صدا دار ہوں گے
مگر دل کی آواز کہتی ہے
کہ تم میرے ہو اور میں تمہاری ہوں
اور ہم دونوں ان کی مٹھی میں ہیں

☆

پیٹر شیٹ

Peter Schütt

پرواز

مراکش کے گرد و نواح کے صحراؤں میں
عرب شاعروں کو ایک سارس ملا ہے
جو صرف ایک پنکھ رکھتا ہے
قصے کہانیوں کا یہ پرندہ
صرف اس صورت میں پرواز کر سکتا ہے
جب ایک دوسرا پرندہ
اس کے پہلو بہ پہلو جڑ کر اڑتا ہے

اس قسم کا پرندہ
صرف ایک پنکھ والا میں خود بھی ہوں
تیرے بغیر پیاری
میں پرواز نہیں کر سکتا
اگر تم مجھ سے جڑ کر
اپنے پنکھ کو پھیلاؤ اور
میرے ساتھ مل کر اڈاری مارو
تو ہر چیز جو ہمیں دباتی ہے
اور گہرائیوں کی طرف کھینچتی ہے
ہم سے کٹ جائے گی
اور ہمیں پرواز کا ڈھنگ آ جائے گا
جس طرح ہم نے چلنا سیکھا تھا
اور ہم فتح کریں گے آسمان کو
مراکش کے اوپر
اور دوسری جگہوں پر

☆

براہ راست

اردو زبان وادب کی سب سے بڑی بدقسمتی اس کا ٹھہراؤ اور جمود ہے۔ہم نے جدید علوم، نظریات اور تصورات کو اپنے اندر اس طرح نہ سمویا جس کا تقاضا وقت اور حالات کرتے رہے ہیں!

ڈاکٹر منیر الدین احمد اردو دنیا کے ایسے جانے مانے بلند قامت ادیب، شاعر، محقق اور مترجم ہیں جنکا دل اردو کے لیے دھڑکتا اور جدید علوم کے لیے تڑپتا ہے۔آپ نے اردو ادب کے سرمائے میں عالمی ادب کے بے بہا نثر و نظم پارے متعارف کرانے کے ساتھ پاکستانی ادب کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں سلیقے، قرینے اور ہنرمندی سے منتقل کر کے اپنی زبان، ادب، ثقافت، تہذیب وتمدن کو اعتبار کی نئی منازل سے روشناس کرلیا ہے!!

ڈاکٹر صاحب محترم کا مطالعہ، مشاہدہ اور مجاہدہ جس قدر گہرا، عمیق اور وسعت کا حامل ہے اسی قدر ان کا ویژن اور وجدان بھی کرشمہ سازی کی قدرت رکھتا ہے۔ہمارے دعویٰ کی تصدیق آپ کے ذوق کی تسکین سے مشروط ہے!!!

گلزار جاوید

☆ ڈاکٹر منیر الدین احمد صاحب۔سب سے پہلے اپنی صحت،مصروفیات اور ان حالات وواقعات کی بابت تفصیل سے بتایئے، جو تنہائی میں آپ کے کا اُلجھیا کا باعث بنے ہیں؟

☆☆ میری صحت خدا کے فضل سے عمر بھر اچھی رہی تھی۔مگر ریٹائرمنٹ کے صرف تین ماہ بعد اوپن ہارٹ سرجری کروانی پڑی، جس کے بعد زندگی اپنی بحال ہوئی ڈگر پر آٹھ سال تک اطمینان سے چلتی رہی۔البتہ میں نے اپنے طور پر جہاں گردی سے ہاتھ اٹھالیا، جو اس وقت تک میری زندگی میں ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتی تھی اور میرے ادب کے ساتھ اس حد تک گندھی ہے کہ بعض لوگ میرے افسانوں کو بھی سفرنامے سمجھتے ہیں۔پھر گزشتہ برس مجھے سانس کی تکلیف ہوئی۔میڈیکل رپورٹ کے مطابق پھیپھڑوں کی ساخت میں تبدیلی آ رہی تھی جس کو Fibration کہتے ہیں، جس کے نتیجے میں پھیپھڑوں کی لچک ختم ہو جاتی ہے اور انسان سانس نہیں لے سکتا اور پانچ چھ ماہ کے اندر اپنے عزیزوں کو داغ مفارقت دے جاتا ہے۔ڈاکٹر نے کہا کہ اس بیماری کا علاج ہمارے پاس نہیں ہے۔مگر اس کی توقع کے برعکس تین چار ماہ کے اندر میری صحت بحال ہوتی چلی گئی اور پھیپھڑے تندرست ہو گئے۔ڈاکٹر نے کہا میں نے اپنی ساری عمر میں ایسا ہوتے نہیں دیکھا۔تمہارا اللہ تم سے خوش لگتا ہے جو اس نے تمہیں اس مہلک بیماری سے نجات دلا دی ہے۔اب تم سال میں دوبارہ اپنی بہتھوڑے سے بنا سکتے ہو۔میں نے کہا میں تو پہلی ہی نہیں بنا تا ہوں، دوسری بہتھوڑے سے کیسے بنوں گا؟

جہاں تک میری مصروفیات کا تعلق ہے ان میں ریٹائرمنٹ کے بعد یہ تبدیلی آئی ہے کہ لکھنے سے زیادہ پڑھنے کی طرف توجہ مبذول ہونے لگی ہے۔اگرچہ میں نے اس عرصے میں اپنی آپ بیتی "ڈھلتے سائے" لکھی جو "سویرا"، لاہور میں قسط وار چھپنے کے بعد کتابی صورت میں مارکیٹ میں آ چکی ہے۔پھر میرے افسانوں کا پانچواں مجموعہ "لافانی عشق اور دوسرے افسانے" بھی چھپ کر شائع ہو گیا۔مگر مجموعی طور پر اردو ادب سے زیادہ طلب میرے زیرِ مطالعہ وہ کتابیں ہیں جو ان دنوں مغربی ممالک میں مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کرنے کی غرض سے لکھی جا رہی ہیں۔ایک جرمن مستشرق یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ قرآن دراصل قدیم عیسائی متون میں ردوبدل کر کے لکھا گیا تھا۔ایک فرانسیسی پروفیسر کا کہنا ہے کہ یونانی علوم یورپ میں عربوں کے ذریعہ نہیں پہنچے، بلکہ یورپین مترجموں کی کاوشوں کے نتیجے میں رائج ہوئے۔عربوں کو تو یونانی زبان ہی نہیں آتی تھی۔اب ایک نام نہاد محقق نے لکھا ہے کہ یورپین قوموں نے تو صرف دو تین صدیوں تک افریقیوں کو غلامی کا طوق پہنایا تھا، عربوں نے چودہ سو سال سے سترہ ملین افریقیوں کو غلام بنایا تھا اور آج بھی عرب ملکوں میں افریقی غلام پائے جاتے ہیں۔اس سارے طوفان بدتمیزی میں ایک امریکی پروفیسر David Levering Lewis کی کتاب کہانی کا دوسرا رخ پیش کر رہی ہے، جس کا کہنا ہے کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر عرب ۷۳۲ء میں فرانسیسی فوجوں کو پٹو سے کے مقام پر شکست دینے میں کامیاب ہو جاتے۔اس کے نتیجے میں یورپ کو تین سو سال قبل وہ علوم مل جاتے جو اسلامی دنیا میں رائج ہو چکے تھے۔وہ اسلام کو ایک پروگریسیو فورس قرار دیتا ہے جب کہ اس کے مقابلے میں یورپ میں تاریکی کا دور دورہ تھا۔اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کتنی ممکن ہے جو میری اگلی کتاب ادبی سے زیادہ دلچسپ ہوگی۔یوں بھی میرے اندر ادیب اور تاریخ دان آپس میں گتھم گتھا ہیں۔کبھی ایک جیت جاتا ہے کبھی دوسرا۔عزیز احمد کو بھی یہی روگ لاحق تھا۔وہ آخری عمر میں آکسفورڈ کامل تاریخ کے آدمی بن گئے تھے۔ان کی آخری بیس برسوں کی ساری کتابیں مسلمانوں کی تاریخ کے بارے میں تھیں۔مجھے انہوں نے کہا تھا کہ جب سے مسلمانوں کو اندلس سے نکالا گیا تھا، اس وقت سے امت اسلامیہ کا قدم پیچھے کی طرف ہٹ رہا ہے۔پاکستان کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ یہ ملک جلد یا بدیر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔اسی لئے لوگ وہاں سے نکل رہے ہیں۔ان کی آخری کتاب سسلی میں مسلمانوں کی تاریخ کے بارے میں تھی، جس کو امت

اسلامیہ کبھی کی بھلا چکی ہے۔ یقین نہ آتا ہو تو کسی سے پوچھ کر دیکھئے۔ شاید ہی آپ کو کوئی صاحبِ علم ملے جسے پتا ہو گا کہ وہاں پر مسلمانوں نے دو سو پچاس برس تک حکومت کی تھی۔

☆پتنگ بازی، غلیل، شکار، کھیل کود اور پڑھو کا شوقین بچہ مطالعہ کا شوقین کیونکر بن گیا؟

☆☆کھلنڈرا بچہ آج تک میرے اندر چھپا بیٹھا ہے۔ میں عمر بھر ہر قسم کی کھیلوں میں حصہ لیتا رہا ہوں۔ کرکٹ سے لے کر فٹ بال، ڈیک ٹینس (جس کا دوسرا نام رِنگ ٹینس ہے) اور بیڈمنٹن تک میں نے ہر کھیل میں شرکت کی ہے۔ یہاں پر جرمنی میں بھی پینسٹھ برس کی عمر تک ایک کلب میں بیڈمنٹن کھیلتا رہا ہوں۔ مگر اس سے پہلے اخبار میں ہمبرگ کے ایک کلب کے بارے میں رپورٹ نظر سے گزری کہ وہاں پر ڈیک ٹینس کھیلا جاتا ہے۔ میں وہاں گیا، تو پتا چلا کہ وہ لوگ نیوڈسٹ ہیں اور ہر قسم کے کپڑوں سے مادر زاد آزاد ہو کر ننگے دھڑنگے کھیلتے ہیں۔ مجھے اس روز نکر پہن کر کھیلنے کی خاص اجازت ملی، جو صرف مہمانوں کو دی جاتی تھی۔ ممبر بننے کے بعد یہ رعایت ختم ہو جاتی تھی۔ اس لئے مجھے ڈیک ٹینس کھیلنے کی خواہش کو دبانا پڑا۔

کہانیاں پڑھنے کا شوق مجھے اس وقت سے ہے جب سے لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔ گرما کی تعطیلات ہم اکثر گاؤں میں گزارتے تھے، جہاں پر عموجان اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کے پاس بچوں کے رسالے ("پھول" اور "تعلیم و تربیت") آتے تھے اور ہمیں سارے سال کے شمارے نکال دیے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ بھی داداجان کی لائبریری میں قدیمی مجلّے رکھے ہوئے تھے، جن میں کہانیاں تو نہیں ہوتی تھیں، مگر ہم دوسرے مضامین بھی شوق سے پڑھتے یا کم از کم پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ البتہ عربی زبان کے مجلات، جو مصر، شام، بیروت اور مکہ سے آتے تھے، ان تک میری رسائی عربی زبان سیکھنے کے بعد جا کر ہوئی۔

☆کھیل کود کے دنوں میں لائبریری بنانے کا خیال اور اس کے لیے جمع شدہ ڈاک ٹکٹ فروخت کرنے کی ترکیب بھی بچکانہ نہیں لگتی۔ آج کل یہ شوق کس مرحلے میں ہے؟

☆☆بچوں کے لئے لائبریری بنانے کے پیچھے یہ خواہش کام کر رہی تھی کہ دوسرے بچوں کو بھی لکھنے پڑھنے کی طرف متوجہ کیا جائے۔ کتابیں میں اپنے لئے تو خریدتا ہی تھا۔ کیوں نہ دوسروں کو مارجا دے کر ان کی عادت کو بڑھایا جائے۔ پھر جب کتابوں کی مانگ بڑھنے لگی، جس کو میں اپنے جیب خرچ سے پورا نہ کر سکتا تھا، تو سوچا کہ ڈاک کے ٹکٹ بیچے جائیں، جس کے لیے خریدار آسانی سے مل جاتے تھے۔ ٹکٹوں کی بڑھتی ہوئی ڈیمانڈ کو پورا کرنے کے لئے غیر ملکی دوستیاں بنائی گئیں، مگر مراسلت پر بہت سا وقت لگ جاتا تھا۔ پھر تبادلے کے لئے ملکی ٹکٹوں کا مہیا کرنا اچھا خاصا مسئلہ ہوتا تھا۔ پنڈی کے کباڑیوں کی دکانوں پر جا کر پرانے خطوط پر سے ٹکٹ اتارنے کا کام خود کرنا پڑتا تھا۔ دہلی سے چھپنے والے بچوں کے رسالے "کھلونا" میں میرا خط چھپا کہ مجھے ہندو پاک کے ڈاک کے ٹکٹ بھیجے جائیں، تو بدلے میں غیر ملکی ٹکٹ مل سکتے ہیں۔ اس خط کا چھپنا تھا کہ ہر روز درجنوں خط آنے لگے، جو ہمارے چھوٹے سے لیٹر بکس میں نہ سما پاتے تھے۔ اس طرح ہاجی تک خبر پہنچی کہ ماجرا ہوا ہے، نے سائیکل پر لیٹر بکس کھول رکھا ہے۔ مجھے سزا تو نہیں ملی، مگر ہمارا اچھا بھلا البم آگ کی نذر ہو گیا، جس میں دنیا بھر کے ملکوں کے سینکڑوں نایاب ٹکٹ چسپاں تھے۔ اس کے بعد میں نے البم نہیں بنایا۔ البتہ آج تک ڈاک کے ٹکٹ ضائع نہیں کرتا ہوں۔ یہاں پر معذوروں کے ایک ادارے کو سال بھر جمع کردہ ٹکٹ بھیج دیا کرتا ہوں، جن کو وہ کرسمس کے موقعے پر بیچ کر تھوڑی سی نقدی پیدا کر لیتے ہیں۔

☆منیر ڈرامیٹک کلب کا اچھا خیال اور اس پر نشر ہونے والی خبروں کی روداد تو سنائیے۔

☆☆پنڈی میں اپنے محلے کے بچوں کو میں نے ڈرامہ کھیلنا سکھلایا تھا۔ مگر باقاعدہ طور پر کلب کی بنیاد ان دنوں میں رکھی گئی، جب ہم کچھ ماہ تک اپنے آبائی گاؤں چنگا بنگیال میں جا کر رہے تھے۔ پنڈی میں بچوں کا واسطہ ریڈیو سے پڑتا تھا اور وہ سینما ہاؤس میں جا کر فلم دیکھ سکتے تھے۔ گاؤں میں یہ دونوں چیزیں نہیں تھیں۔ وہاں پر بڑی بوڑھیاں پرانی کہانیاں سنایا کرتی تھیں، جن کو چھوٹے بڑے سب بار بار سن چکے تھے۔ وہاں پر قیام کے دوران ہمیں پوٹھوہاری سانگ دیکھنے کا اتفاق ہوا، جس میں کسی شادی کے سلسلے میں بلائے گئے عوامی ایکٹروں نے چھوٹے چھوٹے اسکیچ پیش کیے۔ میں نے سوچا کیوں نہ ہم خود ڈرامہ کھیلا کریں، جو ہر روز ہو اور جس کا پروگرام ہوتا رہے۔ یوں ہمارا کلب بنا۔ میرے بھائی اپنے اسکیچ پیش کرتے تھے۔ میں ریڈیو پاکستان پر مزاحیہ خبریں سنایا کرتا تھا۔ اس طرح گاؤں کی زندگی میں تھوڑا سا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔

☆"تاریخِ منیری" لکھنے کا خیال کب اور کیونکر آیا، اس کا مسودہ کس نوعیت کا تھا اور اسے شائع کرنے کے لئے پتنگ بنا کر فروخت کرنا بھی حیران کن لگتا ہے؟

☆☆دراصل اسکول میں ہمیں جو تاریخ پڑھائی جاتی تھی، اس میں سوائے بادشاہوں کے کارناموں اور جنگوں کے سن و سال کے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ مجھے عوام کے بارے میں جاننے کا شوق تھا۔ ان کی زندگی کس طرح گزرتی تھی اور ملک میں عام طور سے کیا ہوتا تھا۔ کسان اور مزدور کس طریق سے دو وقت کی روٹی کماتے تھے۔ خاندانوں میں ماں باپ کا سلوک بچوں کے ساتھ کیسا تھا۔ یہ اور دوسرے سوالات کا مجھے اسکول میں کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ پھر مجھے خود ایسی تاریخ لکھنی چاہیئے۔ داداجان کی لائبریری سے کچھ کتابیں میرے ہاتھ لگیں، جن میں سوائے ایک یا دو کے باقی سب عربی اور فارسی

میں تھیں۔ میں ان دونوں زبانوں سے اس زمانے میں نابلد تھا۔ میرے حافظے میں صرف اکبر شاہ خان نجیب آبادی کی "تاریخ اسلام" محفوظ ہے، جس کو میں نے کسی ناول کی طرح پڑھ ڈالا تھا۔ اس کی اور ایک دوسری تاریخی کتاب کی روشنی میں "تاریخ منیری" کی بنیاد رکھی گئی تھی، جس کے پہلے ساٹھ صفحے لکھے جا چکے تھے، جب اباں نے راولپنڈی واپس لوٹنے کا اعلان کیا۔ مجھے موتی جھرا تھا، اس لئے اسکول نہیں جا سکتا تھا۔ البتہ میرے استاد ماسٹر محمد اعظم نے میرے عزیزو کے ہاتھ میری کتاب کا مسودہ منگوا لیا تھا اور میرے ہم جماعتوں کو املاء کرانی شروع کر دی تھی۔ میرے پنڈی واپس چلے جانے کے سبب "تاریخ منیری" کا مسودہ ان کے پاس رہ گیا تھا۔

☆ آپ کی نسبت ماسٹر منظور احمد کی پیش گوئی کی بنیاد کیا تھی اور جب یہ پیش گوئی عملی صورت میں ان کے روبرو وقوع ہوئی تو ان کے احساسات کیا تھے؟

☆☆ ماسٹر منظور احمد ہمیں اردو پڑھاتے تھے۔ اس لئے شاید میری زبان دانی سے واقف تھے۔ یہ پیش گوئی انہوں نے میری غیر حاضری میں میرے ہم جماعتوں کے سامنے کی تھی، جن کی زبانی یہ بات مجھ تک پہنچی تھی۔ ہم ششماہی امتحان دے رہے تھے اور ایک دو روز قبل اردو کا پرچہ دے چکے تھے۔ وہ ممتحن تھے اور پرچے دیکھ چکے تھے اور اس روز ایک کمرے میں نگرانی کر رہے تھے۔ میں ایک دوسرے کمرے میں پرچہ لکھ رہا تھا۔ وہ اس بات پر اپنی خوشی کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے کہ ان کے شاگرد منیر الدین احمد میں ایک ادیب چھپا بیٹھا ہے جو ایک روز باہر نکل آئے گا۔ مجھے علم نہیں ہے کہ کیا انہوں نے کبھی میری کوئی چھپی ہوئی چیز دیکھی تھی یا نہیں۔ یوں بھی میرے مضامین قلمی نام کے تحت چھپتے تھے، جس کا اسکول میں کسی کو پتا نہیں تھا۔ میں ان کے ساتھ پھر کبھی ملا نہیں ہوں۔

☆ یحییٰ فضلی سے منیر الدین احمد بننے کے اسباب اور اپنی شخصیت پر اس کے اثرات سے آگاہ کیجئے۔

☆☆ دادا جان نے میرا نام محمد یحییٰ تجویز کیا تھا، مگر والد صاحب نے منیر الدین احمد کو ترجیح دی۔ تاہم یحییٰ کو نام کے ساتھ تخلص کی طرح ٹانک دیا گیا، جس کو میں نے قلمی نام اختیار کرتے ہوئے یحییٰ فضلی میں بدل دیا، کیونکہ میں دادا جان مولوی محمد فضل خان اور نانا جان فضل محمد خان کی دونوں طرف سے فضلی تھا۔ اس نام کے تحت لمبے عرصے تک میری تحریریں چھپتی رہیں۔ بلکہ جب میں نے کشور ناہید کو، جو اس زمانے میں "ماہ نو" کی مدیرہ تھیں، پہلی بار جرمن شاعر ہانس ماگنس اینسنز برگر کی نظم "مڈل کلاس کا ترانہ" ترجمہ کر کے بھیجی تو وہ میرے قلمی نام کے تحت ہی چھپی تھی۔ مگر کشور نے مجھے لکھا: "مجھے ایک اعتراض ہے۔ آپ کا نام جامع ہے۔ یہ قلمی فرضی نام کی علت کیوں؟" اس دن سے میری تحریریں منیر الدین احمد کے تحت چھپ رہی ہیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ میری تحقیقاتی اور ادبی تحریریں ایک ہی نام سے چھپ رہی ہیں۔

☆ "رازدان" کی ایڈیٹری کا تجربہ عملی زندگی میں کس طور کارآمد رہا؟

☆☆ میں دو برس کے لگ بھگ ایڈیٹر رہا، جس میں سے میں ایک لمبے عرصے تک راولپنڈی سے غیر حاضر تھا۔ اس لئے مجھے نہ تو پوری طرح ایک ہفت وار کی ایڈیٹری کا مزا چکھنے کا موقع ملا، نہ ہی میں پنڈی کے ادبی حلقوں سے پوری طرح متعارف ہو سکا۔ عام طور سے یہاں کے لوگ مجھے روزنامہ "تعمیر" کے واسطے سے جانتے تھے۔

☆ روزنامہ "تعمیر" کے زمانے میں آپ کو نسیم حجازی کا قرب بھی حاصل رہا ہوگا۔ آپ نے ان سے کس طرح کسب فیض کیا اور ان کی شخصیت و فن کی بابت آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟

☆☆ میرا تعلق ان کے ساتھ اتنا قریبی نہیں تھا کہ میں ان کو اپنے دوستوں یا بزرگ دوستوں میں شامل کر سکوں۔ میں مضمون دے آتا تھا اور وہ اسے پڑھ کر چھاپ دیتے تھے اور بس۔ البتہ میں نے ان دنوں ان کے سارے تاریخی ناول یکے بعد دیگرے پڑھے، جو مجھے بہت جذباتی اور سطحی لگے۔ ان کے ناولوں میں سے صرف "ایک سو سال بعد" مجھے پسند آیا، جو ہندوستان کے بارے میں تھا۔ وہ بھی اس لئے کہ اس میں طنزیہ رنگ میں ہندوستان کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ مگر نہ ان کی پیش گوئیاں مجھے بہت بودی لگی تھیں۔

☆ نعیم الدین قاضی سے اپنے تعلق کی بابت کچھ بتایئے۔ کیا یہ تعلق حضرت فراق کے مشاغل سے مشابہ تو نہیں تھا؟

☆☆ سب سے پہلے تو یہ جان لیجئے کہ میں ہم جنس پرست (gay) نہیں ہوں۔ مجھے حسینائیں بھاتی ہیں اور اسی لئے آپ کو میرے افسانوں میں بیشتر خوبصورت محترمات ملتی ہیں۔ نعیم سے میرا تعلق ویسا تھا جیسا ایک سینیئر طالب علم کا اپنے تعلیمی ادارے کے ایک جونیئر سے ہوتا ہے۔ یورپ میں تو باقاعدہ طور پر اسکولوں کالجوں کی طرف سے کوشش کی جاتی ہے کہ سینئر طالب علم تعلیمی معاملات میں جونیئر طالب علموں کی رہنمائی کریں۔ میں نے ایک جگہ پر لکھا ہے کہ میں علمی طور پر نعیم کو کچھ نہیں سکھا سکا تھا، کیونکہ اس کی پوری توجہ کھیلنے کودنے کی طرف تھی۔ اگر وہ میری مثال کی پیروی کرتا تو یقیناً بہت آگے جا سکتا تھا۔

☆ آپ کی روداد زندگی میں قدم قدم پر خوبرو حسیناؤں کا در آنا عجب داستان معلوم ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی یہ احساس بھی گزرتا ہے کہ کچھ ہے ضرور جس کی پردہ داری کی جا رہی ہے؟

☆☆ میرے افسانوں میں جن حسیناؤں کا ذکر آیا ہے وہ سب گوشت پوست کی جیتی جاگتی پریاں ہیں۔ میں اکثر افسانہ کی کیریکٹر کو سامنے رکھ کر لکھتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات پیش آمدہ واقعات ایک حسینہ کے سر تھوپ دیئے جاتے ہیں، جب کہ ان کا تعلق در اصل دوسری محترمات سے ہوتا ہے جو اس افسانے میں وارد ہی نہیں ہوئیں۔ اور شاید کبھی کسی دوسرے افسانے میں آنے

کی دلداتک رہی ہیں۔

☆کبھی آپ راولپنڈی میں کسی عزیزہ سے خود کو منسوب بتاتے ہیں، کبھی فیصل آباد میں رشتے کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں اور کبھی جرمن دوشیزاؤں کی زلف کے اسیر ہو جاتے ہیں؟

☆☆فیصل آباد والا قصہ تو دراصل اپنے دوستوں سے وقتی طور پر پیچھا چھڑانے کے لئے گھڑ لیا گیا تھا۔ میرے افسانوں میں جرمن دوشیزاؤں کی زلف کی اسیری بھی محض زیبِ داستان کی خاطر ہے۔ مگر شیا رہا کے بعد، جو بہت جلد میری زندگی سے نکل گئی تھی، میری محبت صرف ہلگا کے لئے رہ گئی تھی اور آج تک ہے اور ہلگا نے چاہا تو ہمیشہ رہے گی۔

☆کچھ تعارف محترمہ ہلگا اور دختر سے ہمارے قارئین کا کرائیے۔ اور یہ بھی فرمائیے کہ ایک مشرقی بالخصوص پاکستانی کے لئے مغربی شریکِ حیات کے تحفظات و فوائد کیا ہیں؟

☆☆ہلگا میری شریکِ حیات ہی نہیں میرے لئے قدرت کا بہت عظیم انعام بھی ہے۔ مگر میں نے زندگی بھر اس کو ملنے سے پہلے کوئی انعام قبول نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ مولوی فاضل کے امتحان میں یونیورسٹی میں اول آنے پر ملنے والا گولڈ میڈل لینے کے لئے بھی نہیں گیا تھا۔ ہلگا کی ماں جرمن تھی اور باپ آسٹرین۔ جس نے جرمن قومیت اختیار کر لی تھی۔ ہلگا کا بچپن آسٹریا اور اٹلی میں گزرا اور لڑکپن جنوبی امریکہ کے ملک چلی اور پیرو میں۔ ہماری ملاقات ہمبرگ یونیورسٹی میں طالب علمی کے زمانے میں ہوئی۔ اس نے بھی میری طرح ڈاکٹریٹ کر رکھی ہے۔ البتہ اس کا مضمون ہسپانوی ادب تھا۔ ہماری شادی کو اب چالیس سال ہونے کو ہیں۔ ہلگا جیسی صاف دل، انصاف پسند اور اصولوں کی پابند عورت میں نے کہیں نہیں دیکھی۔

رہی دختر کی بات، تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے میرا افسانہ "جنم جنم کا ساتھ" پڑھ رکھا ہے۔ ورنہ میں آپ کو محمود احمد قاضی کے الفاظ میں "دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا ہوں"۔ آپ نے اس کہانی کو سچ سمجھتے ہوئے یاد کر لیا ہے کہ اس افسانے کے اختتام پر نمودار ہونے والی لڑکی سچ مچ میری بیٹی ہے۔ ہم افسانہ نگار جرمن محاورے کے مطابق بہت کچھ گھڑ جاتے ہیں جب دن لمبا ہوتا ہے۔ میں نے اپنے افسانوں کے مجموعے "لافانی عشق اور دوسرے افسانے" کے پیش لفظ میں لکھا تھا "ضروری نہیں ہوتا کہ ادبی کہانیاں سچی ہوں"۔

میرا تجربہ مشرقی ہوتے ہوئے ایک مغربی عورت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا بہت کامیاب رہا ہے۔ اگر دونوں طرف سے خلوص اور محبت کے جذبات کارگر ہوں، تو پھر یہ امر غیر اہم بن جاتا ہے کہ کون کہاں سے آیا ہے یا کہاں پر پیدا ہوا تھا۔ البتہ یہ ضروری ہوگا کہ ہمارے ہاں رائج مردوں کی بالادستی کے تصورات سے نجات حاصل کر لی جائے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پر ہمارے ہم وطن اکثر ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ پھر اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ رشتہ وہاں پر کیا جائے جہاں پر مرد اور عورت کی ذہنی سطح ایک جیسی ہو۔

☆برطانیہ میں مقیم اردو کے ایک بڑے شاعر اپنی غیر ملکی بیگم کو قریبی دوستوں سے بغل گیر ہونے اور انتہائی قریبی دوستوں سے بوس و کنار کے مواقع فراہم کیا کرتے ہیں۔ آپ کے ہاں دوستوں کی تواضع کے لئے کیا اہتمام کیا جاتا ہے؟

☆☆کیا آپ جانتے ہیں کہ پاکستان میں جھنگ کے علاقے میں جانگلی عورتیں غیر مردوں سے بھی بغل گیر ہو کر ملتی ہیں؟ چلی میں تو بوسے بھی دیتی ہیں اور چومنے دیتی ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ برطانیہ میں مقیم میرے عزیز دوست نے صرف فیض احمد فیض کے بے تکانہ طرز طریق کو قبول کیا تھا یا دوسروں کی حرکات رذیلانہ پر سے بھی صرفِ نظر کرتے ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر اس بات کو پرکھنے کا موقع نہیں ملا۔ میری ملاقات ان کے ساتھ لندن کے ایک پب میں ہوئی تھی۔ ہلگا اس قسم کے کسی دوستانہ یا بے تکانہ بوس و کنار کی کبھی اجازت نہیں دیتی، بلکہ مجھے بھی کھلے عام دوسروں کے سامنے بوسہ نہیں لینے دیتی۔ وہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتی ہے جو قدیمی ادب آداب کی پاسداری کرتا ہے۔ ہمیں مصر میں ہاچپ سوت کے محل کے سامنے ایک مصری نوجوان نے کہا کہ وہ ہمارے ساتھ تصویر بنوانا چاہتا ہے۔ مجھے اس بات پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ مگر ہلگا نے فوراً انکار کر دیا اور آج تک مجھے یہ چیز معاف کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ مصری اپنے دوستوں کو ہمارے ساتھ کھینچی ہوئی تصویر دکھا کر کہتا پھرتا کہ اس یورپین عورت کے ساتھ اس کے تعلقات رہے ہیں۔

☆مشرقی تہذیب، تمدن، زبان اور ادب کا آپ کے گھر میں مقام اور مستقبل کیا ہے؟

☆☆ہلگا مجھ سے زیادہ مشرقی ہے۔ وہ کسی بھی مذہب کی پیروکار نہ ہوتے ہوئے بھی بہت پرہیزگار اور ایماندار ہے۔ ہمارے گھر کی مشترکہ زبان جرمن ہے۔ ہلگا اطالوی، ہسپانوی اور پرتگالی ادب کی بہت دلدادہ ہے، بلکہ ان پر ماہرانہ نظر رکھتی ہے۔ اردو ادب میرے لئے مختص ہے، جس کو میں ہر روز پڑھتا ہوں، مگر سال میں صرف ایک آدھ بار ہی کسی کو اردو بولتے ہوئے سنتا ہوں۔ خود کسی دوست یار سے فون پر بات کرتا ہوں، تو منٹو کی طرح پنجابی کا تڑکہ دیتا ہوں۔ اپنے بھائی اور بہن بہنوئی سے پنجابی میں بات کرتا ہوں۔ میرے بھائی کی پہلی اور دوسری بیویاں دونوں انگریز تھیں۔ اس لئے اس کے بچے دیسی زبانوں سے نابلد ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا آئندہ کی آل اولاد میں سے کوئی بھی بھول کر اردو کی کتاب رسالہ کھول کر دیکھتا ہے یا نہیں۔ اردو ادب ہمارے گھرانے میں میرے بعد ختم ہو جائے گا۔ رہے نام اللہ کا۔

☆جرمنی میں آمد کے بعد ایک مدت تک اپنی زبان اور ادب سے کٹے رہنے کے اسباب کیا تھے۔ اور آپ اس خلا کو آج کس طرح محسوس کرتے ہیں؟

☆☆ میں نے اپنے آپ سے ایک معاہدہ کیا تھا کہ دس برس تک اردو ادب کی کوئی چیز نہیں پڑھوں یا لکھوں گا اور اس عرصے میں جرمن زبان و ادب سے آگاہی پیدا کروں گا اور دیکھوں گا کہ کیا میں ان سے کچھ سیکھ سکتا ہوں۔ پھر جب میں نے اردو ادب کی طرف واپس لوٹنے کا ارادہ کیا، تو پتا چلا کہ میری گرفت زبان پر کمزور پڑ چکی تھی۔ اس لئے میں نے پہلے اپنی زندگی کا جائزہ لینے کے لئے نوٹس لینے شروع کئے، جو گویا میری خودنوشت کی ابتدا تھی۔ پانچ برسوں تک گرمیوں کی چھٹیوں میں یہ نوٹ بک ہمارے ساتھ سفر پر جاتی رہی اور میں فرصت کے اوقات میں عمر گزشتہ کے احوال لکھتا رہا۔ پانچویں سال افسانہ لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ جس کے نتیجے میں وہ افسانہ تخلیق پا گیا، جس سے آپ نے میری مراجعت کا سراغ لگایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے جرمن ادب کو اردو میں ڈھالنا شروع کیا۔ اس کے بعد کیا ہوا اس بارے میں مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

لیکن اسی عرصے میں جب کہ میں نے اردو ادب سے منہ موڑ رکھا تھا، اردو ادب پر علامتی اور تجریدی افسانہ نگاری کا بھوت چھایا رہا۔ مگر مجھے اس بات کا پتا بہت بعد میں جا کر چلا اور میں خوش ہوں کہ میں اس بے فیض تجربے سے محفوظ رہا۔ آج وہ لوگ بھی اپنی زندگی کے ان برسوں کو ضائع شدہ قرار دے رہے ہیں جو اس زمانے میں بہت بڑا نام ہو گئے تھے۔ اگر میری بات پر یقین نہیں آتا تو لندن میں مقیم میرے افسانہ نگار دوست جتندر بلو کی نئی کتاب "چکر" کا یہ اقتباس پڑھیں۔ وہ لکھتا ہے

"میں نئی جہات، نئی راہیں، نیا منشور اور شب خون جیسا جدید رسالہ پا کر نہال ہو گیا تھا۔ ایک طرح سے مجھے کھوئی ہوئی جنت مل گئی تھی۔ میں نے بھی دوسرے ادیبوں کی طرح علامتی، استعاراتی اور تجریدی کہانیاں سپرد قلم کیں جو نیم اسطوری تھیں، تاکہ ان کی پرتیں، داخلی سچائیاں، نئے معنی اور گہرا علم قاری کی ذہانت میں اضافہ کرے۔ مجھ جیسا ادیب واقعی جدید بوتل میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن جب میں نے ۱۹۷۲ء میں لندن پہنچ کر مغربی تہذیب، اقدار و روایات، طبقاتی تفریق اور بھاگتی دوڑتی زندگی کو قریب سے دیکھا اور سفید فام لوگوں کو براہ راست ملا تو کھلا کہ جناب فاروقی نے بھارت کی جوان نسل کو جدیدیت کا جو نظریہ پیش کیا تھا، وہ بیس پچیس سال پرانا تھا، جب کہ مغربی ادبی شخصیات کا نقطہ نظر (کنزا) بالکل ہی برعکس ہے۔ ان کے نزدیک زندگی آج بھی بے معنی ہے اور لوگ باگ مادہ پرست، بے حس اور مارفیت زدہ ہیں۔ لیکن وہ الجھی ہوئی بے معنی زندگی کو مزید الجھنے (کنزا) کی بجائے اس میں محبت، اقدار، معنی، اپنائیت، ہمدردی، سچ اور صحت مند رویوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جب جب اردو ادب کی تاریخ رقم کی جائے گی تو مورخ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے آٹھویں دہائی کے جدید ادب کا احاطہ کرتے وقت اس سیاہ دور کو گرہن کی، بے معنی اور حقیر قرار دے گا اور جدیدیت کے علمبرداروں کو مورد الزام ٹھہرائے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے جدیدیت کے چکر میں اپنے کئی بہترین سال ضائع کئے۔"

☆ کہانی یا افسانے میں آپ کا کوئی رول ماڈل رہا ہے یا جہاں جو اچھا لگا اپنا لیا؟

☆☆ آپ نے میرے افسانوں کے پہلے مجموعے "زرد ستارہ" کی پہلی تحریر "بقلم خود" میں پڑھا ہوگا کہ افسانہ نگاری میں میرا پہلا استاد "قندیل" کے ایڈیٹر شیر محمد اختر تھے، جو نفسیاتی افسانہ لکھتے تھے۔ یہ سبق میں اب تک نہیں بھولا ہوں۔ مجھے اردو افسانہ نگاروں میں منٹو نے متاثر کیا ہے جو میرے معاصر تھے۔ اس لئے ان کا ہر افسانہ میری نظر سے گزرتا تھا۔ غلام عباس، بیدی، کرشن چندر کے افسانے بھی مجھے بھاتے تھے۔ پھر روسی افسانہ نگاروں کا دور آیا، جن کو میں نے جرمنی میں آنے کے بعد پڑھا۔ جرمنی میں میرا پہلا تعارف وولفگانگ بورشرٹ سے ہوا، جس کا عرصہ حیات مختصر تھا، مگر وہ بہت بڑا افسانہ نگار بننے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ میرا جرمن ادب سے پہلا ترجمہ اسی کا افسانہ "اس منگل کے روز" تھا۔ کافکا سے میں نے دوسروں کے علاوہ یہ سبق سیکھا کہ کہانی کو سہل زبان میں لکھا جائے، تو اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ اگر میرے افسانوں میں جرمن ادب کی چھاپ نظر آئے، تو اس کی آسان توجیہ یہ ہے کہ میں نصف صدی سے دن رات اس کے ساتھ جاگتا اور سوتا ہوں۔

☆ آپ کے افسانوں میں نفسیاتی عمل کی کارفرمائی جا بجا نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی یہ عمل بہت پیچیدہ اور گنجلک بھی ہو جاتا ہے؟

☆☆ مجھے شروع سے نفسیات میں دلچسپی رہی ہے۔ اس لئے میری کہانیاں کرداروں کی سائیکی میں اترنے کی کوشش کرتی ہیں۔ افسانوں میں پیچیدگی کا پیدا ہونا اس بات پر دال ہے کہ کردار کی ذات کی پرتیں کھولی جا رہی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ میری کوشش ہوتی ہے کہ افسانے کی زبان آسان رہے اور قاری کو کہانی کے پیچھے چھپی ہوئی کہانی کی دوسری پرت تک پہنچنے میں مشکل پیش نہ آئے۔

☆ آپ کے ہاں تشنگی بھی تسلسل سے پائی جاتی ہے؟

☆☆ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں دراصل شروع سے اب تک ایک ہی کہانی سناتا رہا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میرے افسانوں کو ایک قسط وار پیش کیا جانے والا ناول سمجھ لیں۔

☆ مغرب میں طویل قیام کے باعث آپ کی تحریروں پر فحاشی کا الزام بھی لگتا ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ کے افسانوں میں افسانہ کم اور بائیوگرافی زیادہ ہوتی ہے؟

☆☆ اگر آپ ادب میں فحاشی کا نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں، تو نوبکوف

(Nobokov) کی "لولیتا" پڑھیں، پھر میرے افسانوں پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ ان میں کیا فرق ہے۔ میرے افسانوں میں فحاشی نہیں ہوتی، بلکہ اس زندگی کی عکاسی ہوتی ہے جو میرے اردگرد دکھائی دیتی ہے۔ میری تحریروں میں آپ کو کبھی جنسی سین نہیں ملیں گے۔ یورپ کے ادب میں لکھی جانے والی زبان کبھی کی بہت آگے جا چکی ہے۔ ابھی جرمنی میں ایک نوجوان ادیبہ نے اپنی پہلی کتاب شائع کی ہے، جس کا عنوان "گیلے (پوشیدہ) اندام" ہے۔ اس کتاب پر اس کو انعام ملا ہے اور اس کی فلم بن رہی ہے۔

افسانوں میں بائیوگرافی دراصل ایک خاص قسم کا اسلوب ہے، جس کا مقصد قاری کو اپنا ہم لکھاری بنانا ہے۔ جب وہ کہانی کو آپ کی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے تو آپ کا ہمنوا بن جاتا ہے اور آپ کو ایک دوستی میں بے شمار خون معاف کر دیتا ہے۔

☆ آپ کے ہاں ادب نظریات کی ترسیل کا ذریعہ ہے یا آپ ادب کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں۔ یعنی ہم آپ کا شمار ECRIVANT ادیبوں میں کریں یا ECRIVAIN قلم کاروں میں کریں؟

☆☆ میں کہانی کے ذریعہ پیغام پہنچانا چاہتا ہوں، البتہ آپ کو میرے ہاں اٹھی ہوئی انگلی کبھی نہیں ملے گی، جیسی ترقی پسند ادیبوں کی تحریروں میں ہوا کرتی تھی۔ جرمن ڈاکٹر کرسٹینے اوسٹرہیلڈ نے اپنے ایک حالیہ مقالے میں، جو اس نے جرمن مستشرقین کی سہ سالہ کانفرنس میں پیش کیا تھا، کہا ہے کہ میرے افسانوں میں ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت جرمن معاشرے اور ملک کے بارے میں بے شمار مواد ملتا ہے، جس کے ذریعہ میں اپنے قاری کو صرف کہانی ہی نہیں سناتا، بلکہ یہ بھی بتاتا ہوں کہ وہ کیسے اور کہاں پر وقوع پذیر ہو رہی ہے۔ اس نے میرے افسانوں کے مطالعے سے یہ دیکھنا چاہا تھا کہ کیا میں اپنے قارئین کے سامنے جرمن معاشرے کی ایک ایسی تصویر تو نہیں پیش کر رہا، جس کا وجود نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح جیسے مستشرقین نے مشرق وسطیٰ کی ایک خاص تصویر مغرب میں بنائی تھی، جس کے بارے میں ڈاکٹر ایڈورڈ سعید نے کہا تھا کہ مستشرقین دراصل یورپین کولونیل ازم کے ایجنٹ تھے، جن کی مدد سے اسلام اور مسلمانوں کا استحصال کیا گیا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ میرے افسانوں میں زندگی کو اس کے اصل روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ میں نہ تو اس میں اپنی طرف سے رنگ بھرتا ہوں اور نہ ہی زندگی کی بے رحم حقیقتوں سے صرف نظر کرتا ہوں۔

☆ ہر اہم سفر اور واقعے سے منسوب کہانی کا کردار اور حوالہ آپ کے ہاں موجود ہوتا ہے، مگر سفر ایران میں پتھر کا تحفہ دینے والی بچی، جس کی کہانی لکھنے کی ترغیب آغا بابر نے آپ کو دی تھی وہ نظر نہیں آتی؟

☆☆ یہ کہانی اور ایسی بے شمار دوسری کہانیاں اپنے وقت کا انتظار کر رہی ہیں۔

☆ آپ نے اردو کے ساتھ جرمن اور انگریزی میں بے پناہ تخلیقی کام کیا، تاریخ اور ترجمے میں بھی آپ کی خدمات گراں مایہ ہیں، مگر تنقید کی جانب نہ آپ نے توجہ کی، نہ ناقدین نے آپ کو لائق توجہ جانا؟

☆☆ آپ کو یاد ہو گا کہ ممتاز مفتی نقادوں سے کہا کرتے تھے کہ تنقید کا دھندا بند کر دیں اور کوئی تخلیقی کام کریں۔ میں بھی ان کی طرح تخلیقی کام کو اہمیت دیتا ہوں۔ اردو ادب میں تنقید کے سلسلے میں ستائش باہمی کا سلسلہ چل رہا ہے۔ اکثر نقاد اپنے دوستوں کی تخلیقات کے بارے میں لکھتے ہیں۔ دوسروں کی کتابیں وہ شاید پڑھتے ہی نہیں۔ میں "فنون" اور "اوراق" کو اپنی کتابیں تبصرے کے لئے بھیجا کرتا تھا۔ مجھے کہا گیا کہ اپنے کسی دوست سے تبصرہ لکھوا کر بھیج دیں، تو چھپ جائے گا۔ میری کتابوں پر بہت سے ادیبوں نے لکھا ہے، جن میں انتظار حسین، ڈاکٹر انور سجاد، جیلانی کامران، آغا بابر، فتح محمد ملک، محمد سلیم الرحمٰن، جمیل یوسف، آصف فرخی، ڈاکٹر خالد سہیل، ابو طفیل علی کمیل قزلباش، سعید اختر چغتائی، شافع قدوائی، سید احمد سعید ہمدانی، سعید انجم، امجد علی شاکر، ڈاکٹر کرسٹینے اوسٹرہیلڈ اور دوسرے بہت سے ادیب شامل ہیں۔ ڈاکٹر مقصود حسنی نے ایک پوری کتاب لکھ دی ہے "شفیع الدین احمد کے افسانے۔ تنقیدی جائزہ مطبوعہ پنجاب بک ڈپو۔ ۱۹۹۵ء۔"

☆☆ آپ کو جرمن زبان پر جس قدر عبور حاصل ہے، اس کے بعد آپ سے جرمن میں تخلیقات کی توقع رکھنے والے حق بجانب تصور ہوں گے؟

☆☆ اگر آپ کی مراد اس سوال سے یہ ہے کہ میں پاکستانی ادب کو جرمن میں ڈھالوں، تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ میں نے پہلے بھی ایک کتاب اس سلسلے میں چھپوائی تھی۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا انتخاب ہو چکا ہے اور اکثر کہانیوں کا ترجمہ بھی تیار ہے۔ ایک جرمن پبلشر عرصے تک میرے پیچھے لگا رہا کہ اپنی کہانیوں کا جرمن میں ترجمہ کروں، میں چھاپوں گا۔ مگر میرا جواب تھا کہ میری کہانیاں ہندو پاک کے قاری کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ جرمن قاری شاید ان کو اس نظر سے نہ دیکھ سکے گا۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ ترجمہ بہت مشقت کا کام ہے، جس پر بہت وقت لگتا ہے۔ بہتر ہو گا اگر یہ کام پروفیشنل مترجم کریں۔

☆☆ ہمارے قارئین آپ کی زبانی جرمن تاریخ، تہذیب، تمدن اور جرمن شاونزم (اگر کوئی ہے) کی بابت آگاہی کے خواہش مند ہیں؟

☆☆ اس سوال کا جواب چند سطروں میں نہیں دیا جا سکتا۔ بہتر ہو گا اگر قاری میرے افسانے پڑھے۔ ان میں بہت سی باتیں آ گئی ہیں۔ جرمن قوم کو پچھلی صدی کی دو عالمی جنگوں نے مجبور و لاچار کر دیا ہے۔ کہنے کو وہ آزاد ہیں، مگر اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ امریکی فوج آج بھی اس ملک میں بیٹھی ہے۔

☆☆ جرمن لوگ نازی پارٹی سے برائت کا اظہار کس سائیکی کے تحت کیا کرتے ہیں اور یہودیوں کی بابت اپنے طرز عمل پر ان کے احساسات آج کس طرح کے ہیں؟

☆☆ جب میں ۱۹۶۰ء میں جرمنی آیا، اس وقت دوسری جنگ عظیم کو ختم ہوئے

پندرہ برس ہو گئے تھے۔ میرا واسطہ دن رات ان لوگوں سے پڑتا تھا، جو جنگ میں محاذ پر لڑ چکے تھے یا پہلے وقتوں میں نازی پارٹی کے رکن رہ چکے تھے۔ مگر مجھے کوئی شخص نہیں ملا، جس نے کھل کر تسلیم کیا ہو کہ وہ نازی رہ چکا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ان لوگوں کو زمین نگل گئی تھی۔ پوری قوم اپنا حافظہ کھو چکی تھی یا کم از کم دیکھنے والے کو یہی لگتا تھا۔ جرمنوں کی نئی نسل نے حافظے کے قومی فقدان کے خلاف بغاوت کی، جو ۱۹۶۸ء کی طالب علموں کی تحریک کی صورت میں سامنے آئی۔ نوجوان نسل ایک طرف ماں باپ سے جاننا چاہتی تھی کہ انہوں نے کیوں نازی پارٹی کا ساتھ دیا تھا، تو دوسری طرف ان کا سوال تھا کہ جرمن قوم کیوں اسرائیل کی طرف سے فلسطینیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم پر چپ سادھے بیٹھی ہے۔ اس تحریک کو طاقت کے بل بوتے پر کچل دیا گیا۔ لیکن اس تحریک کے اٹھائے ہوئے سوالات کی بازگشت آج بھی جرمن معاشرے میں ملتی ہے۔ جرمن حکومت چاہے کتنی بھی اسرائیل کی طرف داری کیوں نہ کرے عوام کے دلوں میں اسرائیل کے خلاف جذبات پیدا ہو چکے ہیں۔ جن کا اظہار لوگ اب دبی زبان میں کرنے لگے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ نازیوں نے یہودیوں پر جو مظالم روا رکھے تھے ان کو عوام درست سمجھتے ہیں۔ نہیں بلکہ ان کی آنے والی نسلیں ان کی آل اولاد کو اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔

☆ تراجم آپ کا میدان ہے اس کے تراجم مسلم حیثیت رکھتے ہیں۔ شاعری کے تراجم کے لیے خاص شعری بصیرت درکار ہوا کرتی ہے۔ آپ کے ہاں اس کا ماخذ کیا ہے؟

☆☆ میں صرف ان چیزوں کا ترجمہ کرتا ہوں، جن کو میں خود سمجھ سکتا ہوں۔ اگر کوئی چیز میرے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہے تو میں اس کو اردو میں ڈھالنے کی سعی نہیں کرتا۔ میرے تراجم کے سلسلے میں بہتر ہوگا کہ میں آپ کے سامنے کشور ناہید کی رائے رکھوں، جو اس نے میرے تراجم پڑھنے کے بعد قائم کی تھی۔ کشور نے لکھا۔ "میں نے آپ کے جرمن زبان سے براہِ راست اور یہاں انہیں ماگی سے لے کر منو بھائی اور معتزہ نجم سید کے انگریزی زبان سے تراجم دیکھے ہیں۔ آپ کا ترجمہ زیادہ جامع، زیادہ بے ساختہ اور زیادہ پُرکشش ہوتا ہے۔ یہ ہنر دیکھنے کی بات نہیں، بلکہ عرض کرنے کا مقصود یہ ہے کہ آپ کی شہرت بہت بڑے شاعری نہ ہونے کے باوجود بہت بڑے مترجم کی تو ہے۔ یہ وصف ابھی تک کوئی اور قابلِ اعتبار شاعر حاصل نہیں کر سکا۔"

☆ پاکستان کے علاقائی ادب کو جرمن زبان میں منتقل کرنے کا انتخابی معیار کیا ہوا کرتا تھا۔ اور جرمنی میں ان کی پسندیدگی و پذیرائی کس پیمانے پر ہوئی ہے؟

☆☆ یہ کتاب میں نے این ماری شمل کے تعاون سے لکھی تھی، جس کو سندھی سے خاص لگاؤ تھا۔ اس زبان کا انتخاب اس کا تھا، جس میں صوفی شاعری کے علاوہ معاصر شاعری اور ادب کے چیدہ شاہکار اور سندھی لوک کہانیاں بھی شامل تھیں۔ پنجابی کے لیے ہم نے بلھے شاہ اور شیخ محمد فضل کی شاعری میں سے انتخاب کیا تھا۔ پشتو کے لیے این ماری شمل نے خوشحال خان خٹک اور رحمن بابا کو چنا تھا اور میں نے زیتون بانو کا افسانہ شامل کیا تھا۔ ہندکو میں سے فارغ بخاری کے افسانے "چاچا حسو" کا ترجمہ میں نے کیا تھا۔ باقی کتاب اردو ادب کے چیدہ شاعروں اور افسانہ نگاروں کی تحریروں پر مشتمل تھی۔ یہ کتاب بہت بڑے پیمانے پر جرمنی میں پڑھی گئی۔ اس پر تبصرے چھپے اور سارے ملک کی اہم لائبریریوں میں موجود ہے۔

☆ جرمن لوگ اسلام کے کس تصور سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرتے ہیں اور اسلام کی قبولیت کے بعد اپنی آئیڈنٹی کیوں تبدیل کیا کرتے ہیں؟

☆☆ جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں، ان کے نزدیک اسلام کی سادگی اور اس کی تعلیم کا عقل اور فطرت کے مطابق ہونا سب سے زیادہ اہم ہے۔ عیسائیت یوں بھی جرمن معاشرے سے ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اب بس اس کی حیثیت فوک لور کی ہے۔ جس میں سال کے اندر چند تہوار ہیں۔ جن پر تحفے تحائف دیے اور وصول کیے جاتے ہیں۔ جب کہ اسلام قبول کرنے والے اس مذہب کی تلاش میں ہیں جو انسان کو روحانی سرور اور اطمینان دے سکے۔ اپنی آئیڈنٹی کے بدلنے کی متعدد مثالیں سامنے آئی ہیں۔ جو شاید یہ دکھانے کے لئے ہوتی ہیں کہ وہ نو مسلم نہیں، بلکہ ان کے آبا و اجداد مسلمان تھے، گویا وہ پیدائشی ہیں۔

☆ علامہ اقبال کی یادِ وطن آج کل کس حال میں ہے اور جرمنی میں بالخصوص اس درسگاہ کے لوگ علامہ اقبال کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ آپ کا بھی علامہ کے بارے میں کوئی نظریہ یا عقیدہ ضرور ہوگا؟

☆☆ عام طور سے لوگ سمجھتے ہیں کہ علامہ اقبال کی یادِ وطن جرمنی میں ہائیڈل برگ کی یونیورسٹی تھی۔ اس سلسلے میں جاننا چاہیے کہ علامہ اقبال کو کیمبرج سے ان کے استاد آرنولڈ نے وہیں پر بھیجا تھا اور وہاں کے ایک پروفیسر کے نام پیغام بھیجا تھا کہ میرے شاگرد محمد اقبال نے ایک مقالہ لکھا ہے، جس پر انہیں اگر آپ کی یونیورسٹی ڈاکٹریٹ کی ڈگری دے سکے تو خوب ہوگا۔ (البتہ موصوف نے یہ نہیں بتایا تھا کہ علامہ اقبال کو اسی مقالے پر بی اے کی ڈگری کیمبرج یونیورسٹی سے مل چکی تھی) جرمن پروفیسر نے اس درخواست کو قبول کرنے سے معذوری کا اظہار کیا، کیونکہ یونیورسٹی کے قواعد کے مطابق طالب علموں کو باقاعدہ طور پر داخلہ لے کر کئی برسوں تک وہاں پر تعلیم حاصل کرنی ہوتی ہے اور ڈاکٹریٹ کا مقالہ اس موضوع پر لکھا جاتا ہے، جس کی منظوری یونیورسٹی نے دی ہو۔ جس مہینے میں علامہ اقبال جرمنی آئے تھے، اس وقت وہاں پر یونیورسٹیوں میں گرما کی تعطیلات تھیں۔ اس لئے موصوف ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں داخلہ نہیں لے سکے تھے۔ البتہ وہ یہ کر سکے تھے کہ وہاں پر قیام کے دوران پرائیویٹ طور پر جرمن زبان کا درس لیا کریں۔ جو ان کو مس ویگناسٹ (Wegnast) دیتی رہی

تھیں۔ ہائیڈل برگ سے جب بل جانے پر آرنولڈ صاحب نے میونخ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کو لکھا جن کے ساتھ ان کے مراسم تھے۔ انہوں نے اس معاملے میں مدد دینے کا وعدہ کر لیا اور علامہ اقبال کو میونخ آ کر ملنے کو کہا۔ (اس دوران میں علامہ اقبال کو جرمنی آئے ہوئے دو تین ماہ ہو چکے تھے) یہ ملاقات پروفیسر صاحب کے گھر پر ہوئی، جہاں پر ان کی بیٹی نے علامہ اقبال سے جرمن میں بات کی تا کہ پتا چلے کہ موصوف نے کس قدر زبان سیکھ لی ہے۔ اس کو ہمارے ہاں امتحان کا نام دیا جاتا ہے جو دراصل محض چند فقروں کا تبادلہ تھا۔ یوں بھی پروفیسر صاحب کی بیٹی یونیورسٹی کی طرف سے ممتحن نہیں مقرر کی گئی تھی۔ پروفیسر صاحب کی تجویز پر علامہ اقبال نے میونخ یونیورسٹی میں داخلہ لے کر اپنا مقالہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے جمع کرا دیا۔ علامہ اقبال نے دونوں یونیورسٹیوں میں ایک دن بھی درس نہیں لیا۔ ان کا جرمنی میں قیام زیادہ سے زیادہ چار ماہ کا تھا، جس کے اختتام پر وہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر انگلستان سدھار گئے، جہاں سے ان کا مقالہ چھپوا دیا گیا۔ اب آپ خود بتایئے کہ جرمنی میں علامہ اقبال کی مادر علمی کونسی یونیورسٹی تھی؟ حکومت پاکستان نے ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں ایک چیئر برائے اقبال اور پاکستانیات قائم کر دی ہے مگر اس وجہ سے یہ یونیورسٹی ان کی مادر علمی نہیں قرار دی جا سکتی، جو ہمارے ہاں عام طور سے غلط فہمی کے سبب کہی جاتی ہے۔ وہ ہائیڈل برگ میں مقیم ضرور رہے تھے مگر یونیورسٹی کے باقاعدہ طور پر درج شدہ طالب علم نہیں تھے۔ میونخ یونیورسٹی میں علامہ اقبال کے افکار کے مطالعہ یا تحقیق کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

علامہ اقبال پر سب سے پہلا مضمون برلن سے چھپنے والے ایک ادبی مجلے میں ۱۹۳۳ء میں چھپا تھا، جس کے مصنف ایک نومسلم اسد بے (Asad Bey) تھے، جو آذربائیجان کی ایک یہودی فیملی میں پیدا ہوئے تھے، مگر بچپن میں ہی اپنے باپ کے ساتھ جرمنی آ گئے تھے۔ ان کو چونکہ فارسی آتی تھی، اس لئے وہ علامہ اقبال کے کلام کو اس زبان میں بخوبی پڑھ سکتے تھے۔ ان کے بعد جرمن مستشرق یوہانس فوک (Johannes W. Fück) نے اقبال اور ہندوستانی اسلام کے ماڈرن ازم پر مقالہ لکھا۔ مگر سب سے زیادہ علامہ اقبال کو جرمنی میں متعارف کرانے کی خدمت پروفیسر این میری شمل نے سرانجام دی۔ ایک کتاب ہم نے ۱۹۷۷ء میں جرمن پاکستان فورم کی طرف سے "محمد اقبال اور روحانیت کی تین ابعاد" کے عنوان سے شائع کی تھی، جس کے مضامین جرمن اور انگریزی دونوں زبانوں میں تھے۔ میں ذاتی طور پر علامہ اقبال کو بیسویں صدی میں اسلامی دنیا کا اہم ترین مفکر اور شاعر سمجھتا ہوں۔

☆ این میری شمل کی جرمنی میں کیا حیثیت ہے اور ان کے بارے میں مختلف ناقدین کو کس نظر سے دیکھا جاتا ہے نیز مسلم تہذیب، تاریخ اور ادب کی بابت ان کی خدمات کو جرمنی میں کس نقطے سے دیکھا جاتا ہے؟

☆ ☆ پروفیسر این میری شمل جرمن مستشرقین میں بہت اہمیت کی حامل تھیں۔ انہوں نے ۸۰ سے زیادہ کتابیں لکھیں، جن کی اشاعت بہت بڑے پیمانے پر ہوئی۔ عام طور سے مستشرقین کی تحقیقاتی کتابیں ایک محدود علمی حلقے میں پڑھی جاتی ہیں۔ یونیورسٹیوں سے باہر ان کو لوگ نہیں جانتے۔ این میری شمل نے اس سلسلے میں پہل کرتے ہوئے عام قاری کے لئے کتابیں لکھیں، جن کو علمی حلقوں میں "عوامی مطالعات" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کیونکہ ان کا علمی معیار بہت بلند نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے ایسے مصنفوں کو علمی حلقوں میں ترچھی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ان کی عوامی کتابیں یونیورسٹی کی لائبریریوں میں جگہ نہیں پاتیں۔ جرمن مستشرقین این میری شمل کی عزت کرتے تھے، مگر ان کو "رنگین پردہ" قرار دیتے تھے، جس کو دور سے دیکھا جائے تو اچھا لگتا ہے مگر جس کا کام دل کو نہیں بھاتا۔ دوسری طرف این میری شمل نے اسلام اور مشرق وسطیٰ کی تہذیب کے بارے میں اتنا کچھ لکھا اور عوام میں پھیلایا کہ یونیورسٹیوں سے باہر کی دنیا بھی ان کے نام سے بخوبی واقف تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جرمن پبلشروں کے ادارے کی طرف سے ۱۹۹۵ء میں ان کو فرانکفورٹ میں کتابوں کی نمائش کے سلسلے میں امن انعام دیا گیا۔ اس کی مخالفت اسلام دشمن حلقوں کی طرف سے کی گئی، جن کا کہنا تھا کہ این میری شمل کا رابطہ اسلامی دنیا میں بالخصوص رجعت پسند حکومتوں کے ساتھ تھا۔ اس سلسلے میں اس کی ایران دوستی اور امام خمینی کے اسلامی انقلاب کے خلاف منہ نہ کھولنے کی مثالیں دی گئیں۔ پھر کہا گیا کہ وہ سلمان رشدی کا دفاع کرنے کے لئے تیار نہیں تھی، بلکہ اس نے کہا تھا کہ اس کتاب نے مسلمانوں کو بہت دلی رنج پہنچایا ہے، جس کے سبب اس نے لوگوں کو کھلے عام روتے ہوئے دیکھا تھا۔ اخباروں میں اس کے خلاف ایک محاذ قائم کر دیا گیا، جس کے ذریعے انعام دینے والے ادارے پر زور ڈال کر اس کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ جب اس میں کامیابی نہ ہوئی، تو این میری شمل کو کہا گیا کہ وہ از خود انعام لینے سے انکار کر دے۔ اس تحریک کا کرتا دھرتا ہمبرگ یونیورسٹی میں میرا کولیگ پروفیسر گرنوٹ روٹر (Gernot Rotter) تھا، جو خود شمل کا شاگرد رہ چکا تھا۔ میں ذاتی طور پر اس کی چلائی ہوئی تحریک کے خلاف تھا اور میں نے اپنے ایک کولیگ ڈاکٹر کافی حافظ کے ساتھ مل کر، جو ایک مصری باپ اور جرمن ماں کا بیٹا ہے، این میری شمل کا انٹرویو اس کے گھر پر جا کر لیا، جس کو جرمنی کے اہم ترین روزنامے Die Frankfurter Allgemneine Zeitung نے پورے صفحے پر شائع کیا۔ اس انٹرویو کے چھپنے کے بعد ہر طرف خاموشی چھا گئی کیونکہ اس میں ان تمام اعتراضات کا جواب دیا گیا تھا، جن کی بنا پر اس کو امن انعام کے لئے غیر مستحق قرار دیا جا رہا تھا۔

☆ عزیز احمد کے افسانوں اور ناولوں کے علاوہ آپ نے کن لوگوں کی شخصیت و

فن پر کام کیا ہے اور ان کی بابت آپ کی کیا رائے ہے؟

☆☆ میں نے نذیر احمد کی تاریخی کتابوں پر لکھا تھا۔ ان کے افسانوں اور ناولوں کو پڑھا ضرور تھا، مگر ان کے ادب کے بارے میں تنقیدی مضامین نہیں لکھے۔ صرف اشفاق احمد کے افسانوں کا میں نے ایک جائزہ شائع کیا تھا۔ البتہ میں نے بالخصوص سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، شوکت صدیقی، آغا بابر اور قرۃ العین حیدر کے ادب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ یہ بات ستاروں میں لکھی ہے کہ کیا میں ان پر کبھی قلم اٹھاؤں گا یا نہیں۔ بہر صورت یہ میرے پسندیدہ ادیب ہیں۔ دوسرے بھی بہت سے ہیں مگر فہرست بنانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

☆ عربی کہانیوں کے انتخاب اور ترجمے کی بابت آپ کے تجربات و احساسات کیا ہیں۔ آپ نے کن عرب اہلِ قلم کی تخلیقات کو کتنی زبانوں میں منتقل کیا ہے؟

☆☆ عربی کہانیوں کے تراجم میں نے اس زمانے میں کئے تھے، جب میں پاکستان کی ایک جامعہ میں عربی پڑھ رہا تھا۔ عام طور سے میرے تراجم "قندیل" اور "ہفتروار" لاہور" میں چھپتے تھے۔ ان کا میرے پاس کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ یہاں جرمنی سے میں نے بالخصوص فلسطینی شاعروں کی نظموں کے تراجم اردو میں کئے ہیں۔ اکا دکا شامی اور لبنانی شاعر بھی ان میں شامل ہیں۔ مگر میں نے باقاعدہ پلان بنا کر یہ کام نہیں کیا۔ عربی محاورات اور اقوال البتہ میں نے تھوڑے تھوڑے کر کے اردو میں ڈھالے ہیں۔

☆ کیمونسٹ شاعر برتھولٹ بریشٹ (Bertolt Brecht) کے دیوان کا ترجمہ کس مرحلے میں ہے؟

☆☆ اس کی ایک سو نظموں کا ترجمہ گزشتہ تین برسوں سے میری میز کی دراز میں پڑا ہے۔ فیض احمد فیض نے ان تراجم کو سنا تھا اور چاہتے تھے کہ پیپلز پبلشنگ ہاؤس، لاہور ان کو کتابی صورت میں چھاپے۔ مگر فیض کی کے سبب یہ کام تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ پھر اسلام آباد کے ایک پبلشر نے اس کتاب میں دلچسپی دکھائی۔ وہ چاہتے تھے کہ کتاب میں اصل متن اور ترجمہ آمنے سامنے چھپے۔ مگر وہ بھی اس کام سے ہاتھ اٹھا بیٹھے کیونکہ جن لوگوں کے پاس کاپی رائٹ ہے وہ بہت بڑی رقم مانگ رہے تھے۔ جب کہ ہمارے ملک کے پبلشر مفت خورے ہیں۔ وہ ایک دھیلہ بھی کسی کو نہیں دینا چاہتے۔ میں نے ان سے اپنے لئے کسی قسم کا معاوضہ نہیں مانگا تھا۔

☆ مارکسی نظریئے کی بابت آپ کے دل میں ساخت کا درخ کے اسباب اور اس نظریہ کی بابت ذاتی رائے جاننا چاہتے ہیں؟

☆☆ برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell) نے کہا تھا کہ "جو شخص جوانی میں اشتراکی نہیں ہوتا وہ دل نہیں رکھتا۔ اور جو کوئی بڑی عمر میں بھی اشتراکی رہتا ہے اس کی کھوپڑی میں مغز نہیں پایا جاتا"۔ میں بھی عرصہ ہوا اشتراکی خیالات سے صحت یاب ہو چکا ہوں۔ بالخصوص جب سے مجھے قریب سے اشتراکی ممالک کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اس سسٹم نے کس قسم کی ناہنجار مخلوق پیدا کی ہے اس وقت سے میرا ایمان متزلزل ہو چکا ہے۔ جرمنی کے اتحاد کے سبب مشرقی جرمنی اور دوسرے اشتراکی ممالک سے آنے والے لوگوں کو دیکھ کر اور ان کی ہولناک بے حسی اور حد درجہ خود غرضی انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اگر اس سسٹم کا نتیجہ یہی نکل سکتا ہے تو بہتر ہے کہ دنیا اس تجربے سے محفوظ رہے۔

☆ سنا ہے کہ ایک زمانے میں آپ چینی مفکروں کنفیوشس اور لاؤزے سے بھی متاثر رہے ہیں؟

☆☆ میں آج بھی ان سے متاثر ہوں اور ان کے بارے میں مزید جاننے کا خواہش مند ہوں۔ میرا مسلمان چینی دوست عثمان چو شنگ شی، جس نے آگے چل کر قرآن کا ترجمہ چینی زبان میں کیا اور جو مجھے کنفیوشس کی تعلیمات ترجمہ کر کے سنایا کرتا تھا، اس کو یقین تھا کہ کنفیوشس اپنے وقت کا نبی تھا۔ اور لاؤزے کا شمار پیغمبروں میں ہوتا ہے جس کی تعلیمات کو چین پھر سے دریافت کر رہا ہے۔

☆ آج کل پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا سے کس قسم کے مراسم ہیں۔ کیا آج بھی پاکستانی سفارت خانہ آپ کو بریٹیپ کے طور پر استعمال کرنے کا خواہاں ہوا کرتا ہے؟

☆☆ گزشتہ برس جب مجھے سانس کی تکلیف ہوئی، تو تقریروں کے تمام پروگرام منسوخ کرنے پڑے۔ میں نے تب سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر آنا چھوڑ دیا ہے اس لئے پاکستانی سفارت خانے کو میری خدمات کی ضرورت نہیں رہی۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں ہے کہ آج کل جرمنی میں پاکستان کا سفیر کون ہے۔

☆ ڈاکٹر صاحب۔ کچھ لوگ آپ کی تیز رفتار ترقی اور مقبولیت کو نادیدہ ہاتھ کی کرشمہ سازی بھی گردانتے ہیں؟

☆☆ میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں خود کسی نادیدہ ہاتھ سے واقف نہیں ہوں اور نہ ہی جانتا ہوں کہ میرے گزشتہ چالیس سال کے کام اور مسلسل محنت کا محرک میرے سوا کوئی اور تھا یا ہو سکتا ہے۔ جو کچھ میں نے کمایا ہے وہ میری اپنی ذاتی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اردو ادب میں اگر میں نے تھوڑا سا نام پیدا کیا ہے تو اس میں آپ جیسے دوستوں کا ہاتھ اس حد تک ہو سکتا ہے کہ آپ نے اور دوسرے مدیران مجلات نے میرے ادب پاروں کو کھلے دل کے ساتھ قبول کیا اور چھاپ کر قارئین تک پہنچایا۔ کیا آپ کو کسی نادیدہ ہاتھ نے میری طرف متوجہ کیا تھا اور کہا تھا کہ میرے بارے میں گوشہ شائع کریں؟

☆ یقین ہے کہ خیر شجل اگر ایک استعماری ادارہ ہے تو آپ اس سے کیوں جڑے ہوئے ہیں۔ نیز ان مرحومین نے کیا پاکستانی اہل قلم کے جعلی دستخط ارسال کر کے پاکستان کو رکنیت دلانے کی کوشش کی تھی، جن کے سپرد آپ نے یہ کام کیا تھا،

کیونکہ بہت سے اہلِ قلم نے اس سے برائت کا اظہار کیا تھا؟
☆☆ اگر آپ کی منطق کو مان لیا جائے، تو پاکستان کو تمام بین الاقوامی اداروں سے علیحدہ ہو جانا چاہئے، کیونکہ وہ سب استعماریوں کے ہاتھ میں ہیں۔ خود ورلڈ یونین اور دوسرے اشتراکی ممالک بین الاقوامی پی۔ ای۔ این۔ کے ممبر ہیں۔ چاہئے تھا کہ پاکستان کے بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کو یہ سبق کس نے پڑھا دیا تھا کہ خبردار جو تم اس امپیریل ادارے کے پاس پھٹکے۔ پتا نہیں پھر کیا ہو جائے گا۔ مجھے علم نہیں ہے کہ ممبر شپ کے فارموں پر سب یا بیشتر دستخط جعلی تھے، صرف ایک صاحب نے مجھے احتجاجی خط لکھا تھا۔
☆ ایک مسلمان دانشور کی، جس کا تعلق پاکستان سے ہو، اسے برادر اسلامی ملک ایران کے خلاف منعقدہ سیمینار میں بطور مقرر مدعو کیا جانا بھی سوالیہ نشان کا حامل ہے؟
☆☆ سیمینار ایران کے خلاف نہیں تھا، بلکہ دنیا بھر میں شیعہ کمیونٹی کا جائزہ لینے کی غرض سے منعقد کیا گیا تھا۔ میرا مقالہ پاکستان کے شیعوں کی تاریخ اور حال کے متعلق تھا۔ اور میرے لئے وہاں جانا اس لئے اہم تھا کہ پتا چل سکے کہ مسلمانوں کے خلاف کیا چالیں گھڑی جا رہی ہیں۔ گویا میرا وہاں جانا بھی ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق تھا۔
☆ سلمان رشدی کی جانب آپ کی مالیوں کو پھول گردانے والے یقیناً کسی نہ کسی طور حق بجانب ہوں گے؟
☆☆ ٹاک شوز میں بعض اوقات سامعین کے لئے اس بات کا سراغ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ بحث میں کی جانے والی بات کے پیچھے کیا مقصود پوشیدہ ہوتا ہے۔ مثلاً یہ دیکھیں کہ میرے نزدیک سلمان رشدی نے اپنی رسوائے زمانہ کتاب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو پچاس صفحے شامل کئے ہیں وہ دراصل اس ناول کا حصہ ہی نہیں تھے۔ وہ کسی دوسرے وقت اور کسی اور مقصد کی خاطر لکھے گئے تھے، مگر چونکہ سلمان رشدی اپنی کتاب کو مغرب میں مقبول بنانے کے لئے ایک ایسا حیلہ ڈھونڈ رہا تھا، جس کے ذریعہ وہ مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کر سکے۔ اس لئے اس نے یہ پچاس صفحات اس ناول میں شامل کر دیئے۔ جس کے ذریعے اس کا مقصود پورا ہو گیا۔ دوسری طرف امام خمینی نے اس کے خلاف قتل کا فتویٰ دے کر مسلمانوں کو خواہ مخواہ مدعی کی بجائے مدعا علیہ کے مقام پر لا کھڑا کیا۔ اگر سلمان رشدی کی کتاب کا نوٹس نہ لیا جاتا، تو مجھے یقین ہے کہ وہ بن پڑھی رہ جاتی۔ مجھے 2 مئی میں کوئی شخص نہیں ملا، جس سے وہ کتاب پڑھی جا سکی ہو۔ 2 مئی اور بٹ آشی نوٹ کو ایک سے زیادہ نسخے اس کتاب کے لوگوں نے اس نوٹ کے ساتھ بھیج دیئے تھے کہ وہ ان سے نہیں پڑھی جاتی، اس لئے آپ کی لائبریری کو پیش کی جا رہی ہے۔ میں نے اس ٹاک شو میں کہا تھا کہ کتاب کا جواب کتاب لکھ کر دیا جانا چاہئے تھا۔ سلمان رشدی تو چاہتا ہی یہ تھا کہ

کوئی اس کے خلاف قتل کا فتویٰ دے تا کہ اس کا نام دنیا بھر کے اخبارات میں چھپے۔ اس کا نام اس وقت سے نوبل پرائز کے لئے بار بار پیش کیا جا رہا ہے مگر موصوف کا متعلقہ ناول تیسرے درجے کی تصنیف ہے۔
☆ پاکستان کے الیکشن میں عالمی ٹیم کا بصر شراب نوشی کے جھوٹے الزام سے دار کر دھاندلی کے خلاف خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔ انٹرنیشنل میڈیا پر نہ سہی پاکستان کے اعلیٰ حکام کے نوٹس میں تو یہ بات لائی جا سکتی تھی؟
☆☆ میں نے الیکشن کی عالمی ٹیم کے فائنل اجلاس میں یہ بات پیش کی تھی اور بتایا تھا کہ ووٹوں کی گنتی میں کس کس طرح دھاندلی کی گئی تھی، مگر ٹیم کے صدر کے نزدیک یہ بات کچھ ایسی اہم نہ تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم الیکشن کے غیر جانبدارانہ اور درست ہونے کا اعلان کر کے آئندہ پاکستانی حکومت کے لئے بین الاقوامی سطح پر آسانیاں پیدا کریں۔ مگر نہ مجھے پی پی پی کے امیدوار نے الیکشن سے پہلے ساہیوال میں کہہ دیا تھا کہ اس بار حکومت ہماری جیت کا فیصلہ کر چکی ہے میں نے ثبوت مانگا تو اس نے کہا الیکشن کے بعد آپ دیکھ لیں گے کہ میں نے سچ بولا تھا۔
☆ ایک پڑھے لکھے دانشور اور عالمی میڈیا پر بیٹھا سا شخص کا مقالہ چرا کر دوسرے ملک کا وزیر خارجہ اپنے نام سے پڑھ دیتا ہے مگر آپ کی اس سرقے پر خاموشی بھی سوالیہ نشان ہے؟
☆☆ میں نے اس بارے میں اپنی کتاب "ڈھلتے سائے" میں لکھا ہے کہ مجھے یقین ہے کہ ایران کے وزیر خارجہ ڈاکٹر اکبر ولایتی کو اس بات کا علم نہیں ہوگا کہ ان کی طرف سے پیش کیا جانے والا مقالہ دراصل چوری شدہ ہے۔ انھوں نے گمان کیا ہوگا کہ وزارت خارجہ کے کسی ریسرچ اسکالر نے ان کے لئے مقالہ تیار کیا تھا۔ یہ کام عام طور سے گورنمنٹ ریسرچ کا ہوتا ہے کہ کانفرنسوں وغیرہ میں پیش کرنے کے لئے مقالہ لکھیں، جو ان کے وزیر یا صدر مملکت کو سیمینار میں پڑھنا ہوتا ہے۔ چونکہ اس میں ڈاکٹر اکبر ولایتی کا قصور نہ تھا، اس لئے میں نے اس بات کا چرچا اس زمانے میں نہیں کیا۔ اب اتنے برسوں کے بعد اگر میرے "زندگی نامے" میں یہ بات آ جاتی ہے تو اس کے نتیجے میں کسی قسم کے سیاسی طوفان کے برپا ہونے کا امکان نہیں ہے۔
☆ قلم کی طاقت بجائے خود ہیبت کی حامل ہوتی ہے جبکہ اس میں عالمی میڈیا کی طاقت رکھنے والا شخص پاکستان کے اس پبلشر کی زیادتی پر بھی خاموشی اختیار کر لیتا ہے جو ہماری رقم ڈکار کر بھی کتاب نہیں چھاپا؟
☆☆ میں نے یہ کام اپنے دوست ڈاکٹر منظور محمود کے سپرد کیا تھا۔ انہوں نے خاص طور پر اس بارے میں ایک وکیل سے مشورہ کیا، جس نے کہا کہ پاکستان میں حق پر ہونا اور عدالت سے حق حاصل کرنا دو مختلف چیزیں ہیں۔ اس لئے اپنے دوست سے کہیں کہ اس شخص کو عدالت کے سامنے لے جانے کا کوئی فائدہ

نہیں ہوگا۔ آپ مقدمے بازی میں پھنس کر خواہ مخواہ اپنا وقت برباد کریں گے کیونکہ آپ کو وہ رقم واپس نہیں ملے گی، بلکہ اور زیادہ رقم بے فائدہ اس کام پر لگانی پڑے گی۔

☆ کیا آج بھی نوبل پرائز میں کسی قسم کی دھاندلی۔ لابنگ اور پی آر کا م آیا کرتی ہے نیز آپ نے پاکستان سے احمد ندیم قاسمی، شوکت صدیقی اور بھارت سے قرۃ العین حیدر کے نام کس معیار اور حوالے سے پیش کیے تھے اور ان ناموں کی ترسیل میں کس حد تک شفافیت برتی گئی تھی؟

☆☆ نوبل پرائز کے کمیٹی ممبروں سے پوچھیں تو وہ کہیں گے کہ ہمارے ہاں کوئی دھاندلی نہیں ہوتی۔ مگر حقائق ایک دوسری کہانی سناتے ہیں۔ اسٹاک ہوم میں بیٹھے ہوئے چند بوڑھے، جنہیں سوائے چند ایک یورپی زبانوں کے دنیا کی کوئی بڑی یا چھوٹی زبان نہیں آتی، ان کو دوسرے ذرائع پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ جب میں نے قرۃ العین حیدر کا نام پیش کیا، تو انہوں نے مجھے لکھا کہ میری تو ایک بھی کتاب یورپی زبانوں میں نہیں چھپی، ان کو کیا پتا چلے گا۔ اس میں تھوڑا سا قصور عینی جی (میں انہیں اسی طرح مخاطب کرتا تھا) کا بھی تھا۔ انہوں نے آخر تک اپنی کتابوں کا ترجمہ انگریزی میں نہیں ہونے دیا۔ ہمیشہ مصر رہیں کہ میں خود کروں گی۔ چنانچہ آخر میں آکر انہوں نے ''آگ کا دریا'' کا ترجمہ کیا، جو چھپ تو گیا، مگر آج تک یورپ میں نہیں پہنچا۔ اگر یہی ترجمہ کسی نیٹو انگریزی داں نے کیا ہوتا اور کسی اچھے سے ادبی ایجنٹ کے سپرد کیا جاتا تو اس کی شہرت بالکل مختلف ہوتی۔ احمد ندیم قاسمی کی بھی کوئی قابل ذکر کتاب یورپی زبانوں میں موجود نہیں ہے۔ اگر ایک آدھ کتاب جاپانی، روسی یا چینی میں چھپ گئی، تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی طرح شوکت صدیقی بھی روس میں جانے پہچانے مصنف تھے، مگر اسٹاک ہوم میں کون روسی کتابیں پڑھتا ہے۔ وہاں پر انحصار مثلاً انٹرنیشنل پین کی طرف سے پیش کیے جانے والے ناموں پر کیا جاتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ان اداروں میں وہی نام پیش کیے جاتے ہیں، جن کے بارے میں ممبروں کے درمیان کنونسنگ ہو چکی ہوتی ہے۔ میں نے اس کی مثال دی ہے کہ مجھے گلبرٹ لاؤب نے بتایا تھا کہ اس نے ذاتی طور پر چیک ادیب یاروسلاف زائفرٹ (Jaroslav Seifert) کا نام پیش کیا تھا اور اس کو انعام مل گیا تھا۔ پھر میرے سامنے کی بات ہے کہ ہمبرگ میں ہونے والی پین کانفرنس (۱۹۸۶ء) کے موقع پر مصری ادیب ابوالوفا نے مجھے اور دوسروں کو کہا کہ وہ نجیب محفوظ کا نام پیش کرنا چاہتے ہیں اور مشرقی یورپ کے وفود نے اس بارے میں ان کے ساتھ تعاون کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ چنانچہ دو برس کے بعد نجیب محفوظ کو نوبل پرائز مل گیا تھا۔

☆☆ تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ دو کشتیوں کے سوار مشکل سے ہی پار لگا کرتے ہیں۔ آپ کا اپنے بارے میں کیا حسنِ ظن ہے۔ اردو اور جرمن میں آپ کو کہاں اور کس حیثیت میں یاد رکھا جائے گا؟

☆☆ مجھے اس بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ میرا نام بہت جلد بھلا دیا جائے گا۔ برتولٹ بریشٹ نے ایک نظم میں لکھا تھا کہ جب نئی برف گرنے والی ہو تو پچھلے سال والی برف کو کیوں یاد رکھا جائے۔ بہت ہوا تو میرا نام اردو ادب کی تاریخ میں شاید کسی فٹ نوٹ میں جگہ پائے گا۔

☆ کرہ ارض پر نااتفاقی اور بے حسی کی جنگ کا انجام آپ کے خیال میں کیا ہونا چاہئے؟

☆☆ آپ بھی خوب ہیں، جو میری رائے اس بارے میں پوچھتے ہیں، جیسے کسی کو دھیلہ بھر بھی اس بات کا پاس ہو سکتا ہے کہ میں کیا سوچتا ہوں۔ جب تک انسانی نسل موجود ہے اس کی خود پسندی کا خاتمہ نہیں ہوگا۔ ہر اتفاق کے نتیجے میں نئی نااتفاقی پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ پھر ایک روز سب کچھ بھک سے اڑ جائے گا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ یہ سب کچھ ہمارے کوچ کر جانے کے بعد وقوع میں آئے۔

☆ مغرب میں بسنے والے مسلمان بالخصوص پاکستانیوں کے مستقبل کی بابت آپ کی رائے اور مشورے یقیناً اہمیت کے حامل ہوں گے؟

☆☆ میرا مشورہ یہ ہے کہ اپنے ماحول کا خلوص اور دلجمعی سے جائزہ لیں۔ مقامی زبانیں سیکھیں، آرٹ اور سائنس کی تعلیم حاصل کریں، نئے پیشے سیکھیں اور اپنے باپ دادا کی وراثت میں ملنے والی روایات کا پوری دیانت داری کے ساتھ جائزہ لیں۔ اور جو چیز اس قابل ہے کہ سنبھال کر رکھی جائے مثلاً رواداری اور انصاف پسندی، اس کو سنبھال کر رکھیں۔ باقی تمام چیزوں کو بے دردی کے ساتھ اپنی زندگی میں سے نکال دیں۔ کیونکہ وہ آپ کو آگے نہیں لے جا سکتیں، بلکہ پیچھے کی طرف لے جاتی ہیں۔ تبدیلی زندگی میں آگے بڑھنے کے لئے پہلی شرط ہے۔ اس بات کا کوئی فائدہ نہیں کہ آپ اپنے نئے وطن میں جگہ جگہ پر نئے پاکستان بناتے پھریں۔ اس کو وہیں پر رہنے دیں، جہاں پر بڑوں نے اسے قائم کیا تھا۔ یوں بھی آپ کی تیسری چوتھی نسل کو علم نہیں ہوگا کہ آپ کہاں سے آئے تھے۔ اگر میری بات پر اعتبار نہیں آتا، تو آسٹریلیا کے گھان (دراصل افغان) نام والے لوگوں سے جا کر پوچھیں، جن کو یہ بھی پتا نہیں ہے کہ ان کے آبا و اجداد پانچ چھ نسلیں ادھر اپنے اونٹوں سمیت ہندوستان کے کس علاقے سے ملک کی آباد کاری کے لئے لائے گئے تھے، جہاں پر آج کل پاکستان پایا جاتا ہے۔ اور یہ کہ ان لوگوں کی زبان پشتو تھی اور وہ اپنے آپ کو پختون کہہ کر پکارتے تھے۔ اب ان میں سے کوئی پشتو نہیں بولتا۔ شاید کسی کے گھر میں کوئی مدہم سی بلیک اینڈ وائٹ تصویر موجود ہو، جس میں ان کے دادا پردادا ایک اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے کھڑا ہے اور اس کے آگے آسٹریلیا کا وسیع و عریض ملک پھیلا ہوا ہے، جس کے دور دراز کونے پر اسے سامان رسد پہنچانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

مولوی یحییٰ[1] فضلی
عرف
ڈاکٹر منیر الدین احمد

پروفیسر سمیع اللہ قریشی
(لاہور)

پرانے دنوں کی بات ہے، بہت پرانے دنوں کی۔ شاید چھہتر برس ہونے کو آئے ہیں، جب میں اور میرا یار منیر ماجھے کے علاقے کے ایک قصبے میں چوتھی یا پانچویں جماعت میں ہم درس تھے۔ ہم دونوں چھوٹے قد بت کے پودے لڑکے تھے۔ اس کے والدین پوٹھوہار کے گاؤں چنگا بنگیال سے خدا جانے کس روحانی خوشی میں ادھر منتقل ہوئے تھے۔ حالانکہ اس کے دادا مولوی محمد فضل خان تو خود اپنے علاقے میں ایک تسلیم شدہ عالم تھے۔ عربی زبان کے فاضل اور بحر تصوف کے شناور۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی کتاب "فتوحات مکیہ" جیسی ادق کتاب کا انہوں نے اس زمانے میں اردو میں ترجمہ کیا، جب ترجمے کے کام میں ہاتھ ڈالنا ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ بہر حال منیر اور میں اکٹھے پڑھتے تھے اور ہماری یاری کی تنگ یہ تھی کہ ان دنوں نہ مجھے کچھ کھیل کود سے شغف تھا اور نہ اسے۔ دونوں اول وجہ کے کتابی کیڑے تھے۔ نظریں ہم دونوں کی ٹھیک ٹھاک کمزور تھیں، مگر ہمیں اور ہمارے ماں باپ کو شاید پتہ ہی نہیں تھا کہ عینک لگوا کر اس کمی کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ عینکیں تو ہم دونوں کو اس وقت لگیں، جب ہم ہجرت کر چکے تھے اور پاکستان بن چکا تھا اور اساتذہ کرام متنبہ کر چکے تھے کہ اگر اب بھی بر خورداروں کو عینک نہ لگوائی گئی تو نتائج کی ذمہ داری ان پر نہ ہوگی۔

منیر اور میری پڑھائی کے رویوں میں اگر کوئی فرق تھا، تو صرف یہ کہ وہ الم غلم کہانیوں کی کتابوں کے علاوہ نصاب کی کتابیں بھی بری طرح چاٹ جاتا تھا۔ اور سوا خط اس کا اس زمانے میں بھی ایسا عمدہ، پختہ اور نظر نواز تھا کہ استاد شاباشیاں دیتے تھکتے ہی نہ تھے۔ سو وہ بہت کم مار کھاتا تھا۔ بس ذرا ریاضی میں اس کی کچی ہوتی تھی۔ ادھر اپنا یہ حال تھا کہ قصے کہانیاں گھر اور مدرسے میں بستے میں چھپا کر رکھتے تھے اور انہی کو چاٹتے رہتے تھے۔ نصاب سے رشتہ کم ہی استوار ہو پاتا تھا۔ اس لئے شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہوگا جب مار نہ کھاتے ہوں۔ کان اور ہتھیلیاں اکثر سرخ ہی رہا کرتی تھیں۔ الف لیلہ کا ایک مزا ایڈیشن تھا، جو پورے تجربے کا مجموعہ تھا اور جس میں قلم سے بنائی ہوئی ہلکی تصویریں بھی ہوتی تھیں، جو اس وقت تو کچھ حیرت ہی کیا کرتی تھیں۔ ہاں مگر جب ہم دونوں عنفوان شباب کو پہنچنے کو ہوئے تو وہ تصویریں پھر یاد آنے لگیں اور ان کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے مزید اثرات بھی کچھ میں آنے لگے۔ قصبے کی لائبریری کے انچارج حکیم غلام حسین ہم پر ترس کھا کر جس کتاب پر ہم ہاتھ رکھتے دے دیا کرتے تھے۔ پتہ نہیں چھٹی جماعت تک آتے آتے ہم نے کیسی کیسی کتابیں دیکھ لیں کہ اب یہ سوچنے پر لگا ہے کہ ہم دونوں پر بچپن تو شاید آیا ہی نہ تھا۔ بس کچھ جولانی ضرور آئی۔ مگر پھر بڑھاپے کا سلسلہ دراز ہوا تو کچھ ایسا کہ اب تک ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ اب یہ کہہ دینے میں شاید کچھ حرج نہیں کہ میں اور منیر تا حال پیدائشی بوڑھے ہیں۔ سچ ہے بچپنا جلد ہی ڈھل گیا۔

ہدایت اللہ مرحوم ہمارا تیسرا یار تھا۔ اس کا باپ جلد ساز تھا۔ وہ بڑی محبت سے ہماری کہانیوں کی کتابوں کی جلدیں باقاعدہ کر ہمیں لا کر دیتا تھا۔ اور ہم انہیں بہت بہت کر رکھتے تھے۔ کیا مجال ہے جو کبھی ایک دوسرے کے سوا کسی اور کو ان کتابوں کے ذخیرے کے درشن کرائیں۔ اور یہ عادت شریفہ اب بھی ویسی کی ویسی ہے۔ یعنی اب تو ہم اپنی اپنی تالیف اور تصنیف شدہ کتابیں بھی ایک دوسرے کو نہیں دکھاتے۔ پتہ نہیں کیوں؟ شاید اس لئے کہ ویسے تو ہم نے کبھی دوڑ وغیرہ میں حصہ نہیں لیا تھا، مگر اب ایک دوسرے کی کتابیں دیکھ کر کہیں دوسرے کو یہ پتہ نہ چل جائے کہ اس بے مقصد دوڑ میں کون آگے نکل رہا ہے۔ حالانکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ میرا یار منیر بہت آگے نکل چکا ہے اور کیا مجال ہے جو تھکا ہو۔ ابھی بھی رواں دواں ہے۔ اسے ایک ماہ کی تعطیل نصیب ہو جائے تو ایک کتاب تو ویسے پڑی ہوتی ہے۔

اسکول میں ہم تفریح کے وقفے میں آم پاپڑ، میٹھی املی اور آلو چھولے کھایا کرتے تھے اور قصے کہانیوں کے خوفناک ماحول اور کرداروں پر باتیں کیا کرتے تھے۔ جن ہمیں برے لگتے تھے اور پریاں ہم دونوں کو اچھی لگتی تھیں۔ یہ بے وقوفی اب تک ہمارے ساتھ چلتی ہے۔ پریوں کی تلاش میں کچھ کھاتے ہوئے نہ جانے ہم نے کہاں کہاں کی خاک چھانی۔ مگر اس میں یہ ہوا کہ میں تو جنوں کی حدوں کا ہی اسیر رہا، مگر اس نے تو اسی وحشت میں چین، جاپان، یورپ، امریکہ جانے کہاں کہاں کی دھرتی چھولی ہے۔ اور اپنی پری کی تلاش میں وہ بہت دور نکل گیا مگر یہ ضرور ہوا کہ اس نے اسے پا لیا۔

ہجرت ہوئی تو ہم بکھر گئے۔ اسے تو کسی نئے ٹھکانے کی کوئی دقت پیش نہ آئی ہوگی۔ پوٹھوہار میں چنگا بنگیال تو پاکستان ہی میں تھا۔ ہم مگر بہت خجل خراب ہوتے ہوتے بہت دنوں میں اس قابل ہوئے کہ ضلع جھنگ میں عین چناب کے کنارے پہلے تو ایک خیمہ بستی میں جگہ لی۔ پھر کچے کوٹھوں میں اور پھر چل سو چل۔ کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد۔ میں نے لاہور جا کر بی اے آنرز کر لیا۔ اس کے بعد کی میں بیٹھی بیٹھی باتیں ہی آیا کرتی تھیں۔ ایک روز برسوں

بعد جب وہ مجھے چناب کنارے ملا تو پتہ چلا کہ وہ راولپنڈی سے یہاں پر عربی آنرز یا مولوی فاضل کرنے آیا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ بے اختیار لپٹتے ہوئے کہا۔ مولوی تم تو پہلے ہی مولوی تھے۔ تمہیں یہ مولوی فاضل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ مگر اسے اصرار تھا کہ نجات کا یہی ایک راستہ ہے ہوا چاہیے کہ میں جوانی میں اختیار کر لیا جائے۔ پھر اس نے مزے سے مولویانہ لہجے میں کہا۔ تم نے نہیں سنا شیخ سعدی کہہ گئے ہیں" در جوانی توبہ کردن شیوہ پیغمبری"۔ میں یہ فارسی سن کر دبک گیا۔ سچ ہے فارسیاں گھر گالے۔

یار شمیر پنڈی والے روایتی مولویوں کے خاندان سے تو ضرور تھا، مگر خود وہ مولوی ٹائپ سے تھا نہیں۔ جس نے پڑھنا لکھنا سیکھنے کے ساتھ ہی الف لیلہ کا بلا انتخاب مطالعہ کر رکھا ہو، وہ ظالم مولوی ہو ہی نہیں سکتا۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اس جنگل بیابان میں عربی وغیرہ سیکھنے نہیں آیا تھا۔ شاید اس کے والدین اسے اس میں ڈال گئے تھے۔ لیکن شمیر بھی دھن کا پکا نکلا اس نے عہد کر لیا کہ اب اگر والد محترم نے ایسا کر ہی دیا ہے تو وہ خود کو مولوی دھبہ ول بن کر دکھائے گا۔ سو اس نے ٹوپی اوڑھ لی اور ایک ننگی سی داڑھی رکھ لی۔ مگر عجب بات ہے کہ وہ لمبی قمیص کے ساتھ اب زیادہ تر پتلون پہنتا تھا۔ اس کے مدرسے میں اس کے ہم درس اور کوئی بڑا مولوی تو اتنا ہی بھی نہ تھا اور کوئی خرابی اس پر نہیں لگتا تھا۔

ہماری ان دنوں کی سنگت بڑی پرلطف اور مزیدار تھی۔ ان دنوں ہم نے ضیا اشدی جو ہاتھ میں آیا پڑھ ڈالا۔ مجھے کچھ نظمیں وغیرہ لکھنے کی لپک تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی افسانہ نما کہانیاں ہفت روزہ "قندیل" میں لکھتا تھا۔ اسی بستی میں ہم نے "بزم خیال" کی طرح ڈالی اور جمعہ کے جمعہ کسی کے گھر جمع ہو کر "حلقہ ارباب ذوق" کے ڈھب میں باری باری اپنی چیزیں پڑھتے اور ان پر خوب خوب تنقید کرتے تھے۔ احمد سعید ہمدانی جو اب گورنمنٹ کالج نوشہرہ کی پرنسپلی سے ریٹائر ہو کر راولپنڈی سون میں اپنا سکول چلاتا ہے اور حضرت سلطان باہو کے رسائل انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے چھاپتا ہے۔ اور جو دراصل انگہ (احمد ندیم قاسمی کا آبائی وطن) کے ہمسایہ گاؤں کھونکا کا رہنے والا ہے الطاف مشہدی کا بالکا تھا اور اسی کے الفاظ میں، جو اس نے ہمدانی کے افسانوں کے مجموعے کے پیش لفظ میں لکھے تھے، چیلا فنکار ہے۔ تاہم اسے اس دم بھی تصوف کی چیک نہیں لگی تھی اور وہ مدیرانہ گفتگو کرتا تھا اور خوبصورت ہونٹوں والا عینک پوش یاروں کا یار تھا۔ فیض کو چوہدری گھر ار تھا، جو کہ اسے یہاں مقامی اسکول میں پڑھانے آیا تھا اور دیا دل کا لکا باشی تھا۔ اور پرویز پرواز کی کو راجا عینک پوش پڑھوایا، شاعر، ادیب، فٹ بال فیفتی کی دنیا کا عاشق زار، سیلونی کے خیمہ ہوٹل میں اس کی چائے دن ہو یا رات ہو کبھی ختم نہ ہوتی تھی۔ جو بعد میں ادب میں ناول کے میدان میں ڈاکٹر ہوا اور آج کل سویڈن یا شاید کینیڈا میں کہیں اردو ادبیات پر درس دیتا ہے۔ اور اکثر شکرے جیسی آنکھوں والا پٹھان لطیف غزنوی جو کبڈی اور ہاکی میں ناموری تھا اور بعد میں ورلڈ فیڈریشن کا انٹرنیشنل ریفری بنا۔ ایک اور طرح دار قاضی نعیم الدین احمد بھی، جس کا دل سینے میں بائیں کی بجائے دائیں جانب دھڑکتا تھا۔ پتہ نہیں اور کون کون اس منڈلی کے یاروں کے ساتھ ہو لیتے تھے۔ گجرات کے گاؤں راجکی کے بشیر وڑائچ، جو عمر میں ہم سب سے بڑے تھے، مگر ہمیشہ ہمارے ساتھ ہوتے تھے اور غالب، حافظ، اور مرزا عبد القادر بیدل کے ساتھ الہام تفہیم میں ہمارے گویا استاد تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس زمانے میں ہم نے ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا۔ اچھی گفتگو کرنے کی عادت ہوئی۔ اچھے رویے اپنائے۔ باہم ٹوٹ کر محبت کی۔ یار شمیر کی صلاحیتوں کو بھی سے جلا ملی۔ یحییٰ فضلی اس نے لقب اختیار کیا۔ ہم اسے مولوی فضلی کہتے تھے۔ سب وہ لئے دیئے رہنے کی عادت ڈال کر اپنے آپ کو زبردستی مولوی بنانے کی دھن میں تھا۔ سو طالب اور نجوم اور منطق اور فلسفہ کی باتیں کرتا تھا اور جلدی ناراض ہو جایا کرتا تھا۔ مجھ سے نہ جانے کس بات پر ایک بار وہ ایسا بگڑا کہ مرنے مارنے پر اتر آیا۔ پرانے کاغذ دیکھتے ہوئے مجھے اپنی ۱۹۵۲ء کی لکھی ہوئی ڈائری کا صرف ایک ورق ہاتھ آیا۔ جنوری کی کسی تاریخ میں میں نے اس کے لئے خوب گالیاں قلم بند کر رکھی تھیں۔ لاحول ولا ۔۔۔ نہیں وہ ہمیشہ سے ایک پیارا آدمی اور پیارا دوست اور مخلص ادیب اور قابل فخر ساتھی رہا۔ ایسا ہی وہ آج بھی ہے جب کہ ۷۲ برس کی عمر پا کر جرمنی کا باشہری قرار پا چکا ہے۔

اپنی تعلیم کی تکمیل کے دوران وہ یہ انگریزی سیکھتا رہا۔ "پاکستان ٹائمز" میں بعض معاشرتی مسائل پر اس کے طویل خط بھی چھپا کرتے تھے۔ وہ بیرون ملک دوستیاں بھی خطوط کے واسطوں سے کیا کرتا تھا۔ راولپنڈی جا کر روزنامہ "تعمیر" میں بھی لکھتا رہا مگر پھر لوٹ آتا تھا اور اس کے کچے ہوسٹل کے کمرے میں سلاخ دار کھڑکیوں میں سے ہم بلا ناغہ کالے برقعوں میں ملبوس خوبصورتیوں کا نظارہ کرتے تھے۔ اور ان کے گورے ہاتھوں اور لمبی انگلیوں اور ہوش ربا مہندیوں پر تبصرے کیا کرتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سر دلہ کی خوبصورتیوں میں سے کسی نے بھی کبھی لوٹ کر ہماری جانب نگاہ تک نہ کی۔ میں اور مولوی فضلی بدستور اسی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

پھر میں سرکاری ملازمت میں بہاولنگر نکل گیا اور اس کے دل میں یورپ جانے کی دھن سمائی۔ ۱۹۶۰ء میں اس کا ایک خط مجھے "ریڈرز ڈائجسٹ" سے پھاڑے ہوئے ایک ایسے ورق پر ملا، جس کا ایک رخ خالی تھا۔ اس نے لکھا تھا اپنے اسی روشن مصوّر خط میں لکھا تھا کہ میں جرمنی جا رہا ہوں۔ تم مجھے "چناب ایکسپریس" پر بہاولنگر ریلوے اسٹیشن پر فلاں وقت مل لو۔ چنانچہ ہم ملے اور خوب گپیں ڈالیں اور باقاعدہ روئے تو نہیں، مگر ہماری آنکھیں بہت سرخ ہوئیں۔

پھر زمانے لد گئے۔ کوئی خط آیا نہ گیا۔ میں بہاولنگر سے بہاولپور، وہاں سے کوٹ خان اور پھر وہاں سے جھنگ آ کر ٹھہرا اور تیس برس یہیں پہ بتا دیے۔ یہاں اواخر کے برسوں میں جانے پھر کیسے خط و کتابت کا دوبارہ سلسلہ شروع ہوا مگر تواتر سے نہیں۔ شناسائی چھائی۔ پھر حال احوال پوچھے گئے۔ دلداریاں ہوئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم دونوں بیچ کے سالوں میں ایک دوسرے سے غافل تو نہیں رہے تھے۔ میں شاید اپنی کم گوئی میں یورپ کی ڈاک کے پیچھے بھاگتا رہا۔ وہ شاید اپنی پنڈی کے راجگان والی انا کا شکار رہا مگر دوریوں کے ان دونوں سنگلاخ کناروں کے درمیان محبت کی اور دوست داری کی اور اخلاص کی شیتل ندی بدستور بہتی رہی۔ اس ندی کا ٹھنڈا شفاف پانی جو شفاف تھا دونوں کناروں کو ایک ایک کر چھوتا تھا اور گنگناتا ہوا آگے بڑھتا تھا۔

غزل

عزمِ صمیم رکھتے ہیں سچائیوں کے ہاتھ
موتی سمیٹ لاتے ہیں گہرائیوں کے ہاتھ

اسکو اماں میں لے لیا پروردگار نے
ڈالا گیا جو چاہ میں خود بھائیوں کے ہاتھ

اللہ کے حبیب کی خدمت میں دوستوں
پیغام بھیجتا ہوں میں پروائیوں کے ہاتھ

حلقے میں میرے ایسے کئی حادثے ہوئے
بھائی ہلاک ہو گئے خود بھائیوں کے ہاتھ

دانشوروں نے جوہری سامان کر دیے
محشر بپا کریں گے توانائیوں کے ہاتھ

نشتر مقام قلب و جگر بھی عجیب
جانب گلے کے بڑھتے ہیں تنہائیوں کے ہاتھ

عبدالجبار نشتر
(جبل پور بھارت)

پتا چلا کہ اس نے مسلمانوں کے ابتدائی عہد کے نظامِ تعلیم پر ڈاکٹریٹ کر لیا ہے۔ سوئیڈن کی کسی جامعہ میں درس دیتا ہے۔ تعطیلات میں سیاسی اور عمرانی مطالعات کے لئے دنیا کے کبھی اس اور کبھی اس کنارے کی سیاحت کرتا ہے۔ اردو فارسی، عربی، انگریزی اور جرمن زبانوں میں دھڑا دھڑ کتابیں لکھتا ہے۔ ہفت زبان ہو چکا ہے اس ہفت خوانی میں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتا ہے۔ جنوبی امریکہ کے کسی دلیس کی ایک نسل کی ادا بیلی کے عشق بلا خیز میں فنا ہے۔ جرمنی کے اوٹ پٹانگ ناموں والے شاعروں کی نظموں کے تراجم اوپر تلے شائع کرتا ہے اور افسانوں کے چار پانچ مجموعے چھاپ چکا ہے۔ کبھی کبھی وطن لوٹتا ہے مگر مجھ سے جان بوجھ کر نہیں ملتا۔ بس خط لکھتا ہے اور مجھ پر اپنے کول لفظوں کی ترویش کرتا ہے۔ نہ ملے مگر میرا جی جانتا ہے کہ ایک روز تو اسے مجھ سے ضرور ملنا ہے۔ آج نہ سہی کل سہی۔ یہاں نہ سہی کہیں اور سہی۔

غزل

یہ کیسی روشنی کیسا چراغ روشن ہے
اندھیرے دل میں پڑے ہیں دماغ روشن ہے

بہت دنوں سے اندھیرا ہے دل کی بستی میں
نہ کوئی زخم فروزاں نہ داغ روشن ہے

یہ کس کی پیاس چمکتی ہے میرے ہونٹوں پر
یہ میرے ہاتھ میں کس کا ایاغ روشن ہے

میں چار دن کے لئے اس میں رہنے آیا ہوں
یہ جس کا گھر ہے اسی کا چراغ روشن ہے

وہ کائنات کہ جس کی تلاش ہے سب کو
مری نگاہ میں اس کا سراغ روشن ہے

کہیں سے کیا کوئی مہمان آنے والا ہے
مری فصیل پہ آوازِ زاغ روشن ہے

تلک راج پارس
(جبل پور بھارت)

انسانی نفسیات کی تفہیم

پروفیسر فتح محمد ملک (راولپنڈی)

ڈاکٹر منیر الدین احمد کے افسانے ہم پر ایک نئی دنیا کا دریچہ وا کرتے ہیں۔

گزشتہ ڈھائی سو برس سے ہم دنیائے مغرب کو نت نئی حیرت کے ساتھ دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا جب سر سید احمد خان کی عینک سے ہم نے مغربی دنیا کو تمام تر اوصاف حمیدہ سے متصف دیکھا، پھر اقبال کے عہد میں تہذیب مغرب کو خودکشی میں مصروف پایا۔ سر سید کی نگاہ نے اگر انسانیت کی اعلیٰ ترین اقدار کو فقط مغرب میں بروئے کار دیکھا تو اقبال نے فرنگی مدنیت کو "بے خودی و عریانی و بے کاری و افلاس" سے عبارت بتایا۔ غرض مغربی معاشرت کے عیب و ثواب کو ہم ایک گونہ انتہا پسندی اور جذباتیت سے دیکھنے کے خوگر ہیں۔ منیر کی تخلیقات کا بیشتر حصہ فرنگی تہذیب کو نئی سطح پر آپ سے متعارف کراتا ہے۔ منیر نے اس تہذیب کو نہ صرف دل کی آنکھ سے دیکھا ہے بلکہ گزشتہ تین دہائیوں سے وہاں رہتے اور بستے بھی چلے آ رہے ہیں چنانچہ وہ اس تہذیب و معاشرت کے خوب و ناخوب کو ایک غیر جذباتی لاتعلقی کے ساتھ بڑے متوازن انداز میں سمجھتے سمجھاتے ہیں جنہیں عرف عام میں مغربی تہذیب کے منفی پہلو کہا جاتا ہے وہ ان کی نہ تو مذمت کرتے ہیں نہ دفاع۔ وہ ان کو خاطر میں ضرور لاتے ہیں مگر مثبت پہلوؤں سے الگ تھلگ کر کے نہیں بلکہ ان کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔

منیر ہمیں فرنگی تہذیب کی اصل قوت سے متعارف کراتے وقت مشاہدہ حیات اور مجاہدہ فن، ہر دو کمالات سے کام لیتے ہیں۔ زر کی پرستش، نفسا نفسی، روحانی دیوالیہ پن اور خودکشی ـــــ یہ سب بالکل سامنے کی باتیں ہیں اور صحافیانہ انداز کے خارجی مشاہدے پر تکیہ کرنے والوں نے بارہا ہمیں سنائی ہیں۔ منیر ان سطحی خبر نگاشات کو بجائے خود کافی نہیں سمجھتے بلکہ ان کی تیز رَوی سے کرداروں کے باطن کی گہری گہرائیوں میں اترتے چلے جاتے ہیں" "زوال" اور "جہنم کے نوالے" میں منیر نے ہوس زر اور جنسی لذت کوشی کو مقصدِ حیات بنا لینے کے نسل در نسل چلتے ہوئے بھیانک اثرات کو جس صداقتِ احساس، نفسیاتی گہرائی اور فنی گرفت کے ساتھ بیان کیا ہے وہ اس موضوع پر لکھنے والوں کے حصے میں کم کم آئی ہے۔ منیر افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ شاعر، محقق اور جہاں گرد بھی ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں افسانہ نگار کا مشاہدہ اور شاعر کا تخیل، محقق کی جزرسی اور تجزیاتی نگاہ اور جہاں گرد کی وسیع النظری گھل مل کر ایک نئی ترکیب میں ڈھلتے نظر آتے ہیں۔ ان مختلف النوع طریقہ ہائے کار کی دلنواز آمیزش نے ان پر مغربی تہذیب کی حقیقی توانائی کا راز منکشف کر دیا ہے۔ یہ راز منیر نے ماری کے کردار کی وساطت سے ہم پر آشکار کیا ہے۔

"ایسے میں میری نظر ایک شخص پر پڑی جو لنگڑاتا ہوا اور چلتا ہوا سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، جنہیں وہ سر سے اوپر اٹھائے ہوئے ہلا ہلا کر مجھے ٹھہرنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ سچی بات ہے کہ میں اس کو اس طرح اچانک دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔ میں نے بجائے کار روکنے کے ایکسیلیٹر دبا دیا۔ اور رفتار اور بھی تیز کر دی ـــــ ماری نے بھی اس شخص کو دیکھ لیا تھا اور مجھے بار بار روکنے اور اس کی مدد کرنے کو کہتی رہی مگر میں نے اس کی بات نہ مانی۔

ماری کو اس کے گھر پہنچانے کے بعد میں سیدھا اپنے گھر پہنچا اور سو گیا۔ تین اور چار بجے کے درمیان ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف ماری تھی۔ اس کے ذہن سے اس شخص کی تصویر محو نہ ہو رہی تھی۔ اسے مجھ سے گلہ تھا کہ میں نے کیوں کار روک کر اس کی مدد نہ کی تھی ـــــ

ٹیلیفون کی گھنٹی نے مجھے دوسری بار صبح پانچ بجے بیدار کیا۔ ماری باوجود کوشش کے نہ سو سکی تھی۔ وہ سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا ضمیر اسے زندگی بھر چین نہیں لینے دے گا کہ ہم نے ایک مجبور انسان کی مدد نہ کی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس طرح ماری کی دلجوئی کروں کہ دراصل وہ آدمی خطرے میں نہ تھا بلکہ ہم دونوں، کار کے رکتے ہی اس کے ساتھی جو وہاں کہیں آس پاس چھپے ہوئے ہوں گے، باہر نکل آتے اور ہمیں اپنا یرغمال بنا لیتے۔ پھر خدا جانے ہمارا کیا حشر ہوتا ـــــ بستر سے اٹھتے ہی میں نے ریڈیو لگایا۔ ایک خبر نے مجھے چونکا دیا۔ ہلسہورن سے ہمبرگ جانے والی آٹوبان پر ایک شخص کی برہنہ لاش ملی تھی جس کے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ پولیس کی تفتیش کے مطابق اس کو اغوا کرنے والوں نے اس کے کپڑے اتار کر اسے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ وہ کسی طریق سے اپنے آپ کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور چلتا ہوا آٹوبان تک پہنچا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کار اس کی مدد کرنے کے لیے نہیں رکی اور وہ سردی میں ٹھٹھر کر مر گیا۔

میں نے فوراً ماری کو فون کیا۔ گھنٹی دیر تک بجتی رہی مگر اس نے ریسیور نہ اٹھایا۔ شام کے وقت میں اس کے گھر گیا۔ چابی میرے پاس تھی۔ ماری بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ میرے آواز دینے پر نہ جاگی تو میں نے قریب جا کر اس کو چھوا اور لرز گیا۔ اس کا جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ میز پر ایک رقعہ پڑا تھا، جو میرے نام تھا۔ اس میں ماری نے اپنی خودکشی کا الزام مجھ پر لگایا تھا اور لکھا تھا کہ رات والے واقعے کے بعد وہ زندہ نہ رہ سکتی تھی۔" (بدقسمت)

جبلی انسان دوستی اور اجتماعی ذمہ داری کا یہ گہرا اور فعال احساس ہی وہ طاقت ہے جس کے بل بوتے پر مغربی تہذیب دو صدیوں میں اپنے مسلسل بحرانوں پر قابو پاتی چلی آ رہی ہے۔ شپنگلر کے عہد سے لے کر ہمارے زمانے تک مغرب کے انحطاط کی وقتاً فوقتاً کی گئی پیش گوئیاں پادر ہوا ہو گئی ہیں۔ ان کی بنیادیں بڑی ٹھوس ہیں مگر جو چیز ہر مرحلے پر مغرب کے انحطاط اور زوال کے سیل کو تھامتی چلی آ رہی ہے وہ ماری اور "جہنم کا ساتھ" کی باربرا کے سے لوگوں کی صلابتِ کردار اور روحانی انکار ہے۔ اس صلابت و روحانی کی چھوٹ

مہاجر کرداروں پر بھی پڑ رہی ہے۔ کئی نسلوں سے مغرب کے آب و باد و خاک میں پلتے بڑھتے ہوئے لوگ کردار بھی جن اس کی خوبصورت مثال ہے۔ اس افسانے کے مرکزی کردار دین و دنیا اور جسم و روح کی کشمکش میں حیران و سرگرداں اپنی جڑوں کی تلاش میں سرگرم عمل ہے مگر اپنی اصل کی جانب مراجعت کا یہ جذبہ ماما کے جبلی جذبے سے متصادم ہے اور تصادم میں وہ اپنی شخصیت کی پوری قوت کے ساتھ کس جذبے کو اپنائے اور کسے رد کرے؟ یہ سنگین فیصلہ وہ تن تنہا اور پوری آزادی کے ساتھ بغیر کسی کے براہ راست یا بالواسطہ مشورہ کے کرنا چاہتی ہے سوا کیلئے مگھوم رہی ہے۔ منیر نے بڑی فنی مہارت کے ساتھ اس کردار کی تراش خراش کی ہے اور فیصلہ سنائے بغیر اُسے اپنے ذہنی اور علمی سفر پر رواں چھوڑ دیا ہے۔ افسانہ ختم ہوتا ہے تو قاری کردار کو منزل پر مقیم نہیں پاتا بلکہ پیہم سفر اور مسلسل کشمکش میں گم ہوتا دیکھتا ہے اور شاید یہی زندگی کا راز ہے۔ "ہم اپنم کی ماں" میں ماما کا جذبہ زندگی کے سنگین حقائق سے ٹکرا کر کیسے کیسے پیچ و تاب اور سوز و ساز سے آشنا کرتا ہے اس کی جڑیں مشرقی مرد کی سفاک استعماری ذہنیت میں پوشیدہ ہیں۔ یہ دراصل نسوانیت کے مشرقی تصور پر درد میں ڈوبی ہوئی طنز ہے۔ ترک خاتون اپنے نکھٹو شوہر کو خود کما کر پالنے کے باوجود اس کی ذلیل رہتی ہے اور بے محبت شادی کو برقرار رکھنے کے "اعزاز" کی خاطر اپنی محبت کو قربان کر دیتی ہے اور ماما کو ویران۔ یہ افسانہ اگر مشرقی اور مغربی عورت کے طرز فکر و عمل میں زمین و آسمان جیسے فرق کو پیش کرتا ہے تو "سوشکستیں ایک فتح" اور "ہار جیت" آفاقی نسوانی جذبوں رقابت اور انتقام کو بالترتیب مشرقی اور مغربی سیاق و سباق میں پیش کرتے ہیں۔

تاریخ سے شغف نے بھی منیر کے افسانوں کو فنی و فکری رعنائی بخشی ہے۔ یہ شغف انھیں اپنے عالم دین اور صوفی منش دادا جان سے ورثہ میں ملا ہے۔ چودہ برس کی عمر میں انہوں نے "تاریخ منیری" لکھنی شروع کر دی تھی اور یہی زمانہ اُن کی افسانہ نگاری کے آغاز کا زمانہ بھی ہے۔ ہر چند یحییٰ فضلی کے نام سے انہوں نے جو افسانہ نگاری شروع کی تھی وہ اب رفت گزشت ہو چکی ہے مگر یحییٰ فضلی ابھی تک منیر الدین احمد کے افسانوں میں زندہ اور سرگرم کار ہے۔ یہ یحییٰ فضلی کو اپنی ذات میں فعال رکھنے ہی کا کرشمہ ہے کہ "زرد ستارہ" اور "فاطمہ" میں تاریخ مرقع عبرت بھی بن پائی ہے اور کمال فن بھی۔ "زرد ستارہ" میں اگر منیر نے ماضی کی سرگزشت سے رواداری اور وسیع المشربی کا سبق لیا ہے تو "فاطمہ" میں ہمارے اپنے عہد کی جیتی جاگتی تاریخ کے آئینے میں ظلم و بربریت کی گھناؤنی صورتیں پیش کی ہیں۔

جرمنی میں فاشزم کا عروج یہودیوں پر عرصہ حیات تنگ کر دینے اور بعد ازاں انھیں ناقابل یقین سفاکی کے ساتھ مار دینے کے لئے [illegible] کا باعث بنا تھا۔ دنیا بھر کے انسان دوست ادیبوں نے دہشت گردی کے اس دور کو بطور خاص اپنا موضوع بنایا ہے تا کہ روشن خیالی کے اس عہد میں تاریک اندیشی اور ظلم گردی کا یہ تجربہ دوبارہ نہ دہرایا جاسکے۔ "زرد ستارہ" میں منیر نے اسی تجربے کے جہنم میں سلگتے ہوئے ایک کردار سے ہمارا تعارف کرایا ہے۔ بظاہر ڈاک امریکہ میں ایک بھری پری اور خوشحال زندگی بسر کر رہا ہے مگر باطن جبری جلاوطنی اور دہشتناک دربدری کا احساس اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ فاشزم کا دور جرمنی کی سرزمین سے کب کا رخصت ہو چکا مگر فاشزم نے ڈاک کی نفسیات میں جو بگاڑ پیدا کر دیا ہے وہ ہنوز لاعلاج ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہودیوں نے جرمن فاشزم سے نجات پائی ہے مگر جرمن فاشزم کی ہم عصر اطالوی فاشزم آج تک ہرزیگووینا کے مسلمانوں پر مسلط ہے۔ فاطمہ کا موضوع یہ دوسری فاشزم ہے جس نے آج مسلمانوں کو جرمنی کے یہودی بنا دکھایا ہے مگر حیف صد حیف کہ آج کا روشن خیال اور ترقی پسند فنکار مسلمانوں کو انسان سمجھنے سے کچھ انکاری سا ہے جبھی تو وہ مسلمانوں کو تختہ ستم بنائے چلے جانے والی فاشزم سے چشم پوشی کا مرتکب ہے۔ منیر کا فکری مسلک رنگ و نسل اور ملک و ملت کے امتیازات سے ماورا فکری انسانی دوستی کا مسلک ہے اس لیے وہ آج کی فاشزم کو بھی موضوع فن بنایا ہے۔

منیر کو آغاز کار ہی سے انسانی نفسیات کے مطالعے سے گہری دلچسپی ہے جرمنی وارد ہونے سے پہلے قلمبند ہونے والے افسانے "سوشکستیں ایک فتح" سے لے کر اب تک وجود میں آنے والے آخری افسانہ "سمندر کی موت" تک وہ کسی طے شدہ فارمولے یا کسی نئے پرانے ذہنی تحفظ کے بغیر انسان کے ظاہر و باطن کو سمجھنے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ زندگی اور انسان کی نفسیاتی تفہیم و تعبیر کا یہی جذبہ حکایات کے پیرائے میں لکھی گئی مختصر ترین افسانوی تحریروں میں بھی جلوہ گر ہے جو صنف ان تحریروں کو افسانوں سے منفرد اور ممتاز کرتا ہے وہ طنز کی گہری کاٹ ہے۔ ان حکایات میں وہ فرد اور معاشرہ ہر دو کی سفاک فطرت کو بے نقاب کرتے ہیں۔ یہاں نظام زندگی اور فرد کی فکر و عمل میں سنگین لاتعلقی کے مضحکہ خیز اطوار ان کی طنز کی زد میں ہیں۔

پچھلے پچیس برس کے دوران وجود میں آنے والے افسانوں کے اس مجموعہ کو پڑھتے وقت زبان و بیان کی سادگی، سلاست اور روانی و بے تکلفی کے احساس کے ساتھ ساتھ مجھے منیر کے جرمن زبان کے ساتھ رسم و سلوک کی یاد بھی بار بار آئی۔ جملوں کی ساخت سے لے کر اظہار کے انداز تک کئی ایک مقامات پر منیر کی نثر جرمن زبان سے غیر محسوس اور خلاقانہ اکتساب کرتی نظر آتی ہے مثلاً:

"جو کوئی الف کہتا ہے اُسے ب بھی کہنا پڑتا ہے۔ مجھے وہ نوجوان کچھ ایسا پسند آیا کہ اب انکار کیسے کرتا۔ دونوں کو لفٹ دینا پڑی۔ (سنگل)

اور: "مگر یہ جنتوں والی بات میرے سر میں نہیں جاتی"۔ (جہنم جہنم کا ساتھ) مجھے یقین ہے کہ منیر کی تخلیقی تازگی اردو نثر کا عزیز ثروت سرمایہ بنے گی یوں فقط جرمنی اور پاکستان کے درمیان ہی نہیں بلکہ مشرق اور مغرب کے درمیان پائیدار انسانی مفاہمت کے راستے کھل پائیں گے۔

☆

ایک باغی کی داستان

انتظار حسین (لاہور)

منیر الدین احمد کو ہم بطور افسانہ نگار جانتے ہیں، جن کے افسانوں کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی شہرت مترجم کی ہے بالخصوص جرمن ادب کے اردو تراجم کی وجہ سے۔ جرمنی میں قیام کے سبب اور بطور یونیورسٹی استاد کے ان کی جرمن ادب پر گہری نظر ہے۔ انہوں نے جرمن افسانوں اور شاعری کو اردو میں ڈھالا ہے۔ اب تک ان کی اس سلسلے میں سات کتابیں چھپ چکی ہیں۔

اب انہوں نے اپنی آپ بیتی لکھی ہے جس کو توسین، لاہور نے "ڈھلتے سائے" کی عنوان سے شائع کیا ہے۔ اس میں وہ قارئین کے سامنے ایک باغی کی صورت میں آتے ہیں، جس نے اپنی جماعت سے تعلق قطع کر لیا ہے۔ ادیبوں کو ہم ان کی ادبی ترجمات کے حوالے سے جانتے ہیں۔ ہمیں ان کی مذہبی ترجیحات کو جاننے میں کچھ ایسی دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہ چیز عام طور سے محققوں اور نقادوں پر چھوڑ دی جاتی ہے کہ وہ کسی ادیب کی زندگی یا اس کے ادب کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس کی مذہبی یا قومی بیک گراؤنڈ کا جائزہ لیں۔

مگر ادیب اپنی آپ بیتی لکھتے ہوئے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اس طرح ہم اب منیر الدین احمد کی زبانی جانتے ہیں کہ ان کا تعلق جماعت احمدیہ سے تھا۔ انہوں نے ایک موقع پر محسوس کیا کہ وہ جماعت کے اکابرین کے احکام کو، جو ان کو دیئے گئے تھے، ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ انہوں نے ان کو ماننے سے انکار کر دیا اور جماعت سے قطع تعلق کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب وہ ہمیں اپنی آپ بیتی میں ان حالات کی تفصیلات بتاتے ہیں، جن کے ساتھ ان کا اس اقلیتی جماعت میں پیدا ہونے کے سبب واسطہ پڑا تھا اور پھر ان کو اس سے بیزار ہو کر علیحدہ ہونا پڑا تھا۔ وہ یقیناً جانتے ہیں کہ اس چیز کے سبب جماعت کا ردعمل ان کے خلاف کیا ہوگا۔ البتہ انہیں یہ بھی پتا ہے کہ ان کی کہانی پاکستان میں خوب بکے گی۔ اس لئے مجموعی طور پر یہ سودا کچھ ایسا برا نہیں ہے۔

جو کچھ وہ ہمیں جماعت کے طریق کار اور طرز عمل کے بارے میں بتاتے ہیں، وہ قابل فہم ہے۔ یہ چیز ایک چھوٹے فرقے کے لئے، جو ایک متعدد ماحول میں رہ رہا ہو، قدرتی امر ہے کہ اس کے اندر غیر محفوظ ہونے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے فرقے کے جملہ افراد کی حفاظت کی ذمہ داری اپنا فرض جانتے ہوئے ان کی ہر طرح سے مدد کرتی ہے بالخصوص نوجوان افراد کی۔ اس کے بدلے میں وہ ان سے توقع رکھتی ہے کہ وہ ان کو دیئے جانے والے تمام احکام بجا لائیں گے اور جماعت کی مشنری روح کے ساتھ خدمت کریں گے۔ ایسے فرقے فردی آزادی جیسی لگژری کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لئے وہ جابرانہ اور ڈکٹیٹرانہ طریق کار اختیار کر لیتے ہیں۔ جس چیز کو منیر الدین احمد نے ناپسند کیا، وہ جماعت کے اکابرین کا جابرانہ طرز عمل تھا۔ ان کو جماعت کے عقائد سے، خواہ وہ کیسے بھی ہوں، کچھ ایسا واسطہ نہیں لگتا۔ وہ اپنی جماعت کے اس طریق کار پر تنقید کرتے ہیں جو فردی آزادی کے خلاف ہے۔ وہ اس کے خلاف بغاوت کرتے ہیں اور جماعت سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔

اپنی آپ بیتی میں منیر الدین احمد ایک اقلیتی فرقے کا ممبر ہونے کی تفصیلات بیان کرتے ہیں، جس میں وہ پیدا ہوئے تھے، مگر جس سے بیزار ہو کر انہوں نے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ اس کہانی میں، جسے وہ بیان کرتے ہیں، ان لوگوں کے لئے بہت سا مواد ہے جو اس مضمون میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ دوسروں کو شاید یہ چیز کچھ ایسی پسند نہ آئے۔ تاہم اس کتاب کے ذریعے ایک چھوٹے اقلیتی فرقے کی سائیکالوجی اور اس کے طرز عمل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو ایک متعدد اکثریت کے پہلو بہ پہلو رہ رہا ہے۔

غیر ملک میں رہائش پذیر ہونا منیر الدین احمد کو بھاتا ہے۔ اب وہ اپنی جماعت سے تعلقات توڑنے کے بعد فردی آزادی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ وہ ایک ملک سے دوسرے کی طرف سفر کرتے ہیں اور زندگی کو اپنی خواہشات کے مطابق بسر کر رہے ہیں۔ وہ ایک اسکالر بن چکے ہیں اور ان کو دنیا کے مختلف کونوں سے یونیورسٹیوں اور علمی اداروں کی طرف سے دعوت نامے ملتے ہیں، جس کے سبب ان کو مغرب اور مشرق کے ممالک میں جانے کے مواقع ملتے رہتے ہیں، جہاں پر ان کی ملاقات مختلف زبانوں اور ثقافتوں کے اسکالروں اور ادیبوں سے ہوتی ہے۔

اس کتاب کو بطور ایک طویل سفرنامے کے بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ جرمنی میں رہائش پذیر ہوتے ہوئے وہ مسلسل دنیا کے دور دراز ملکوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ انہوں نے مختلف ملکوں کی سیاحت کے دوران پیش آمدہ بعض عجیب و غریب واقعات کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔

ان کے یمن کے سفر نے بطور خاص میری توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا، کیونکہ وہاں پر انہوں نے ایک عجیب و غریب داستان کو دریافت کیا، جو کہ سبا یا زیادہ درست ہوگا اگر کہا جائے ملکہ بلقیس اور بادشاہ سلیمان کی کہانی کو ایک نیا زاویہ اور دلکشی دیتی ہے۔ وہاں پر ان کے ہاتھ ابو یحییٰ ہمدری کی ایک کتاب لگی، جس میں بیان کردہ کہانی اس طرح ہے۔ سبا کے بادشاہ الحلاء نے شکار کھیلتے ہوئے جنگل میں ایک بھیڑیے کو ایک ہرنی کے پیچھے لگے ہوئے دیکھا۔ اس نے بھیڑیے کو مار ڈالا اور ہرنی کی طرف متوجہ ہوا مگر وہ کہیں پر نظر نہ آئی تھی۔ ہرنی کی تلاش میں گھومتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو اچانک دھات سے بنے ہوئے ایک شہر کے روبرو پایا۔ وہ بے حد حیران ہوا لیکن اسی لمحے ایک مرد شہر میں سے برآمد ہوا اور اس نے اپنا تعارف بطور بادشاہ شہر کے کرایا، جو اس کے بیان کے مطابق جنوں کا شہر تھا۔ لیکن اسی وقت بادشاہ نے ایک خوبصورت لڑکی کو شہر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔

جنوں کے بادشاہ نے الحلاء کو بتایا کہ "یہ لڑکی میری بیٹی ہے۔ یہی ہرنی ہے جس کو آپ نے بھیڑیے کے پنجوں سے نجات دلائی تھی"۔ یہ لڑکی ایک پری تھی۔ الحلاء نے اس کا رشتہ مانگا اور اس کے ساتھ بیاہا گیا۔ بہت جلد اس کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی، جس کو بلقیس کا نام دیا گیا۔ یہ کہانی اس مشہور ملکہ بلقیس کی ہے جو بادشاہ سلیمان سے بیاہی گئی تھی۔

موپساں اور منٹو کا جانشین

جمیل یوسف

(مری)

اردو افسانہ نگاری میں سعادت حسن منٹو کے بعد منیر الدین احمد ایک ایسے کہانی کار ہیں جن کے بارے میں بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ہاں کہانی کا فن کمال کی حدوں کو چھو رہا ہے۔ اس فن کو جانچنے اور پرکھنے کا سب سے بڑا اور معتبر پیمانہ یہی ہے کہ کہانی میں قاری کی دلچسپی کس حد تک قائم رہتی ہے۔ موپساں اور منٹو کے فن پاروں کی طرح منیر الدین احمد کے افسانوں کا پہلا فقرہ ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر افسانے کے مطالعے میں ڈوب جاتا ہے۔ جب تک کہانی ختم نہیں ہو جاتی، قاری کو اس کی گرفت سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ افسانہ ختم کرنے کے بعد بھی اس کا تاثر قاری کو گھیرے رکھتا ہے۔ یہ خوبی صرف بڑے فن پاروں میں ہی ہوتی ہے۔

منیر الدین احمد کے افسانوں میں کفایت لفظی اور وحدت تاثر کا وہی عالم ہے جو موپساں اور منٹو کے افسانوں کا وصف خاص ہے۔ ان کے زبان کی سادگی اور روانی کا بھی وہی حال ہے۔ زبان کی چاشنی اور مکالمے کی چستی کا لطف کہیں بھی قاری کو اپنی طرف متوجہ کر کے کہانی کے بہاؤ میں خلل نہیں ڈالتا اور قاری کی دلچسپی کو تقسیم کرنے کا باعث نہیں بنتا۔ انتظار حسین، رشید امجد اور مظہر الاسلام کی طرح وہ کہیں بھی لفظوں کے طوطے مینا نہیں بناتے۔ لفظی بازی گری اور بیان کی شعبدہ بازی میں قاری کو نہیں الجھاتے۔ روز مرہ زندگی میں واقعات جس طرح پیش آتے ہیں انھیں اسی طرح بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ قاری بے تکلف کہانی کے پیچ و خم میں ان کے ہمراہ چل پڑتا ہے۔ اسے کچھ گمان نہیں گزرتا کہ وہ اسے کس سمت لیے جا رہے ہیں اور آخر میں کون سا چونکا دینے والا انکشاف اس کا منتظر ہے۔ جس طرح کہانی کے دوران قاری پر سسپنس کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ کہانی کے خاتمے کے بعد بھی حیرت کا ایک بے نام سا احساس اس کے دل و دماغ کو گھیرے رہتا ہے۔ وہ دیر تک کہانی کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس نے کوئی من گھڑت کہانی پڑھی ہے بلکہ اسے منیر الدین احمد کے ہر افسانے پر ایک سچے اور حقیقی واقعہ کا گمان ہوتا ہے۔ یہ تاثر دو عناصر سے جنم لیتا ہے ایک پلاٹ کی بُنت اور دوسرا کردار نگاری۔

اپنے افسانوں کے پلاٹ کی تشکیل و تکمیل میں منیر الدین احمد نے کمال فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی کہانیوں کے پلاٹ میں کہیں بھی کوئی جھول نہیں پڑتی۔ گویا پلاٹ ہر لحاظ سے ایک مکمل تصویر کی طرح ہے جس میں سب سے نمایاں حیثیت افسانے کے مرکزی کردار کی ہے۔ افسانہ پڑھ چکنے کے بعد قاری کے ذہن میں جو تصویر بنتی ہے اس پر غور و فکر کرنے سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے جیسے اس تصویر کا ہر جزو پوری تصویر کے تاثر کی وحدت کو بڑھا رہا ہے اور ایک دوسرے سے مکمل طور پر پیوست اور مربوط ہے۔ پلاٹ کی گرفت پڑھنے والے پر بتدریج مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ پورے پلاٹ کا احاطہ کرنے اور کہانی کے انجام تک پہنچنے کے لیے قاری کی بے تابی میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اکثر افسانوں کے پلاٹ میں مصنف خود بطور ایک کردار کے شریک ہے جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ قاری کسی شخص سے اس کی آپ بیتی سن رہا ہے جیسے کوئی شخص ایک ایسا واقعہ بیان کر رہا ہے جو خود اس کے ساتھ پیش آیا ہے یا اس کی آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوا ہے۔ اس تکنیک سے افسانے پر حقیقت کا گمان گزرنے کے امکانات بہت بڑھ جاتے ہیں۔

منیر الدین احمد کے تقریباً ہر افسانے میں قاری کی کسی نہ کسی خوبرو لڑکی سے ملاقات ضرور ہوتی ہے۔ بقول شاعر:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ۔

منیر الدین احمد کے افسانوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ صنف نازک کی ان میں گہری دلچسپی بنیادی طور پر ان کے کہانی پن کی مرہون منت ہے مگر ان میں رنگ وجودِ زن سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ مگر یہاں جنسی پہلو منٹو کے افسانوں کی طرح بازاری جنس نہیں ہے۔ ان افسانوں میں طوائف کا کردار کم ہی ملتا ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ مغربی معاشرے کی کہانیاں ہیں جہاں عورت، مرد کی طرح آزاد ہے۔ کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی خاندانی بندھن عورت کی مجبوری بن جائے۔ ہاں البتہ محبت اور چاہت کا پُر خلوص اور سچا جذبہ ہر کہانی میں کارفرما ہے اور شہوت اور ظاہرداری کے بجائے زیادہ تر محبت کے اسی خالص انسانی جذبے کا اظہار ملتا ہے۔ رشتہ داروں سے کہیں زیادہ ان کرداروں میں دوستوں سے گہرے تعلقات پائے جاتے ہیں۔ اور ان کی دلچسپی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ بہرحال بطور بہن اور ماں کے عورت کا پُر خلوص اور محبت بھرا کردار بھی افسانوں میں قاری کی توجہ کا باعث بنتا ہے۔ بعض کہانیوں میں عورت کے انتقامی جذبے کا بڑا موثر اظہار ہوتا ہے۔

جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے منیر الدین احمد کے افسانے کے چند ابتدائی فقروں سے ہی قاری مرکزی کردار سے آشنا ہونے لگتا ہے اور کردار کی

فقرا دیے اور اس کے امتیازی اوصاف اس پر منکشف ہونے لگتے ہیں۔ زمان و مکان کے حوالے سے ایک مخصوص عہد اور خاص معاشرے کا نمائندہ ہونے کے باوجود شمس الدین احمد کے تقریباً ہر افسانے کا مرکزی کردار اپنا ایک الگ تشخص رکھتا ہے۔ قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ اس کردار سے پہلی دفعہ مل رہا ہے اور پھر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ایک مختصر سے افسانے میں کردار کی شخصیت سے قاری کی واقفیت اس حد تک مکمل ہو جاتی ہے کہ وہ اس کے شعور کا حصہ بن جاتا ہے۔ افسانہ پڑھنے کے بعد کئی دفعہ قاری کے ذہن میں افسانے کا مرکزی کردار اور کئی دوسرے کردار بھی آ داخل ہوتے ہیں اور وہ غیر ارادی طور پر ان کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ انسانی شخصیت کے اسرار اس پر کھلنے لگتے ہیں۔ اس طرح قاری گویا افسانے کی فضا اور اس کے ماحول کی بازیافت میں کھو جاتا ہے۔ شخصیت کی تشکیل میں معاشرہ اور ماحول اور بالخصوص خاندانی نظم اور ماں باپ کا رویہ جو بنیادی کردار ادا کرتا ہے اس کے گہرے اور انمٹ اثرات واضح طور پر ان افسانوں کے کرداروں سے مترشح ہوتے ہیں۔

شمس الدین احمد نے اپنی افسانہ نگاری سے اردو ادب میں ایک نیا دریچہ کھولا ہے اس دریچے سے جو منظر قاریوں کے سامنے آتا ہے وہ نیا دور اُس جرمن معاشرے کا ہے جو دوسری جنگِ عظیم کے اثرات کے نتیجے کے طور پر وجود میں آتا ہے۔ اس معاشرے میں روایات اور صدیوں سے قائم رشتے دم توڑ رہے ہیں۔ خود مصنف کے الفاظ میں یہاں "روایات کو رجعت پسندی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور ان کو توڑنے پر لوگ فخر محسوس کرتے ہیں"۔ یہ عہد 1960ء کے لگ بھگ شروع ہوتا ہے جب جنگِ عظیم دوم کی تباہ کاریوں کے کھنڈرات سے نکلنے والی پہلی نسل جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے۔ اس نسل کا گھر اور خاندان سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ہر فرد درخت سے ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح ہوا کے دوش پر اُڑتا پھرتا ہے۔ اس نسل کا کوئی فرد اگر شادی کرتا ہے گھر بسانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی یہ کوشش شاذ و نادر ہی کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہے۔ خاندان اور گھر مسلسل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہے ہیں۔ ایک فرد ایک ملک میں ہے تو دوسرا کسی اور ملک میں پڑا ہے۔ بسا اوقات ایک کو دوسرے کا پتہ تک نہیں۔ ایسے ماحول میں ہر کسی کو اپنے پاؤں پر مضبوطی سے کھڑے ہونے کی ضرورت کا احساس ہے۔ زندگی کی تگ و دو میں آگے بڑھنے اور اپنے لیے جگہ بنانے میں ہر کوئی دن رات مصروف نظر آتا ہے۔ اس دور میں مصنف چونکہ خود بھی ہیمبرگ میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا اس لیے جرمن معاشرے کے اُس وقت کے طلبا و طالبات سے اس کا قریبی رابطہ اور تعلق تھا۔ وہ بھی اپنے خاندان اور معاشرے سے کٹا ہوا ایک فرد ہے جو بالکل اجنبی ماحول میں محض اپنی ذاتی جدوجہد سے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے اس لئے اس کا تجربہ ذاتی اور مشاہدہ حقیقی ہے۔ مگر محض تجربے اور مشاہدے کی بنا پر اس فنی کمال کا اظہار نہیں ہو سکتا جو ان افسانوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس فنی کمال کو شمس الدین احمد کی تخلیقی اُپج نے پیدا کیا ہے۔

قاری عشق و محبت کے والہانہ جذبات سے بھرپور کسی کہانی کی امید میں افسانہ "لافانی عشق" کے مطالعے کا آغاز کرتا ہے جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے یہ رومیو اور جولیٹ کی شہرۂ آفاق داستانِ محبت کی طرح کی کوئی کہانی ہونی چاہیے تھی مگر اس میں ہجر کے صدمات اور وصل کی آرزوؤں کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں۔ نہ چاند سے باتیں ہیں اور نہ اختر شماری۔ بلکہ کہیں محبت کا اظہار تک نہیں۔ افسانہ ایک وسیع و عریض قبرستان کی سیر و سیاحت کے ذکر سے شروع ہوتا ہے اور آخر تک اس لافانی عشق کے آثار دور دور تک کہیں نظر نہیں آتے جس کا اعلان عنوان میں کیا گیا ہے۔ افسانے کے خاتمے پر اس کا اسرار آخری فقرہ کھولتا ہے۔ اس آخری فقرے تک قاری کی دلچسپی کسی لمحے کم نہیں ہوتی۔ اگرچہ اسے اس افسانے میں عشق و محبت کی کوئی واردات نہیں ملتی مگر افسانہ پڑھنے کے بعد وہ اس عنوان کے اسرار میں گم ہو جاتا ہے اور افسانے کے سارے واقعات کو اپنے ذہن میں ایک نئی ترتیب دیتا ہے۔

ایک اور افسانہ "اعتماد شکنی" بھی بالکل آخر میں آ کر کھلتا ہے۔ یہ ایک ماں کے انتقام کی ناقابلِ فراموش کہانی ہے۔ یہ بھی ایک ایسی کہانی ہے جو قاری کو ہانٹ کرتی ہے۔

"لمدیا پاشکی" ایک اور چونکا دینے والا افسانہ ہے مگر یہاں بھی افسانے کے مرکزی کردار کا بھید بالکل آخر میں جا کر کھلتا ہے اور جو حقیقت قاری پر منکشف ہوتی ہے اس کا سان گمان بھی قاری کو نہیں ہوتا۔ یہ کہانی بتاتی ہے کہ حالات و واقعات کا جبر انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے شمس الدین احمد کے اکثر افسانے زیادہ تر اُن جرمن عورتوں کی کہانیاں ہیں جو 1960ء کے لگ بھگ جوان ہوتی ہیں ان میں سے اکثر یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ہیں ان میں بہت سی طالبات اپنے تعلیمی اخراجات جز وقتی ملازمتیں کرتے پورے کر رہی ہیں۔ خاندانی توڑ پھوڑ کی وجہ سے ان میں سے اکثر خواتین شادی سے خوفزدہ ہیں اور جس کسی نے بھی شادی کی ہے وہ ناکام ہوئی ہے۔ ان افسانوں میں دیوارِ برلن کے دونوں طرف مختلف قسم کے معاشرتی حالات کا بھی ذکر ہے جنگ سے انسانی زندگی پر جو مصیبتیں نازل ہوتی ہیں اور معصوم اور بے بس لوگ جس عذاب سے گزرتے ہیں اس کی جھلکیاں بھی جا بجا ان افسانوں میں ملتی ہیں اس صورتِ حالات سے دوچار ہونے کے باوجود ان افسانوں کے کرداروں میں سچے انسانی جذبات موجزن ہیں۔ وہ خلوص اور محبت سچائی اور دیانتداری کے پیکر ہیں۔ شر سے نفرت کرتے ہیں۔ جنگ کے خلاف ہیں اور دنیا میں امن کے خواہاں ہیں۔

☆

تہذیبی سفر کا استعارہ

امجد علی شاکر (تبصرہ)

ادیب ہو یا فنکار اس کی پہلی کمٹمنٹ صرف انسان سے ہے۔ انسان کی تجرید (Abstraction) اور انسان میں خاصا فرق ہوتا ہے۔ سیاست دان اور نظریاتی لوگ ول اللہ کرے رشتہ استوار کرتے ہیں اور قلب مومن سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ادیب کی پہلی اور آخری کمٹمنٹ صرف اور صرف انسان سے ہوتی ہے، اس کی تجرید (Abstraction) سے نہیں۔ جو لوگ تجرید (Abstraction) کے حوالے سے سوچتے ہیں وہ انسان کو کسی صفت یا سابقے کے ساتھ یاد کرتے ہیں یعنی مزدور، کسان، دانشور وغیرہ کہا تے۔ نہ کہ صرف اور صرف انسان ہونے کے ناتے۔ یہ لوگ انسان کی تجرید کے ساتھ اس حد تک رواجوں کو پسند کرتے ہیں اور ایک بلندی پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ انسان دوست مفکرین کبھی انسانوں کے رواجوں کو پسند کرتے یا انہیں دیکھے مسترد نہیں کرتے۔ شاہ ولی اللہ نے فرمایا تھا۔ "جو باتیں لوگوں کی زبان پر جاری ہوں ان کی تحقیر نہ کرو، بلکہ ان کی اصل حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرو۔"

ڈاکٹر منیر الدین احمد ادیب، شاعر اور سماجی تاریخ کے طالب علم ہیں۔ ان کے مکتوبات ان کی ادبی شخصیت کے اظہار کا ایک ایسا زاویہ ہے جو اب پہلی بار میری نظر سے گزرا ہے۔ ان کے مکتوبات زندگی سے لبریز ہیں۔ ان خطوط کا مرکز منیر الدین احمد کی ذات ہے تو ان کا دائرہ جرمن اور پاکستانی معاشرہ، انسان کا شعور و لاشعور اور مسلمان کا اجتماعی شعور و لاشعور، پاکستانی اور جرمنی کی ادبی و سماجی صورت حال اور اسلام اور مسلمانوں کا مذہبی ماضی و حال ہے۔ اتنا وسیع دائرہ کھینچتے ہوئے منیر الدین احمد کی شخصیت ٹوٹتی، بکھرتی اور پھر مجتمع ہوتی صاف دکھائی دیتی ہے۔ منیر الدین احمد کے ہاں انکشاف ذات سے تکمیل ذات کا یہ سفر ایک مرکز سے گریز اور اسی کی طرف لوٹنے کا یہ عمل بہت عجیب اور بڑا خوبصورت ہے۔

منیر الدین احمد ادیب و شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی تاریخ کے طالب علم بھی ہیں۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ ادیب و شاعر کے لئے ایک بندے کی موت ایک بہت بڑا حادثہ بن جاتی ہے مگر مؤرخ کے لئے بہت سے بندوں کی موت کالے حرفوں میں لکھا ہوا ایک فقرہ۔ اس لئے کہ اس کا تعلق بھی انسان کی تجرید سے ہوتا ہے جب کہ ادیب و شاعر کی کمٹمنٹ انسان کی تجرید سے نہیں انسان سے ہوتی ہے۔ گویا یہ دونوں سرگرمیاں بظاہر متضاد ٹھہرتی ہیں۔ منیر الدین احمد کے ہاں یہ تضاد یوں حل ہوا کہ ان کے نظریہ تاریخ میں ان کا ادبی رویہ جلوہ گر دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک خط میں لکھتا ہے۔

"میں خود تاریخ کا طالب علم ہوں اور بارہا دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اسلاف کی تاریخ لکھی جائے، جس میں ان کی روزمرہ کی باتیں ہوں۔ ان کے خیالات، مشکلات، تگ و دو کا تذکرہ ہو۔ ہمیں اب تک معلوم نہیں ملا ان کی جنسی زندگی کے بارے میں۔ ان کے جھگڑوں، ان کے پیار، ان کے آپس کے تعلقات سے متعلق ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔ اسی طرح ہمیں علم نہیں ہے کہ انہیں کن چیزوں سے خوف آتا تھا اور کیوں۔ انہیں کونسی چیزیں بھلی لگتی تھیں۔ ان کے معاش کی بنیاد کیا تھی۔ بیوی اور بچوں کے آپس میں کیسے تعلقات تھے۔"

منیر الدین احمد کی یہ دلچسپی صرف ماضی کے لوگوں کے بارے میں ہی نہیں خود اپنے بارے میں بھی ہے یعنی وہ حدیث کے اس جملے پر عامل نظر آتے ہیں۔ "و لنفسک حق"۔ منیر الدین احمد پاکستانی مسلمان ہے۔ اس کی بیوی مغرب زادہ۔ اس کا شعور اس کی رفاقت قبول کر چکا ہے مگر اس کا لاشعور کچھ اور کمال دکھا رہا ہے۔ وہ پاکستان سے واپس پر جرمنی لوٹتا ہے تو اس کا وطن سے تجریدی تعلق اس کے لاشعور کو بیدار اور متحرک کر کے یہ کمال دکھاتا ہے۔

"...میں ابھی تک اپنے خیالات میں پاکستان میں ہوں۔ رات کو سوتا ہوں، تو اکثر یہی لگتا ہے جیسے میں پاکستان میں گھوم رہا ہوں۔ خوابوں میں بھی وہی سماں چھایا ہوتا ہے۔ بلکہ پہلو میں سوئی ہوئی بیوی بھی اجنبی لگنے لگتی ہے۔ صبح آنکھ کھلتی ہے تو ندامت ہوتی ہے اور سوچتا ہوں کہ وہ مجھے اس حالت میں پکڑ نہ لے کہ میں اس کو غیر سمجھ رہا ہوں۔"

منیر الدین احمد عورت کے معاملے میں خاصی کڑی نظر رکھتے ہیں۔ وہ ہر جگہ کسی حسینہ کی محبت سے فیض اٹھانے کے متمنی نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ مختلف تجربات سے گزرتے ہیں۔ کبھی وہ کسی "پری" سے باقاعدہ ملاقات کرنے کا ارادہ کر رہے ہوتے ہیں اور وہ اسے بے اعتنائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نکل دیتی ہے۔ کبھی وہ ملتفت ہوتے ہیں اور "پری" ان سے بھاگ جاتی ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اس غزال کو سایوں سے وحشت ہے۔ منیر الدین احمد آنکھ کی کھڑکی ہمیشہ کھلی رکھتے ہیں۔ اس لئے بہت سے چہروں کو ہم اس کھڑکی سے دیکھ سکتے ہیں۔ مصورہ "ونے"، تاشقند کی مسلم پری وہ ادھر ادھر سے آنے والی بے شمار پریاں۔ لیکن وہ کسی ایک کے دل کا دروازہ نہیں کھولتے۔ اس لئے ان کا عشق نظر بے دو خوش

گزرے سے آگے نہیں بڑھتا۔ وہ مصورہ کے سامنے سرنڈر تو کرتے ہیں مگر شاید وہ سرنڈر مکمل نہیں۔ اس لئے وہ مصورہ طرح دے کر نکل جاتی ہے۔

منیر الدین احمد شک کی تہذیب کے آدمی ہیں۔ یہ تہذیب دماغ کے دریچے کھول سکتی ہے دل کے دروا نہیں کر سکتی۔ منیر الدین احمد کے خطوں میں کئی حسین چہرے آتے اور چلے جاتے ہیں۔ بہت سے چہرے بے نام ہیں۔ کچھ ایسی صورت حال ہے جیسی ریڈیو کا سسٹم درست نہ ہو پائے تو مختلف سٹیشنوں سے فریکوئنسی سیٹ نہیں ہو پاتی۔ منیر الدین احمد کی کسی حسینہ سے فریکوئنسی سیٹ نہیں ہو پاتی۔ اس لئے وہ اس کے سحر سے جلدی نکل جاتے ہیں۔ منیر الدین احمد وفا کے حسن سے سحر زدہ ہوتے ہیں۔ اسے share کرتے ہیں۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، جو جدید زندگی کے مخصوص رویے ہیں، وہ اس کے سامنے سرنڈر نہیں کرتے۔ اسے یہ نہیں کہہ سکتے۔ میں ناہیں سب توں۔

وفا نظمی ایک اور طرح کی لڑکی۔ وفا اور منیر الدین احمد میں فرق یہ ہے

"آج کی محبت میں "غوث وقطب" کے بعض پہلوؤں پر لکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کتاب کو دوبار بالاستیعاب پڑھا ہے مگر مجھے بعض مقامات کو سمجھنے میں دقت پیش آئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میری تصوف سے ناواقفی اس کا سبب ہے۔ تاہم آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ وفا نے مجھے کہا ہے کہ اس میں تمہاری (یعنی میری) سمجھ کا قصور ہے۔"

وفا سمجھتی نہیں مگر مانتی ہے۔ منیر الدین احمد نہ سمجھتا ہے نہ مانتا ہے وہ انکار کرتا ہے۔ وہ مادی اصولوں کی روشنی میں سچے ارض کا مسئلہ حل کرنا چاہتا ہے اور نہیں پاتا۔ اس لئے وہ انکار کرتا ہے اور کہتا ہے

"سچے ارض میری نظر میں محض قصہ کہانی ہے۔ نہ تو کوئی شخص اسے ثابت کر سکتا ہے نہ ہی انسانی زندگی میں اس کی گنجائش نظر آتی ہے۔ قدرت کے قوانین کو بھلا آپ کیسے توڑیں گے۔"

منیر الدین احمد سرسید کے نظریہ فطرت سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکے، وفا نے بڑھ چکی ہے کیونکہ وہ مان چکی ہے۔ اس کا دماغ توجیہہ نہ کر سکے تشریح نہ کر سکے مگر وہ مان چکی ہے۔ اب بھلا منیر الدین احمد کی اس سے فریکوئنسی کیسے سیٹ ہو۔ ایسا نہ ہو تو بات کیسے بنے گی۔ منیر الدین احمد بے چارہ مغرب میں بیٹھا جدید تہذیب کا پروردہ ہے وہ تجارتی معاشرے کی شے پسندی کے کلچر سے کیسے بھاگ سکتا ہے۔ وہ بے شمار لڑکیوں کو اشیاء کی طرح پسند کرتا ہے۔ ان میں سے کسی سے رفاقت نہیں کر سکتا۔ مکمل رفاقت تو وہ اپنی مغربی بیوی سے بھی نہیں کر سکا۔ اس کا شعور کچھ اور کہتا ہے۔

منیر الدین احمد کے خطوط اس کی آپ بیتی اور جگ بیتی ہیں۔ اسے خود بھی اس کا احساس ہے۔ اسی لئے جب سید سعید احمد ہمدانی نے آپ بیتی لکھنے کو کہتے ہیں تو وہ اس کے متبادل یہ تجویز پیش کرتا ہے:

"آپ کی تجویز سے متبادل مجھے ایک تجویز سوجھی ہے۔ وہ یہ کہ ہم اپنی خط و کتابت کو کتابی صورت میں چھاپ دیں۔ اس طرح آپ کی اور میری مشترکہ آپ بیتی بن جائے گی۔"

ان خطوط کی شکل میں مذکورہ تجویز کے آدھے حصے پر عمل ہوا ہے یعنی منیر الدین احمد کے خطوط جمع ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ صرف منیر الدین احمد کی آپ بیتی ہے۔ (یہ مضمون "نقوش" میں چھپنے والے خطوط کی بنا پر لکھا گیا تھا۔ آگے چل کر دونوں طرف کے خطوط کتابی صورت میں چھپ گئے تھے۔ ملاحظہ کریں۔ "حدیث یاراں۔ مکتوبات" منیر الدین احمد۔ سید احمد سعید ہمدانی۔ دہلی ۱۹۹۹ء) مگر یہ آپ بیتی محدود معنوں میں نہیں ہے۔ بلکہ بہت وسیع افق پر محیط ہے۔ اس میں دو کردار اہم ہیں۔ منیر الدین احمد کے دادا مولوی محمد فضل خان چنگوی اور منیر خود۔ دیکھیں تو یہ دو آدمی نہیں ہیں۔ ایک تہذیب کے سفر کے دو نمائندے ہیں۔ دادا مرحوم ماضی کی علامت ہے منیر جدید دور کی علامت ہے۔ دادا یقین کے دور کا آدمی ہے۔ وہ اپنے الہام پر ایمان رکھتا ہے۔ وہ کئی جلدوں میں اپنے الہامات کی باتیں مرتب کرتا ہے۔ وہ یہ جرأت رکھتا ہے کہ جماعت احمدیہ میں شامل ہو جائے۔ وہ یہ بھی ہمت رکھتا ہے کہ اسے چھوڑ دے۔ یہ جرأت یقین کے معاملے میں ممکن ہے۔

مولوی محمد فضل خان اس روایت سے منسلک ہیں جس میں کشف اور الہام ذرائع معرفت ہیں۔ جہاں فرد اپنی ذات کی فریکوئنسی کو کسی غیب سے سیٹ کرتا تھا اور پھر پوری یکسوئی سے اپنے دل کے اندر سے غیب سے آنے والی خبروں کو سنتا تھا اور تصویروں کو دیکھ سکتا تھا۔ امام ولی اللہ دہلوی نے "فیوض الحرمین" کی بنیاد ایسے ہی روحانی تجربوں پر رکھی ہے جنہیں کشف و الہام کہا جاتا ہے۔ ابن عربی سے امام ولی اللہ دہلوی تک یہ بات ایک توانا روایت کی حیثیت میں نظر آتی ہے۔ محمد فضل خان چنگوی اسی روایت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ روایت تہذیب کے نئے سفر نے ناقابل فہم بنا دی ہے۔ اسی لئے منیر الدین احمد سوچتا ہے۔

"ان کتابوں کی ازسرنو اشاعت اور ان کی سوانح عمری کی تصنیف کو میں نے اپنا مشن بنا لیا ہے۔ خدا تعالیٰ نے توفیق دی تو اس قدر خدمت میں کر جاؤں گا۔ البتہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کتاب اردو میں لکھوں یا انگریزی میں۔ اردو میں ہوئی تو شاید پاکستان میں بوجوہ شائع نہ ہو سکے گی۔۔۔۔ انگریزی میں شاید مستشرقین کے کام آجائے اور وہ لوگ دادا جان کی کتابوں کی طرف متوجہ ہوں۔"

منیر الدین احمد اور اس کے دادا (ماضی قریب) کے درمیان فاصلہ بے نام ہے مگر بہت خوفناک ہے۔ اس درمیانی فاصلے میں اس کا والد ہے۔ وہ خطوط

میں گم نام اور بے نام ہوجاتا ہے۔ وہ صرف ایک خوفناک تجربے کا عینی شاہد ہے۔ یہ تجربہ فرقہ وارانہ فسادات کا ہے جو ۱۹۴۷ء میں برپا ہوئے۔ ان فسادات نے اسلام کو ایک نئی شکل وصورت عطا کردی۔ وہ اسلام جو کبھی مرحوم ماضی میں روحانی تجربہ تھا، ۱۹۴۷ء کے بعد فرقہ وارانہ مذہب یا ایک سیاسی فلسفے میں بدل گیا۔ منیر کے والد کا کردار صرف اتنا نظر آتا ہے۔

"میرے والد صاحب (منیر کے والد) اپنے دفتر میں تھے۔ ان کا راستہ ہندوؤں کے علاقے سے گزرتا تھا۔ انہوں نے گھر آکر بتایا کہ کس طرح ہندو علاقے میں سے وہ دوسرے مسلمانوں سمیت اپنی سائیکل پر حفاظت سے نکل گئے تھے مگر مسلمان علاقے میں ان کی آنکھوں کے سامنے ایک سکھ پر حملہ ہوا۔ اس کو بے تحاشا پیٹا گیا۔ جب شریف لوگوں کی مداخلت پر حملہ رکا، تو وہ سکھ پانی کے نلکے تک گھسٹ گھسٹ کے پہنچا مگر اس میں اتنی تاب نہ تھی کہ پانی کا نلکا کھول سکتا۔ میرے والد صاحب نے آگے جاکر پانی کا نل کھولا اور اپنے ہاتھوں میں پانی ڈال کر پلایا۔ پھر اسے سہارا دیا اور اس کی سائیکل کو اٹھایا اور قریب کے ایک سکھوں کے مکان تک پہنچایا۔"

ایک شریف آدمی صرف یہی کرسکتا تھا۔ اس کے بعد یہ شریف آدمی ہمارے معاشرے سے چلا گیا۔ پھر تو جائز و ناجائز نسخوں اور مال بنانے والے آگئے۔ منیر اس صورت حال میں ہجرت کرجاتا ہے۔ اب وہ ایک معلق صورت حال میں ہے۔ وہ نہ تو جائز و ناجائز نسخوں کے چکر میں پڑسکتا ہے نہ محمد فضل خان چنگوی بن سکتا ہے نہ مکمل مغربی بن پاتا ہے۔ اس کا مرحوم ماضی اس کے باطن میں ابھی زندہ ہے۔ وہ مغرب سے الگ نہیں۔ گویا ہر لحاظ سے مشرقی انسان کا نمائندہ ہے۔ جس کے آس پاس صرف اور صرف سوالات بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ ان سوالات کے جواب کے سلسلے میں مختلف روایتوں سے رجوع کرتا ہے۔ وہ آرٹ کے سلسلے میں اور خصوصاً عریانی کے سلسلے میں "احیاء العلوم" کے بعد یورپی رویوں کو مانتا نظر آتا ہے۔ منٹو سے کہتا ہے۔

"عریاں عورت سے زیادہ خوبصورت چیز قدرت نے بھلا کوئی پیدا کی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ عریانی کا تصور ہمارے ذہنوں میں غلط ہے۔ جسم کا ننگا ہونا عریانی نہیں بلکہ نعمت ہے آرٹ ہے سرور ہے فخر ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر آدمی یہ کیفیت پیدا کرسکتا ہے مگر جو لوگ یہ کیفیت پیدا کرسکتے ہیں، وہ اگر ایسا نہیں کرتے تو کفرانِ نعمت کے مرتکب ہوتے ہیں۔"

یکو نے تتاں کی ہوس رکھنے والا منیر کعبے کی ہوس بھی رکھتا ہے۔ اسے اسلام اور مسلمانوں سے دلچسپی ہے۔ مگر اس کا رویہ یورپی تہذیب کے روبرو ہونے کا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسلام کو عالمی تہذیب کا سوٹ پہنایا جائے۔ گویا اس کا رویہ ان لوگوں سے متضاد ہے جو آج کے مسلمانوں کو عبا و قبا اور عمامہ و دستار پہنا کر دنیا کی امامت کا منصب دینا چاہتے ہیں۔ شاید ان کے خیال میں دو رکعت کی روایتی امامت اور عالمی امامت ایک ہی چیز ہے۔ بہر حال منیر کے اندر اسلام کی دبی دبی آگ موجود ہے اسی لئے تو....

"....مجھ (منیر) جیسے آدمی کو، جو اب نمازیں بھی نہیں پڑھتا، مکہ کے حرم شریف میں، پھر بیت المقدس کی مسجد الاقصیٰ میں اور اب قرطبہ کی مسجد میں نمازیں پڑھنے کی توفیق ملی۔ قرطبہ میں اس کی اجازت نہیں ہے مگر میں نے ایک کونے میں نفل پڑھ لئے تھے۔"

منیر کا مسلمان وجود اسے مغرب کی نفی پر اکساتا نہیں ہے۔ وہ مغربی لوگوں کے بارے میں تعصبات کا شکار نہیں۔ اس کے سامنے معاشرے کی جنسی طور پر منحرف (Pervert) اقلیت نہیں ہے۔ مغربی معاشرے کا مجموعی رویہ ہے۔ وہ مغربی عورت کی محبت سے لطف اٹھاتا ہے مگر کوئی بھی مغربی عورت پہلی ہی نظر میں اس پر ہزار جان سے فریفتہ نہیں ہوتی۔ ہم سفر نامہ نگاروں کی مذکورہ دو اقسام دیکھنے کے عادی ہیں۔ منیر کے ہاں یہ دونوں اقسام نایاب ہیں۔ ان کے برعکس اس کے نزدیک مغربی عورت کچھ یوں ہے۔

"یورپی عورتیں نہ صرف ہمارے ہاں کی عورتوں سے بڑھ کر آزاد ہیں بلکہ ذہنی طور پر ہمارے ہاں کے اکثر مردوں سے زیادہ بالغ ہیں۔ دینی صفائی کی بات تو درکنار ہے کہ یہ لوگ ہمارے مولویوں سے بڑھ کر جسمانی صفائی کا خیال رکھتے ہیں۔"

منیر الدین احمد کا یہ جدید رویہ سوڈان کے "اخوان الجمہوریون" میں اس کی دلچسپی کا سبب بنتا ہے۔ وہ اس کے بانی اور قائد محمود محمد طہٰ سے ملاقات کرتے ہیں۔ اس کے خیالات اور رویوں سے بھرپور دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے خیالات کی تائید کرتے اور اسے بھرپور خراج تحسین پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ پھر اس کا تقابل ہٹلر اور مسولینی سے کرتے ہیں اور محمود محمد طہٰ کے خیالات کی تصدیق و تصویب کرتے ہیں۔ جبکہ ان کے بارے میں نقطۂ نظر یہ ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ وہ (محمود محمد طہٰ) شخص مسلمانوں میں رجعت پسندی کے خلاف تھا اور ان مسائل کو حل کرنے کی طرف توجہ دیتا تھا، جن کی اہمیت مولوی حضرات کے سامنے اب تک واضح نہیں ہوئی۔"

منیر کے دو بنیادی مسائل ہیں۔ اسلام اور عورت۔ اسلام منیر کے ہاں صرف عقیدت نہیں ہے۔ نہ اسلام نے تعصب کا روپ دھارا ہے۔ یہ منیر کا مسئلہ ہے۔ وہ اسلام کو زندہ حقیقت کے طور پر دیکھنا چاہتا ہے اس لئے وہ اسلام کو تاریخ اور جغرافیے میں دیکھتا، اس پر بحث کرتا ہے۔ سوال اٹھاتا اور ان کے جواب ڈھونڈتا نظر آتا ہے۔ وہ اسلام کو تعصب نہیں بناتا کہ خود ہی اپنے عقیدے کی برتری سوچ لے اور خوش ہوجائے۔ وہ دوسرے مذہبی گروہوں اور ملتوں کے روبرو ہونا ہے تو چاہتا ہے کہ بحیثیت مسلمان اس کا تقابل قد نظر آئے۔ اس لئے اسے کئی سوالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے سوالات دوسرے مذاہب

سے مختلف ہیں۔ منیر اسلام پر اپنے مضمون کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے

"اسلام کا مسئلہ دوسرا ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں بتایا کہ اسلام نے کسی طریق سے بھی سائنسی یا تکنیکی ترقی کی راہ نہیں روکی۔ اور مسلمانوں کے معاشرے کے ابتدائی چار سو برسوں میں بہت پیش رفت ہوئی۔ مگر کس چیز نے اس ترقی کے راستے مسدود کر دیے ہیں؟ اس بارے میں محض قیاس آرائیاں کی جا سکتی ہیں۔"

اسلام منیر کا مسئلہ ہے۔ وہ اسے تاریخ میں دیکھتا ہے تو سپین اس کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اتفاق ہے کہ اسے بار بار سپین جانا پڑتا ہے۔ وہ وہاں پر مسلمانوں کے آثار تلاش کرتا ہے۔ سپین میں مسلمانوں کی تاریخ کو پڑھنے کا آرزومند ہے۔ دونوں صورتوں میں ناکامی اس کے شوق کو مہمیز لگاتی ہے۔ وہ وہاں کے "چرچوں" میں مسجدوں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوتا ہے تو اپنی یہ دریافت بڑے شوق سے بیان کرتا ہے۔

"ایک شہر میں جامع مسجد کا مینار کھڑا ہے جب کہ اس پر ایک اور منزل بنا کر گھنٹیاں لگائی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ مسجد کی جگہ پر اب چرچ کھڑا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جہاں جہاں بھی مسجدوں کو چرچوں میں بدلا گیا، ان کا رخ قبلے کی طرف ہے۔"

یہی مسئلہ منیر کو پرتگال میں بھی درپیش ہے۔ وہ وہاں بھی عربوں کے آثار تلاش کرتا نظر آ رہا ہے۔ جب ایک آدھ نظر آتا ہے تو بڑے شوق سے اس کا تذکرہ کرتا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے آثار تو منیر کے لئے زندہ موجود ہیں۔ انہیں دیکھ کر اس کا دل دھڑکتا ہے۔ وہ ان میں گویا اپنے وجود کو دریافت کر لیتا ہے۔ ان آثار میں منیر کو خود اپنا وجود ثابت ہوتا، بکھرتا، مٹتا یا زندہ سلامت رہتا نظر آتا ہے۔ پرتگال کے بارے میں منیر لکھتا ہے

"بات ہو رہی تھی پرتگال کے سفر کی۔ عربوں کے آثار بہت کم ملتے ہیں۔ چند ایک جگہوں پر قلعوں کی فصیلیں کھڑی ہیں۔ اکثر عمارتیں ۱۷۵۵ء میں آنے والے ایک عظیم بھونچال کی نذر ہو گئی تھیں۔ پرتگالی زبان میں کچھ الفاظ عربی کے موجود ہیں اور بہت سے شہروں کے نام اب بھی عربی ہیں۔ مثلاً اَلقَنطرِیَہ اَلمَنزِل وغیرہ۔ ۱۹۶۵ء میں ہم نے ایک گاؤں میں مسجد دریافت کی تھی۔ چھت پر اور دیواروں پر عربی رسم الخط میں عبارتیں تھیں۔"

منیر کا مسئلہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ خود اپنا وطن پاکستان ہے۔ اس کی وجہ اس کی مہاجرت ہے۔ اسی لئے وہ Gipsis پر کام کرتا ہے۔

منیر کا دوسرا مسئلہ عورت ہے۔ وہ تخلیق کار ہے۔ اس کا جذبہ تخلیق عورت کو دیکھ کر بیدار ہو جاتا ہے۔ وہ ہر جگہ کی عورت کے حسن میں پناہ تلاش کرتا ہے۔ وہ اسے دیکھتا ہے، خوش ہوتا اور اس میں دلچسپی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ ہر خطے کو عورت کے حوالے سے پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ تہذیبی مطالعے کا یہ طریق کار کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔ عورت تو علامت ہے تخلیقی عمل کی، اقدار کی بلکہ خود زندگی کی۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو منیر بہت زندہ شخص ہے۔ کسی خطے یا شہر کا تعارف ہمیشہ عورت کے ذریعے ہوتا ہے۔ جب تک کسی شہر کی کسی عورت سے تعارف نہ ہو تو وہ شہر اجنبی رہتا ہے۔ منیر چاہتا ہے کہ کوئی شہر اس کے لئے اجنبی نہ رہے۔ اس لئے وہ وہاں کی عورت کے مطالعے میں مصروف ہو جاتا ہے اور اس شہر سے متعارف ہوتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو شہروں سے تعلق ڈھونڈ لیتا ہے۔

منیر کے خطوط ایسا دریچہ ہیں جن سے ہم نہ صرف مغربی تہذیب کے مظاہر تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں بلکہ وہاں کے زندہ انسانوں سے آشنا ہوتے ہیں۔ منیر کے ہاں مغرب کی کوئی تجرید نہیں ہے، جس سے ہم اکثر دوچار ہوتے ہیں۔ اس کے ہاں مغرب ایک حقیقت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ مثلاً مرحوم اشتراکی روس کو ہم جنت یا جہنم کے طور پر اکثر جانتے رہے ہیں۔ منیر کے ہاں زندہ اشتراکی روس کی تصویر دکھائی ہے۔

"روس نے حیرت انگیز طور پر معاشرے میں تبدیلی پیدا کی ہے۔ یہاں کا معیارِ زندگی اتنا بلند نہیں، جتنا یورپ کے دوسرے ملکوں میں ہے۔ مگر ایک بات پکی ہے کہ لوگوں میں ہمارے ہاں جیسی غربت اور لاعلمی نہیں پائی جاتی۔ ہم نے یہاں پر بھوکے ننگے نہیں دیکھے۔ کھانے کو سب کو ملتا ہے۔ رہنے کو ہر کسی کے پاس مکان ہے۔ دوکانوں میں مال کی وہ ریل پیل نہیں جس کے ہم عادی ہیں۔ مگر لوگوں کو کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ ثقافتی طور پر دیکھا جائے تو ان کا معیار خاصا بلند ہے۔"

منیر نے یورپ کو زندہ حقیقت کے طور پر دیکھا ہے۔ یورپ میں سائنس نے جو معروضی objective انداز رائج کیا ہے اور اس سے جو غیر شخصی رویے پیدا ہوئے ہیں، منیر ان کی حقیقت تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے

"یہاں پر علمی سطح پر لکھنے والوں کی تحریروں میں حتی الامکان سعی کی جاتی ہے کہ کوئی بات ذاتی سطح پر نہ کہی جائے۔ یہاں تک کہ لکھنے والا کبھی اپنی تحریر میں نمایاں نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ خطوط میں کوشش کی جاتی ہے کہ میں اور ہم کے الفاظ سرے سے استعمال نہ کئے جائیں۔ اور اگر ناگزیر ہوں تو فقرے کی ابتداء میں نہ آنے پائیں۔ جرمن زبان میں مخاطب کو بڑے حروف میں لکھتے ہیں جب کہ اپنے بارے میں ہمیشہ چھوٹے حروف استعمال کرتے ہیں۔ بحث مباحثے میں بیچ بیچ کبھی ہوتا ہے کہ اپنے ذاتی تجربے کا ذکر کیا جائے۔"

منیر کے خطوط میں اس قدر وسیع دنیا سانس لے رہی ہے۔ منیر، اس کا ماضی قدیم، ماضی قریب، حال، یورپ، اسلام، مسلمان اور ہر خطے کی عورت۔ یہی منیر کی آپ بیتی ہے۔ شاید یہی جگ بیتی بھی ہے اور یہی ان خطوط کا امتیاز اور اعزاز ہے۔

زخمی سقراط

برتھولٹ بریخت (Bertolt Brecht)

جرمن سے ترجمہ: منیر الدین احمد

دانش کا بیٹا سقراط اپنی گفتگو کے ذریعے، جو نفاست اور لطافت کی حامل اور غیر معمولی طور مزاح سے بھرپور ہوتی تھی، اپنے علمی شوق رکھنے والے دوستوں کو محظوظ کیا کرتا تھا۔ وہ انہیں اپنے خود ساختہ لغات بتاتا تھا اور دوسرے استادوں کی طرح نہ تھا، جو کچھ فیس ہوتی چیز ہیں، کیا اہرام کی پیدائش والی باتیں بتایا کرتے تھے۔ اسے نہ صرف عقلمند ترین یونانی گردانا گیا ہے بلکہ اس کا شمار بہادر ترین لوگوں میں ہوتا تھا۔ اس کی بہادری کی شہرت ہمیں بجا نظر آتی ہے جب ہم افلاطون کا بیان پڑھتے ہیں کہ اس نے کس قدر لاپروائی کے ساتھ اور خوف و خطر کو بالائے طاق رکھتے ہوئے زہر کا پیالہ خالی کر ڈالا تھا، جسے حاکمانِ وقت نے اسکے ہم شہریوں کی خدمات کے عوض بالآخر اسے پیش کیا تھا۔ اس کے چند ایک مداحوں نے اس بات کو قابل ذکر گردانتے ہوئے ہمیں اس کی میدان جنگ میں بہادری کا قصہ بھی روایت کیا ہے۔

یہ بات مسلّم ہے کہ اس نے ڈلیون کی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ وہ ہلکے اسلحہ بردار سپاہیوں کے جتھے میں شامل تھا، کیونکہ نہ تو اسے اپنے رتبے کے اعتبار سے (وہ موچی تھا) اور نہ ہی اپنی آمدن کے باعث (وہ فلسفی تھا) معزز اور زیادہ مہنگے جتھوں میں شامل کیا گیا تھا۔ اس لئے واضح ہے کہ اس کی بہادری اپنے اندر ایک انوکھا رنگ رکھتی تھی۔

جنگ کی صبح سقراط اپنے آپ کو حتی الامکان اس وحشیانہ کام کے لئے تیار کرنے کی غرض سے پیاز چباتا رہا، جس کے کھانے سے سپاہیوں کے بیان کے مطابق انسان کے اندر جرأت پیدا ہو جاتی ہے۔ بے شمار باتوں کے بارے میں اس کی شک و شبہ کی عادت نے اس کے اندر دوسری باتوں کے متعلق توہم پیدا کر دیا تھا۔ وہ بنیادی طور پر قیاس آرائی کے خلاف تھا۔ البتہ تجربے کو مانتا تھا۔ اس وجہ سے وہ دیوتاؤں پر تو ایمان نہیں رکھتا تھا، مگر پیاز کی تاثیر کا قائل تھا۔

بدقسمتی سے اسے اپنے اندر اس تاثیر کا پیدا ہونا محسوس نہیں ہوتا تھا، کم از کم فوری طور پر نہیں۔ اور اس طرح وہ چپ چاپ تلواروں سے لڑنے والے جتھے میں، جو بطخوں کی چال میں حرکت کرتا ہوا کسی کھیت کی طرف رواں دواں تھا، جہاں پہنچ کر اسے پوزیشن لینی تھی۔ اس سے پیچھے اور آگے ایتھنز کی نواحی بستیوں کے نوجوان چل رہے تھے، جنہوں نے اسے بتایا کہ ایتھنز کے اسلحہ خانوں کی ڈھالیں ان جیسے موٹے آدمیوں کے لئے چوڑائی میں کافی نہیں۔ اسے بھی یہی بات سوجھی تھی۔ مگر اس نے چوڑے چکلے لوگوں کے بارے میں سوچا تھا، جو ان مذاق کی حد تک چھوٹی ڈھالوں سے اپنے آپ کو نصف بھی نہ ڈھک پاتے تھے۔

اس کو یہ گفتگو اپنے سے آگے اور پیچھے والوں کے ساتھ اسلحہ تیار کرنے والوں کے منافع کے بارے میں، جو اتنی چھوٹی ڈھالیں بنا کر کماتے تھے، ڈیرہ ڈالنے کا حکم ملتے ہی روکنی پڑی۔ سب لوگ اس کھیت میں بیٹھ گئے۔ سقراط کو ایک کیپٹن کا نائب نے جھڑک دیا، کیونکہ وہ اپنی ڈھال پر بیٹھنا چاہتا تھا۔ مگر اس جھڑکی سے زیادہ جس بات نے اسے سراسیمہ کیا وہ دبی ہوئی آواز تھی، جس میں اس کو جھڑکا گیا تھا۔ دشمن کا نزدیک ہونا تصور کیا جا رہا تھا۔ صبح کی دودھی دھند کے باعث کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ مگر قدموں کی چاپ اور ہتھیاروں کی جھنکار سے اندازہ ہوتا تھا کہ وادی انسانوں سے بھری ہوئی تھی۔

سقراط کو ایک گفتگو یاد آئی، جو اس نے ایک شام قبل ایک معزز نوجوان کے ساتھ کی تھی، جس سے اس کی ایک بار قبل ازیں تھیٹر کے اسٹیج کے پیچھے ملاقات ہوئی تھی اور جو گھڑ سواروں میں افسر تھا۔

"ایک زبردست سکیم" اس شیخی باز نوجوان نے کہا تھا۔ "پیادہ فوج مقابلے میں ڈٹی ہے اور دشمن کے ریلے کو روکتی ہے۔ اس عرصے میں گھڑ سوار دستہ وادی کے نچلے حصے کا رخ کرتا ہے اور دشمن کی پشت پر نمودار ہوتا ہے۔"

وادی کا نچلا حصہ دائیں ہاتھ پر دور کہیں دھند میں ہوگا۔ تو اس وقت گھڑ سوار دستے وہاں پر جا رہے ہیں۔

سقراط کو یہ سکیم بھلی لگی تھی یا کم از کم بری نہیں لگی تھی۔ سکیمیں تو بیٹھ بنائی جاتی تھیں، خصوصاً جب انسان دشمن کے بالمقابل طاقت کے اعتبار سے کمزور ہوتا تھا۔ فی الواقعہ بس لڑتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں ایک دوسرے پر لاٹھی چلاتے تھے۔ اور آگے وہاں نہیں بڑھتے تھے، جہاں پر سکیم میں مدنظر ہوتا تھا، بلکہ وہاں پر، جہاں دشمن اس کا موقع دیتا تھا۔

اب صبح کی دھندلی روشنی میں سقراط کو یہ سکیم بالکل ناکارہ لگی۔ کیا مطلب ہوا اس بات کا کہ پیادہ فوج دشمن کے ریلے کا مقابلہ کرتی ہے؟ عام طور سے لوگ اس بات پر مطمئن ہوتے تھے اگر وہ دشمن کے ریلے کے سامنے سے ہٹ جائیں۔ اور اب کیا ساری کارگری ریلے کو روکنے میں دھری تھی۔ یہ بہت بری بات تھی کہ سپہ سالار خود گھڑ سوار تھا۔

اس قدر پیاز بازار میں موجود نہیں تھے، جتنوں کی ایک عام آدمی کو ضرورت تھی۔

اور کس قدر غیر فطری بات تھی یوں صبح سویرے بستر پر پڑے ہونے کی بجائے یہاں ایک کھیت کے بیچوں بیچ ننگی زمین پر بیٹھنا۔ کم و بیش دس پونڈ لوہا بدن پر کسے اور ایک تلوار ہاتھ میں اٹھائے ہوئے۔ یہ بات اپنی جگہ پر کہ انسان شہر کا دفاع کرے اگر اس پر حملہ کیا جائے، کیونکہ اس کے بغیر انسان کو وہاں پر بہت سی مشکلات کا سامنا کرنے کا خطرہ تھا۔ مگر آخر شہر پر کس وجہ سے حملہ کیا گیا

تھا؟ کیونکہ بتائے کوچک کی کشتیوں کے بیڑوں کے مالک اور انگوروں کے باغوں والے اور غلاموں کے تاجر، مریخی کشتیوں اور انگوروں کے باغات والوں اور غلاموں کے تاجروں کے کاروبار میں دخل انداز ہوئے تھے۔ خوب وجہ تھی جنگ کی۔

اچانک یہ سب لوگ جیسے سکتے میں پڑ گئے۔ دائیں طرف دھند کے اندر ایک دھیما سا غلغلہ سنائی دیا، جس کے ساتھ دھات کے کھنکنے کی آوازیں تھیں۔ یہ شور خاصی تیزی سے آگے بڑھتا گیا۔ دشمن کا حملہ شروع ہو چکا تھا۔

دستہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دھند میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ دس قدم کے فاصلے پر دستے کے پہلو میں ایک شخص گھٹنوں کے بل گرا اور دیوتاؤں کو دہائی دینے لگا۔ سترلاو کو یوں لگا جیسے دہائی دینے کا وقت گزر چکا تھا۔ یکدم جیسے جواباً دائیں طرف ایک دلدوز واویلا شروع ہو گیا۔ یوں لگتا تھا، جیسے مدد کی پکار موت کی چیخوں میں تبدیل ہو چکی تھی۔ سترلاو نے دھند میں لوہے کے ایک ٹکڑے کو آتے ہوئے دیکھا، ایک نیزہ۔

اور پھر دھند میں سے کئی غیر واضح بھاری بھرکم جسم ابھرنے لگے۔ دشمن

-

سترلاو نے، جسے پوری طرح احساس تھا کہ اس نے غالباً ضرورت سے زیادہ لمبے عرصے تک انتظار کیا تھا، اپنا رخ قدرے وقت کے ساتھ پھیرا اور بھاگنے لگا۔ سینے پر بندھی ہوئی زرہ اور ٹانگوں کی حفاظتی تختیاں بھاگنے میں خاصی رکاوٹ بن رہی تھیں۔ وہ ڈھال سے کہیں زیادہ ضرر رساں تھیں، کیونکہ انسان انہیں پرے نہیں پھینک سکتا تھا۔

فلاسفر بھاری سانس بھرتا ہوا کھیت کے بیچوں بیچ بھاگ رہا تھا۔ اب انحصار اس بات پر تھا کہ اسے بھاگنے کے لئے کافی مہلت ملتی ہے یا نہیں۔ خدا کرے یہ سیدھے سادے نوجوان ریلے کو کچھ دیر تک روکنے میں کامیاب ہو جائیں۔

اچانک ایک قیامت کا درد اس کے جسم میں سے گزر گیا۔ اس کے بائیں پاؤں کا تلوا اس قدر جل رہا تھا کہ اسے لگا، جیسے وہ اس کی برداشت نہیں رکھتا۔ کراہتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو زمین پر گرا دیا۔ مگر درد کی ایک نئی چیخ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے ارد گرد دیکھا اور فوراً سب کچھ جان گیا۔ وہ کانٹوں کے ایک میدان میں آن گھسا تھا۔

ہر طرف پست قامت جھاڑیاں تھیں۔ جو بے حد نوکیلے کانٹوں سے لدی ہوئی تھیں۔ پاؤں میں بھی ایک کانٹا ہی چبھا ہوا تھا۔ احتیاط برتتے ہوئے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ وہ زمین پر ایک ایسی جگہ تلاش کرنے لگا، جہاں بیٹھ سکے۔ صحت مند پاؤں پر چند قدم ایک دائرے کی شکل میں چار پانچ پیشتر اس کے کہ دوسری بار بیٹھے، اسے فوراً کانٹا نکالنا چاہیے۔

بے قراری سے اس نے جنگ کے شور شرابے پر کان دھرے جو دونوں طرف اور دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ مگر سامنے کی طرف کم از کم ایک سو قدم کے فاصلے پر تھا تاہم قریب آتا لگتا تھا۔ ادھر سے ادھر سے شک و شبہ کے بغیر۔

سترلاو چیلی کو زنہار سنک کا تنا پتلے کے میں سے گزرتا ہوا گوشت کے اندر بہت گہرائی میں جا کر گھس گیا تھا۔ سپاہیوں کو، جو وطن کے دفاع کی خاطر دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں، آخر کیوں اتنے پتلے تلووں والے جوتے دیے جاتے ہیں۔ چیلی کا یہ گھاؤ درد کی جلن میں جا کر سنڈھتا تھا۔ تھک ہار کر بچارے نے اپنے بھاری بھرکم کندھے جھکا دیے۔ اب کیا کیا جائے؟

اس کی آنسوؤں سے لبریز آنکھ تلوار پر پڑی، جو کہ پاس ہی دھری تھی۔ ایک خیال اس کے دماغ میں کوند گیا، جو بحث مباحثوں میں پیدا ہونے والے خیالات سے کہیں بڑھ کر اسے بھلا لگا۔ کیا تلوار کا استعمال بطور نشتر کیا جا سکتا ہے؟ اس نے تلوار اٹھائی۔

عین اسی لمحے اس نے قدموں کی ہلکی سی چاپ سنی۔ ایک چھوٹا سا دستہ ان جھاڑیوں میں آن نکلا تھا۔ دیوتاؤں کا شکر ہے کہ یہ اپنے آدمی تھے۔ وہ چند لمحوں کے لئے رکے۔ جب ان کی نظر اس پر پڑی تو اس نے کسی کو کہتے ہوئے سنا۔ "یہ سوچی ہے"۔ وہ آگے بڑھ گئے۔ اب اس کے بائیں طرف بھی شور اٹھنے لگا۔ وہاں پر احکام ایک اجنبی زبان میں دیے جا رہے تھے۔ مریخی۔

سترلاو نے اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی، زیادہ درست ہے، اپنی دائیں ٹانگ پر۔ اس نے تلوار پر ٹیک لگائی۔ پھر قطعاً بائیں جانب ڈالی، جہاں پر تھوڑا سا خالی میدان تھا۔ وہاں پر اس نے لڑنے والوں کا ایک ہجوم تھا دست بدست ابھرتے ہوئے دیکھا۔ اسے ہانپتی ہوئی آوازیں اور لوہے پر لوہا چڑھے پر لوہا گرنے کی آوازیں سنائی دیں۔

انتہائی گھبراہٹ میں وہ اپنی تندرست ٹانگ پر پیچھے کی طرف ناچنے لگا۔ گرنے سے بچنے کے لئے زخمی پاؤں پر ٹیک لگانی پڑی اور آہ بھرتے ہوئے جھک گیا۔ جب لڑنے والوں کا جتھا، جو زیادہ بڑا نہ تھا، شاید بیس یا تیس آدمی ہوں گے، چند قدموں کے فاصلے پر آن پہنچا تو فلاسفر دو کانٹے دار جھاڑیوں کے درمیان اپنے چوتڑوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ بے چارگی کے عالم میں دشمن کی طرف تکتے ہوئے۔

اس کے لئے حرکت کرنا ناممکن تھا۔ ہر چیز اس کے پاؤں کے تلوے سے اٹھنے والے درد کو صرف ایک بار پھر سے چکھنے سے بہتر تھی۔ اسے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے۔ اچانک اس نے منہ پھاڑ پھاڑ کر چلانا شروع کر دیا۔ زیادہ درست ہوگا اگر کہا جائے کہ اس نے اپنے آپ کو چلاتے ہوئے سنا۔ اس نے اپنے آپ کو بھری ہوئی چھاتی سے چلاتے ہوئے سنا، جیسے ایک نقارہ بجتا ہے۔

"ادھر آؤ تیسری کمپنی۔ انہیں مزہ چکھا دو بیٹے۔"

ساتھ ہی ساتھ اس نے اپنے آپ کو گولائیک دائرے کی صورت میں گھماتے ہوئے دیکھا۔ عین اس وقت اس کے سامنے جھاڑیوں میں سے نمودار ہونے والا ایرانی سپاہی کھڑا تھا، جس نے نیزہ اٹھا رکھا تھا۔ نیزہ ایک طرف گرا اور ایرانی سپاہی کو اپنے ساتھ لیتا گیا۔

سترلا نے اپنے آپ کو دوسری بار چلاتے ہوئے سنا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "قدم پھر پیچھے نہ ہٹیں۔ اب یہ کچھ کی ولا دا اس جگہ پر ہیں، جہاں ہم انہیں لانا چاہتے تھے۔ کرولیس چھٹی کمپنی کو لے کر آگے آؤ۔ گولیں دائیں طرف۔ جو کوئی پیچھے ہٹےگا، میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔"

اپنے قریب اس نے حیرت سے اپنے دو سپاہیوں کو دیکھا، جو سہمے ہوئے اس کی طرف گھور رہے تھے۔ "چلاؤ" اس نے آہستگی سے کہا۔ "خدا کے واسطے چلاؤ"۔ ان میں سے ایک کا جبڑا خوف کے مارے لٹکے کا لٹکا رہ گیا۔ مگر دوسرے نے فی الواقع چلانا شروع کر دیا۔ اترت شت اور ایرانی جوان کے سامنے گر پڑا تھا، بمشکل اٹھا اور جھاڑیوں میں بھاگ گیا۔

جھاڑیوں میں سے، جہاں پر ایک خلا تھا اور جن پھر تھکے ماندے سپاہی ابھر آ نکلے۔ ایرانی اس شور شرابے کے سبب بھاگ گئے تھے۔ انہیں خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ گھات کا شکار ہو گئے تھے۔

"یہاں پر کیا ہو رہا ہے"۔ ایک ہم وطن نے سترلا سے پوچھا، جو ابھی تک زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ "کچھ نہیں"۔ اس نے جواب دیا۔ "یہاں پر کھڑے ہو کر مجھے گھورتے نہ رہو۔ ادھر ادھر دوڑو اور اونچی آواز میں ہدایات دو، تاکہ دوسری طرف انہیں پتہ چلے کہ ہماری تعداد کتنی کم ہے"۔

"بہتر ہے کہ ہم پیچھے ہٹ جائیں"۔ اس شخص نے کسی قدر تامل سے کہا۔

"ایک قدم بھی نہیں"۔ سترلا نے احتجاج کیا۔ "کیا تم بھگوڑے ہو؟"

اور چونکہ سپاہیوں کے لئے اتنا کافی نہیں ہے کہ وہ خوفزدہ ہوں بلکہ اس کے لئے لازمی ہے کہ خوش قسمتی اس کا ساتھ دے، خاصے فاصلے سے بالکل واضح طور پر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں۔ اور اونچی آواز میں للکاریں، جو یونانی زبان میں تھیں۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ اس روز ایرانیوں کو کس قدر تباہ کن ہزیمت اٹھانی پڑی تھی، جس کے نتیجے میں جنگ کے سلسلوں کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

جب الکیبیادیس گھڑ سواروں کے دستوں کی قیادت کرتا ہوا کانٹوں کے کھیت میں پہنچا، تو اس نے دیکھا کہ پیادوں کا ایک گروہ ایک سوئے شخص کو کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھا۔

اپنے گھوڑے کو روکتے ہوئے اس نے سترلا کو پہچان لیا۔ فوجیوں نے اسے بتایا کہ اس نے میدان سے بھاگتے پر آمادہ پلٹن کو اپنی غیر متزلزل جرأت کے ذریعے ٹھہرا لیا تھا۔

وہ اسے جلوس کی صورت میں اٹھائے ہوئے لشکر تک پہنچے۔ وہاں پر انہوں نے اسے اس کے احتجاج کے باوجود ایک رسد والی بیل گاڑی پر بٹھا دیا۔ اس طرح وہ پسینے سے لبریز اور خوشی کے مارے شور و غل مچانے والے فوجیوں کی معیت میں دارالسلطنت پہنچا۔

انہوں نے اسے کندھوں پر اٹھا کر اس کے چھوٹے سے گھر میں پہنچا دیا۔

اس کی بیوی خسان تھیپے اس کے لئے لوبیا پکانے والی تھی۔ چولہے کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے اور پھولے ہوئے گالوں سے آگ میں پھونکیں مارتے ہوئے وہ کبھی کبھی اس کی طرف تکتی جاتی تھی۔ وہ ابھی تک اسی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، جس پر اس کے ساتھیوں نے اسے لا کر بٹھایا تھا۔

"تمہارے ساتھ کیا ماجرا پیش آیا ہے؟" اس نے شک وشبہ کے انداز میں پوچھا۔

"میرے ساتھ؟" وہ بڑبڑایا "کچھ بھی تو نہیں"۔

"پھر یہ کیا چرچا ہے تمہاری بہادری کے کارناموں کا؟" وہ جاننا چاہتی تھی۔

"محض خرافات" اس نے کہا "اس کی مہک خوب ہے"۔

"لوبیے کی مہک کہاں سے آ گئی۔ جب کہ میں نے ابھی آگ ہی نہیں جلائی؟ تم نے پھر کسی بے وقوفی کا ارتکاب کیا ہے، ہوں؟" اس نے تیزی سے کہا۔ "کل سب لوگ مجھ پر ہنسیں گے جب میں روٹی خریدنے کے لئے جاؤں گی۔"

"میں نے کسی بے وقوفی کا ارتکاب نہیں کیا۔ میں نے جنگ لڑی ہے۔"

"کیا تم نشے میں تھے؟"

"نہیں۔ میں نے انہیں کھڑا ہو جانے پر مجبور کیا، جب کہ وہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔"

"تم خود کھڑے نہیں ہو سکتے ہو"۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا، کیونکہ آگ جل اٹھی تھی۔ "میز پر سے مجھے نمک دانی پکڑاؤ۔"

"میرا خیال ہے" اس نے کہنا شروع کیا، دھیمی آواز میں اور جیسے سوچ میں ڈوبے ہوئے۔ "میرا خیال ہے کہ میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔ میرا معدہ کسی قدر خراب ہے۔"

"میں نے تمہیں کہا ہے، ہاں کہ تم نشے میں دھت ہو۔ کوشش کرو ایک بار کھڑے ہونے اور کمرے میں چلنے کی۔ تب ہم اصل حقیقت کو جان جائیں گے۔"

اس کی بے ضابطگی کا اسے دکھ تھا۔ مگر وہ کسی صورت میں بھی کھڑا ہونے والے یہ دکھانے کے لئے تیار نہ تھا کہ وہ چل نہیں سکتا۔ وہ بے حد چالاک تھی۔ جب اسے اس کے بارے میں کسی ایسی بات کا پتا چلتا ہوتا تھا، جو اس کے خلاف جاتی تھی اور یہ بات یقیناً اس کے مفاد کے خلاف تھی کہ میدان جنگ میں اس کی بہادری کا اصل سبب عیاں ہو جائے۔ وہ بدستور چولہے پر دھری ہوئی پتیلی کے ساتھ مصروف تھی۔ البتہ ساتھ کے ساتھ اسے بتاتی جاتی تھی کہ اس کی اس بارے میں کیا رائے تھی۔

"مجھے یقین ہے کہ تمہارے معزز دوستوں نے تمہیں یہاں بھی کہیں پیچھے کوئی ہلکا سا مذبح کے لنگر میں دلوا دیا ہوگا۔ یوں بھی ہر چیز میں گھپلا چلتا ہے۔"

اس نے کھسیانے انداز میں کھڑکی کی درز میں سے باہر گلی میں جھانک کر دیکھا، جہاں پر لوگ روشن بتیاں اٹھائے ہوئے پھر رہے تھے، کیونکہ فتح کا جشن منایا جا رہا تھا۔

اس کے معزز دوستوں نے اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ اور وہ ایسی پیشکش کو قبول بھی نہ کرتا، کم از کم حیل وحجت کے بغیر نہیں۔

"کیا انہیں یہ بات منظور تھی کہ موچی بھی ان کے ساتھ قدم ملا کے چلے؟ وہ اپنی چھنگلی بھی تمہاری خاطر حرکت میں لانے کے لئے تیار نہیں۔ وہ موچی ہے۔ ان کا کہنا ہے اور اسے موچی ہی رہنا چاہئے۔ وگرنہ کیونکر ہم اس گندی کوٹھڑی میں آ کر گھنٹوں تک اس کے ساتھ بحث مباحثے کریں اور ساری دنیا کو کہتے ہوئے سنیں، دیکھو اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ وہ موچی ہے یا نہیں، یہ معزز لوگ آ کر اس کے پاس بیٹھتے ہیں اور اس کے ساتھ فلوسفی پر باتیں کرتے ہیں۔ جاہلوں کی اولاد۔"

"یہ فقط فلوزوفی ہے" اس نے دبے سے کہا۔

اس نے اس کی طرف تیکھی نظر سے دیکھا۔ "تم ہمیشہ مجھے سبق دینے کی کوشش نہ کیا کرو۔ مجھے علم ہے کہ میں ان پڑھ ہوں۔ اگر میں نہ ہوتی، تو کوئی بھی تمہارے لئے گاہے بگاہے پاؤں دھونے کے لئے پانی کا جگ بھر کے نہ رکھتا۔"

اس کے جسم میں سے جھرجھری سی گزر گئی۔ اسے امید تھی کہ اسے اس بات کا پتہ نہ چلا ہوگا۔ آج کسی حالت میں بھی پاؤں دھونے کی نوبت نہیں آنی چاہئے۔ دیوتاؤں کا بھلا ہو کہ اس نے پھر اپنی تقریر شروع کر دی تھی۔

"تم نہتے نہیں تھے اور نہ ہی انہوں نے تمہارے لئے کوئی ہلکا سا کام تلاش کیا تھا، تو پھر تم نے ایک قصاب کا سا نمونہ دکھایا ہوگا۔ کیا تمہارے ہاتھ خون سے تھڑے ہوئے ہیں؟ اگر میں کبھی ایک مکھی کو بھی مارتی ہوں، تو تم چلانے لگتے ہو۔ مجھے امید نہیں ہے کہ تم نے واقعی میں ایک جواں مرد کا سا کام کیا ہوگا۔ البتہ کوئی چالاکی، کوئی ہیر پھیر تم نے ضرور لگایا ہوگا، جس کے سبب وہ اس طرح تمہارے کندھے پر ہاتھ تھپکتے ہیں۔ میں اصل حقیقت معلوم کر کے رہوں گی۔ تم اطمینان رکھو۔"

لوبیا پک چکا تھا اور اس کی مہک بے حد لذیذ تھی۔ عورت نے اپنے گریبان سے پتیلی کے کنڈے کو پکڑتے ہوئے اسے میز پر رکھا اور کھانے لگی۔

اس نے سوچا کہ آیا اسے اب اپنی بھوک کا اقرار کر لینا چاہئے یا نہیں۔ مگر اس خیال نے کہ اسے اس صورت میں میز تک چلنا ہوگا، اسے بروقت اس ارادے سے باز رکھا۔

وہ قدرے بے چین تھا۔ اسے واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ معاملہ ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوا۔ یقیناً آئندہ دنوں میں بہت سی تکلیف دہ باتیں ہونے والی ہیں۔ ایرانیوں کے خلاف ایک لڑائی جیت کر انسان اس کے بد اثرات سے نہیں بچ سکتا۔ اس وقت فتح کی ابتدائی خوشیوں میں لوگ اس شخص کے بارے میں نہیں سوچیں گے، جو جیت کا باعث بنا تھا۔ ہر کوئی اپنے اپنے کارناموں کی تشہیر میں مصروف ہے۔ مگر کل یا پرسوں ہر کوئی دیکھے گا کہ اس کا ہمجولی ساری شہرت خود حاصل کرنے کے درپے ہے۔ تب لوگ اسے باہر نکالنے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح کئی ایک آدمی دوسروں کا کام خراب کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اگر وہ موچی کو اصل ہیرو قرار دے دیں۔ الکبیادس کے لوگ یوں بھی مخالف تھے۔ مزے لے لے کر لوگ اسے للکاریں گے۔ "تم نے لڑائی جیتی ہے، مگر لڑی ایک موچی نے ہے۔"

کانٹا اب پہلے سے کہیں بڑھ کر درد کرنے لگا تھا۔ اگر وہ چپل کو جلد نہ اتار سکا تو خطرہ ہے کہ خون میں پیپ پڑ جائے گی۔

"چٹخارے لے کر نہ کھاؤ" اس نے خیالات میں کھوئے ہوئے کہا۔

عورت کا چمچہ اس کے منہ میں دھنسا ہوا رہ گیا۔ "میں کیا کر رہی ہوں؟"

"کچھ نہیں"۔ اس نے جلدی سے گھبرا کر اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ "میں خیالات میں گم تھا۔"

وہ غصے سے بھری ہوئی اٹھی۔ پتیلی کو چولہے پر دے مارا اور باہر کی طرف لپکی۔

اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ جلدی سے اپنی کرسی پر سے اٹھا اور لپکتا ہوا سراسیمگی سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا کمرے کے پچھلے حصے میں اپنے بستر کی طرف بڑھا۔ جب وہ دوبارہ باہر جانے کے لئے اپنی شال لینے کی خاطر اندر آئی، تو اسے اپنے چمڑے کے بنے ہوئے تنگے بستر پر یوں ساکت لیٹے ہوئے دیکھ کر اسے عجب سا ہوا۔ ایک لمحے کے لئے اس کو خیال پیدا ہوا کہ اس کو

کوئی تکلیف تھی۔ اس نے اس بارے میں پوچھنے کا ارادہ کیا، کیونکہ وہ اس کی بے حد فرمانبردار تھی۔ مگر اس نے اس ارادے کو ترک کر دیا اور بڑبڑاتی ہوئی اپنی ہمسائی کے ساتھ جشن دیکھنے کے لئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

سٹرلا ٹھیک سے نہ سو سکا بلکہ بے اطمینانی سے اور خدشات و ہجوم کے ساتھ بیدار ہوا۔ چپلی اس نے اتاری تھی، مگر کانٹے کو نہ پکڑ پایا تھا۔ پاؤں خاصا سوج گیا تھا۔

اس کی بیوی آج قدرے کم ترش مزاج تھی۔ اس نے گزشتہ شام سارے شہر میں اپنے خاوند کا تذکرہ سنا تھا۔ کچھ نہ کچھ ضرور ہوا تھا، جس کے سبب لوگ اس قدر مرعوب تھے۔ یہ کہ اس نے دیوتاؤں کی فوج کے ایک پورے حملہ آور دستے کو روک لیا ہو، یہ بات اس کے سر میں نہ جاتی تھی۔ وہ یقین نہیں کر سکتی، اس نے سوچا۔ ایک پوری مجلس کو اپنے سوالات سے روک لینا۔ ہاں یہ کام وہ کر سکتا ہے مگر ایک دستے کو روکنا اس کے بس کی بات نہیں۔ آخر کیا ماجرا تھا؟ وہ اس قدر متذبذب تھی کہ وہ اس کے لئے بکری کا دودھ اس کے بستر پر لے آئی۔

اس نے قصے کا چسکا نہ لیا۔

"کیا تم باہر نہیں جاؤ گے؟" اس نے پوچھا۔

"میرا دل نہیں چاہتا۔" وہ بڑبڑایا۔

کوئی شخص اپنی بیوی کو اس کے مہذبانہ سوال کا جواب اس طرح نہیں دیتا مگر اس نے سوچا کہ شاید وہ اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں کا نشانہ بننے سے بچانا چاہتا تھا۔ اس وجہ سے اس نے اس جواب پر کوئی باز پرس نہ کی۔

پچھلے پہر ملاقاتی بھی آن نکلے۔

یہ چند ایک نوجوان تھے۔ امیر والدین کے بیٹے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ اپنے استاد جیسا سلوک کیا کرتے تھے۔ اور بعض تو ہر بات لکھ لیا کرتے تھے، جب وہ ان سے گفتگو کرتا تھا۔ گویا اس کی باتیں خاص اہمیت کی حامل تھیں۔

"آج"، انہوں نے اسے بتایا "سارے شہر میں اس کی شہرت کا چرچا تھا۔ یہ دن فلاسفی کے لئے ایک تاریخی دن تھا (اس نے درست ہی کہا تھا کہ اصل نام طور فلسفی تھا نہ کہ کچھ اور) سٹرلا نے ثابت کر دیا تھا کہ عظیم شاہد کے اندر اُلٹ پلٹ کا فعال بننے کی صلاحیت موجود ہے۔"

سٹرلا ان کی باتیں سنتا رہا۔ آخر اپنے عادی طور و مزاج کے مظاہرے کے۔ جب وہ بول رہے تھے، تو اسے یوں لگا، جیسے وہ قہقہوں کی آواز کہیں دور سے سن رہا تھا۔ ایسے جیسے فاصلے سے بادل کی گھن گرج سنائی دیا کرتی ہے۔ قہقہے ایک پورے شہر کے بلکہ سارے ملک کے کہیں دور دراز مگر قریب آتے ہوئے بلا روک ٹوک نزدیک پہنچتے ہوئے، ہر کسی کو ہنسنے پر مجبور کرتے ہوئے، سڑکوں پر دلالوں کو، تاجروں کو، سیاستدانوں کو اور کاریگروں کو اپنی چھوٹی چھوٹی دکانو

ں میں۔

"یہ سب بے ہودہ باتیں ہیں جو تم کر رہے ہو" اس نے یکلخت ایک نتیجے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ "میں نے کچھ نہیں کیا۔"

مسکراتے ہوئے انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ تب ایک بولا۔

"عین یہی بات ہم نے کہی تھی۔ ہمیں علم تھا کہ تمہارا ردعمل ایسا ہی ہو گا۔ ہم نے دوسو پولس سے جمنازیم کے سامنے یہ سوال کیا کہ یہ ایکا ایکی کیا شور شرابا ہے۔ دس برس تک سٹرلا نے عقل و فہم کے عظیم ترین کارنامے سر انجام دیے بغیر اس کے کہ کسی نے پلٹ کر اس طرف دیکھا بھی ہو۔ اب اس نے ایک جنگی معرکہ مارا ہے اور سارا شہر اس کا نام جپ رہا ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ یہ بات کس قدر قابل شرم ہے۔"

سٹرلا نے آہ بھری۔ "مگر میں نے تو جنگی معرکہ نہیں مارا۔ میں نے صرف اپنا دفاع کیا کیونکہ مجھ پر حملہ کیا گیا تھا۔ مجھے اس معرکے سے کوئی سروکار نہیں۔ میں نہ تو اسلحہ فروش ہوں اور نہ ہی اس گرد و نواح میں میرے انگوروں کے باغات ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر میں کس وجہ سے جنگیں لڑتا پھروں۔ میں نواحی آبادیوں کے باشعور لوگوں کے دستے میں تھا، جنہیں جنگوں میں کوئی دلچسپی نہیں اور میں نے عین وہی کچھ کیا، جو وہ کر رہے تھے۔ شاید ان سے چند لمحے پیشتر۔"

ان پر گویا سکتہ طاری ہو گیا۔

"سچ سچ" وہ پکارے۔ "یہی بات ہم نے بھی کہی تھی کہ اس نے اپنا دفاع کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ یہ اس کا طریق ہے معرکوں میں جیتنے کا۔ ہمیں اجازت دو کہ ہم جمنازیم میں واپس لوٹیں۔ ہم نے ایک بحث کو محض تمہیں صبح بخیر کہنے کی غرض سے عارضی طور پر روکا تھا۔"

اور وہ بحث جاری رکھنے میں ڈوبے ہوئے وہاں سے نکلے۔

سٹرلا خاموشی سے کہنیوں پر ٹیک لگائے لیٹا رہا اور دھوئیں سے سیاہ چھت کو تکتا رہا۔ اس کے تاریک خدشات درست ہی نکلے تھے۔

اس کی بیوی کمرے کے ایک کونے سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ کسی مشین کی مانند ایک پرانی شلوار کی مرمت میں مصروف تھی۔

ایکا ایکی اس نے ہولے سے کہا۔ "اس سارے قصے کا راز کیا ہے؟"

وہ گھبرا سا گیا۔ اس نے متذبذب سے اس کی طرف نگاہ ڈالی۔

وہ کام کاج کے سبب ایک گھسی پٹی سی عورت تھی، جس کے پستان ایک تختے کی مانند تھے اور آنکھیں افسردہ سے۔ پتا تھا کہ وہ اس پر بھروسہ کر سکتا ہے۔ وہ اس وقت بھی اس کا ساتھ دے گی۔ جب اس کے شاگرد کہنے لگیں گے۔ سٹرلا؟ کیا وہ بے ہودہ سوچ نہیں ہے، جو دیوتاؤں کا انکار کرتا ہے۔ اس کا

انتخاب بے چارگی کے لئے کچھ اچھا ثابت نہ ہوا تھا۔ مگر اس بات کی شکایت وہ سوائے اس کے کسی دوسرے کے سامنے نہ کرتی تھی۔ اور ایک شام بھی ایسی نہیں گزری کہ وہ اپنے امیر شاگردوں کے ہاں سے بھوکا گھر لوٹا تھا اور اسکے لئے کارنس پر روٹی اور چپاتی کا ٹکڑا نہ دھرا تھا۔

اس نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ آیا وہ اسے ساری بات بتا دے مگر اس نے سوچا کہ آئندہ دنوں میں اسے اس کی موجودگی میں بہت سی جھوٹی اور منافقانہ باتیں کرنی پڑیں گی، جب لوگ آئیں گے جیسے ابھی اور اس کے دلیرانہ کارناموں کا تذکرہ کریں گے۔ اور یہ بات وہ نہیں کر سکتا، جب کہ اسے اصل حقیقت کا علم ہوگا آخر وہ اس کی عزت کرتا تھا۔

اس وجہ سے اس نے اس بات کو جانے دیا اور صرف اس قدر کہا۔ "کل شام کے باسی لوبیا کی بو ہمارے کمرے میں پھیل رہی ہے۔"

اس نے از سر نو اس کی طرف شک و شبہ کی نظر ڈالی۔

واضح ہے کہ ان کی مالی حالت کھانے کو ضائع کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ وہ صرف کوئی ایسا بہانہ تلاش کر رہا تھا کہ اس کی توجہ بٹ جائے۔ جب کہ اس کی بیوی کے دل میں پیچ گھر کر چکی تھی کہ کوئی بات ضرور ہے آخر وہ اٹھا کیوں نہیں؟ وہ ہمیشہ دیر سے سویا ہوا اٹھتا تھا۔ مگر صرف اس وجہ سے کہ وہ ہمیشہ دیر سے سونے جاتا تھا۔ اور آج سارا شہر فتح کے جشن کے سبب باہر نکلا ہوا تھا۔ گلیوں میں ساری دکانیں بند تھیں۔ گھڑ سواروں کا ایک دستہ پانچ بجے دشمن کے تعاقب سے واپس لوٹا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں سننے میں آئی تھیں۔ فنانوں کے مجمعے اس کا محبوب ترین مشغلہ تھے۔ ایسے دنوں میں وہ صبح سے شام تک بھاگا پھرتا تھا۔ اور بحث مباحثے چھیڑا کرتا تھا آخر وہ اٹھا کس وجہ سے نہیں رہا؟

دروازے میں تاریکی سی چھا گئی اور بلدیہ کے چار کارندے اندر داخل ہوئے۔ وہ کمرے کے بیچوں بیچ آ کر رکے۔ اور ان میں سے ایک نے سرکاری انداز میں البتہ مہذب لہجے میں کہنا شروع کیا کہ اس کو حکم دیا گیا تھا سقراط کو مجلس بلدیہ میں لانے کا۔ سپہ سالار السیبیادس نے خود قرارداد پیش کی تھی کہ اس کی جنگی خدمات کے صلے میں اس کی عزت افزائی کی جائے۔

گلی میں آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہمسائے گھر کے سامنے جمع ہو گئے تھے۔

سقراط کو لگا جیسے اس کے پسینے چھوٹ رہے ہوں۔ اسے پتا تھا کہ اسے اب کھڑا ہونا پڑے گا اور اس صورت میں بھی کہ وہ ان کے ساتھ چلنے سے انکار کرتا ہے اسے کم از کم کھڑے ہو کر مہذبانہ ڈھنگ میں کچھ کہنا ہوگا۔ اور ان لوگوں کی دروازے تک مشایعت کے لئے جانا ہوگا۔ اور اسے علم تھا کہ وہ زیادہ دور تک نہ چل سکے گا۔ زیادہ سے زیادہ دو قدم۔ تب وہ اس کے پاؤں کی طرف دیکھیں گے اور انہیں اصل حقیقت کا پتا چل جائے گا۔ اور عام تمسخر کی وجہیں سے فوری طور پر ابتدا ہو جائے گی۔

اس نے کھڑا ہونے کی بجائے اپنے آپ کو بستر پر دراز کیا اور بگڑتے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ "مجھے کسی عزت افزائی کی حاجت نہیں ہے۔ مجلس بلدیہ سے کہہ دو کہ میں نے گیارہ بجے کا وقت چند دوستوں کے ساتھ طے کر رکھا ہے ایک فلسفیانہ سوال کے بارے میں بات کرنے کے لئے، جس میں ہمیں دلچسپی ہے۔ اس وجہ سے مجھے افسوس ہے کہ میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ عام مجالس کے لئے میں غیر موزوں شخص ہوں اور یوں بھی اس وقت بے حد تھکا ہوا ہوں۔"

یہ آخری فقرہ اس نے بڑھا دیا کیونکہ اسے رنج ہو رہا تھا کہ خواہ مخواہ فلاسفی کو بیچ میں لے آیا تھا۔ اور پہلا فقرہ اس نے اس لئے کہا تھا کہ ایسی رنجیدہ باتوں کے ذریعہ آسانی کے ساتھ ان سے اپنا پیچھا چھڑا سکنے کی امید رکھتا تھا۔

بلدیہ کے کارندوں پر اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ انہوں نے ایڑیوں کے بل اپنا رخ موڑا اور رخصت ہو گئے، باہر کھڑے لوگوں کے پاؤں پر قدم دھرتے ہوئے۔

"وہ تمہیں بلدیہ کے کارندوں کے ساتھ عزت سے پیش آنا سکھا کے چھوڑیں گے۔" اس کی بیوی نے جھنجلا کر کہا اور باورچی خانے میں چلی گئی۔

سقراط نے اس کے کمرے سے نکلنے کا انتظار کیا۔ اس کے بعد اپنے بھاری بھرکم جسم کو بستر میں جلدی سے پلٹا اور دروازے کو تیز سی نظر میں رکھتے ہوئے بستر کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ اور بے حد احتیاط برتتے ہوئے اپنے بیمار پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی۔ مگر سب بے سود نظر آیا۔ پسینے میں شرابور وہ دوبارہ لیٹ گیا۔

نصف گھنٹہ اس طرح گزر گیا۔ اس نے ایک کتاب اٹھائی اور پڑھنے لگا۔ اگر وہ پاؤں کو حرکت نہ دیتا تھا تو اسے کوئی تکلیف محسوس نہ ہوتی تھی۔

تب اس کا دوست انتی تھیس آ گیا۔ اس نے اپنا موٹا کمبل نہیں اتارا۔ بستر کی پائینتی کی طرف رکا۔ کسی قدر تکلف کے ساتھ کھانسا۔ اپنی بڑھی ہوئی داڑھی اور گردن کو رگڑا اور نظر سقراط پر مرکوز کئے رہا۔

"تم ابھی تک لیٹے ہوئے ہو؟ میں نے سوچا تھا کہ گھر پر صرف زانتیپے سے ملوں گا۔ میں خاص طور پر تمہاری خبر لینے کے لئے اٹھا تھا۔ مجھے سخت زکام ہوا ہے اسی وجہ سے کل میں لڑائی میں حصہ نہیں لے سکا تھا۔"

"بیٹھ جاؤ۔" سقراط نے روکھا سا جواب دیا۔

انتی تھیس نے کونے سے ایک کرسی کھینچی اور اپنے دوست کے قریب بیٹھ گیا۔

"میں آج شام دوبارہ اسباق شروع کر رہا ہوں۔ انہیں زیادہ دیر تک ملتوی کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔"

"نہیں ہے"

"البتہ میں سوچتا ہوں کہ کیا وہ آئیں گے۔ آج جشن کے کھانے ہیں۔ یہاں آتے ہوئے راستے میں مجھے وہ لڑکا فیسٹون ملا تھا۔ جب میں نے اسے کہا کہ میں آج شام الجبرے کا سبق دوں گا، تو وہ خوشی کے مارے پھولے نہ سماتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ جنار کے گنبد میں آ جائے۔ پروطاگورس اور دوسرے غصے سے جل بھن جائیں گے جب سنیں گے کہ لڑکوں نے انتس تھینس کے ہاں لڑائی کی اگلی شام کو الجبرا پڑھا تھا۔"

"کیا تمہیں اور کوئی بھی ملا تھا؟"

"بے شمار لوگ۔"

سقراط نے بگڑے ہوئے مزاج سے چھت کی طرف دیکھا۔ کیا اسے انتس تھینس کو یہ بات بتا دینی چاہئے؟ اس پر اسے بھروسہ تھا۔ وہ خود بھی پڑھانے کی فیس نہ لیا کرتا تھا، اس وجہ سے گویا انتس تھینس کا حریف نہ تھا۔ بہتر ہوگا اگر وہ اس مشکل مسئلے کو اس کے سامنے رکھ دے۔

انتس تھینس نے اپنے دوست کو اپنی چمکتی ہوئی مکڑی جیسی آنکھوں سے تجسس کے ساتھ دیکھا اور کہنے لگا۔

"کوئی گیا اس لوگوں کے پاس جا جا کر انہیں کہہ رہا ہے کہ تم یقیناً بھاگ نکلے ہوگے اور فراتفری میں غلط سمت میں سامنے کی طرف نکل گئے ہوگے۔ چند ایک ہوتے نچلے طبقے کے نوجوان تو اسے اس وجہ سے پیٹنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔"

"بے ہودہ باتیں۔" اس نے جھنجھلا کر کہا۔ اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ اگر وہ حقیقت کا اعتراف کر لے تو اس کے دشمنوں کے ہاتھ میں اس کے خلاف کیسا حربہ آ جائے گا۔

اس نے رات کو خصوصاً صبح کے وقت سوچا تھا کہ وہ اس قصے کو ایک تجربے کا رنگ دے سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ اس نے صرف یہ دیکھنا چاہا تھا کہ لوگ کس قدر آسانی کے ساتھ باتوں پر ایمان لے آتے ہیں۔ بیس برس تک میں نے ہر گلی اور کوچے میں امن پسندی کا پرچار کیا تھا۔ مگر ایک افواہ کافی تھی کہ خود میرے شاگرد اسے سچ سمجھ بیٹھے وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس صورت میں لڑائی نہ جیتی جانی چاہئے تھی۔ واضح ہے کہ امن پسندی کے پرچار کے لئے وقت موزوں نہ تھا۔ شکست کے بعد تو ایک عرصے تک خود بخود ہی امن پسند ہوا کرتے ہیں، جبکہ فتح کی صورت میں نچلے طبقے کے لوگ بھی جنگ کے حامی ہوتے ہیں۔ کم از کم اس وقت تک جب انہیں احساس ہو جاتا ہے کہ ان کے لئے فتح اور شکست میں کوئی فرق نہیں ہے۔ نہیں، امن پسندی کے ذریعے وہ اس وقت کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔

گلی میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ گھڑسوار اس کے گھر کے سامنے آ کر رکے اور تیز قدموں کے ساتھ الکیبادیس کمرے میں داخل ہوا۔

"صبح بخیر۔ انتس تھینس دباغی کے کاروبار کا کیا حال ہے؟ وہ تو آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔" اس نے تمتماتے ہوئے چہرے سے کہا۔ "سقراط تمہارے جواب پر بگلی بلدیہ میں لوگ غصے سے چلا رہے ہیں۔ میں نے مذاق کرنے کے خیال سے اپنی قرار داد کہ تمہیں فدائی تاج پہنایا جائے، بدل کر تجویز پیش کی کہ تمہیں پچاس کوڑے مارے جائیں۔ مگر اس بات سے لوگ بگڑ گئے، کیونکہ یہ تجویز ان کی موجودہ طرز سوچ کے عین مطابق تھی۔ تمہیں بہر صورت چلنا چاہئے۔ ہم دونوں اکٹھے پیدل وہاں جائیں گے۔"

سقراط نے آہ بھری۔ اس کے تعلقات نوعمر الکیبادیس کے ساتھ بہت اچھے تھے۔ انہوں نے اکثر مل کے مے نوشی کی تھی۔ اس کی آمد اس کی مہربانی تھی۔ اس کے پیچھے یقیناً محض بگلی بلدیہ کو چڑانے کی خواہش ہی کام نہیں کر رہی تھی، اگرچہ یہ خواہش بھی اپنی جگہ پر تعظیم کے لائق تھی اور اس قابل کہ اس کی تکمیل میں مدد کی جائے۔

سوچ میں ڈوبے ہوئے اس نے بالآخر کہا ایسے میں کہ وہ اپنے جھولنا بستر میں جھولے لے رہا تھا۔ "جلد بازی کے کام ناقص ہوتے ہیں۔ بیٹھ جاؤ۔"

الکیبادیس مسکرایا اور ایک کرسی نزدیک کھینچ کر بیٹھ گیا۔ بیٹھنے سے قبل اس نے ادب سے زنتھیپی کے سامنے سر خم کیا، جو باورچی خانے کے دروازے میں کھڑی اپنے گیلے ہاتھوں کو کرتے کے پلے سے پونچھ رہی تھی۔

"تم فلاسفر عجیب مخلوق ہو۔" اس نے کسی قدر بے صبری کے ساتھ کہا۔ "شاید تمہیں اب افسوس ہو رہا ہے اس بات پر کہ تم نے لڑائی جیتنے میں مدد کیوں دی تھی۔ انتس تھینس نے غالباً تمہاری توجہ اس بات کی طرف مبذول کرائی ہوگی کہ اس بات کے حق میں کافی دلائل موجود تھے۔"

"ہم نے الجبرا کے بارے میں بات چیت کی ہے۔" انتس تھینس نے جلدی سے کہا اور پھر سے کھانسا۔

"مجھے بھی اور کسی بات کی توقع نہ تھی۔ بس ایسی چیزوں کو اہمیت نہ دی جائے نہیں؟ ہوں۔ میری رائے میں یہ خالص دلیری تھی۔ تم چاہو تو کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ مگر کیا درختوں کے چند پتے بھی کوئی خاص شے ہو سکتے ہیں؟ داغوں کو کھینچ کے بیکار روائی بھی ہونے دو بابا۔ چند لمحوں میں بات ٹل جائے گی درد اور تکلیف کے بغیر۔ اس کے بعد ہم مے نوشی کرنے جائیں گے۔"

سقراط نے تیزی سے سوچا۔ اس کے ذہن میں ایک بات آئی تھی جو اسے کہنی چاہئے۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ کل رات یا آج صبح اس کے پاؤں میں موچ آ گئی تھی۔ مثلاً اس وقت جب فوجیوں نے اسے اپنے کندھوں پر سے اتارا تھا۔ اس میں ایک نکتہ بھی تھا۔ اس مثال سے ثابت کیا جا سکتا تھا کہ کس قدر آسانی کے ساتھ لوگوں کو ہم وطنوں کی طرف سے دی جانے والی عزت و توقیر کے نتیجے میں نقصان پہنچ سکتا ہے۔

جھوٹے کی حرکت کو روکے بغیر اس نے اپنے جسم کو سامنے کی طرف جھکایا، اس طرح کہ وہ بیٹھ گیا۔ دائیں ہاتھ سے اس نے ننگے بائیں بازو کو رگڑا اور دھیرے دھیرے کہنے لگا۔ "بات یوں ہے میرا پاؤں۔۔۔"

یہ کہتے ہوئے اس کی نظر، جو اب تک ادھر ادھر بھٹک رہی تھی، کیونکہ وہ اب پہلی بار فی الحقیقت اس سلسلے میں جھوٹ بولنے والا تھا، اب تک اس نے اس معاملے میں صرف خاموشی اختیار کئے رکھی تھی، خسان مچے پر باورچی خانے کے دروازے میں پڑی۔

ستر لاو کی زبان گنگ ہو گئی۔ یکا یک اسے اپنی تراشی ہوئی کہانی کو بیان کرنے میں باک تھا۔ اس کے پاؤں میں سوچ نہ آئی تھی۔ جھولتا ہوا بستر رک گیا۔

"سنو الکیبادس۔" اس نے سنجیدگی کے ساتھ اونچا ئی آواز میں کہا۔ "اس معاملے میں دلیری کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ جونہی جنگ چھڑی تھی، جب میں نے پہلے مریضوں کو نمودار ہوتے ہوئے دیکھا، میں بھاگ نکلا۔ صحیح سمت میں، پیچھے کی طرف۔ مگر راستے میں کانٹے دار جھاڑیوں میں میرے پاؤں میں ایک کانٹا چبھ گیا۔ اس وجہ سے میں آگے نہ جا سکتا تھا۔ اس پر میں نے ایک وحشی کی مانند اپنے ارد گرد کو دکھائی۔ جس سے بلکہ اپنے چند آدمیوں کو بھی زخمی کرنے لگا تھا۔ میں نے مایوسی کے عالم میں دوسرے دستوں کے بارے میں چلانا شروع کر دیا، تا کہ ایرانی سمجھیں کہ وہاں پر دوسرے دستے بھی ہیں۔ مگر یہ بات فضول تھی کیونکہ وہ یونانی زبان نہیں سمجھتے۔ دوسری طرف معلوم ہوتا تھا کہ وہ گھبراہٹ کا شکار تھے اور اس شور شرابے کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ شاید ان مشکلات کے سبب جن کا سامنا انہیں اس وقت تک آگے بڑھنے میں کرنا پڑا تھا، وہ ایک لمحے کے لئے رک گئے۔ اس عرصے میں ہمارے گھڑسوار دستے پہنچ گئے۔ بس اتنی سی بات تھی۔"

چند لمحوں تک کمرے میں بے حد خاموشی طاری رہی۔ الکیبادس نے اسے گھور کر دیکھا۔ انتیس تھیلس تھیلی منہ کے آگے رکھ کر کھانسا۔ اس دفعہ اصلی کھانسی۔ باورچی خانے کے دروازے سے جہاں پر خسان مچے کھڑی تھی ایک بلند قہقہے کی آواز آئی۔

تب انتیس تھیلس نے خشک لہجے میں کہا۔ "اس وجہ سے تم قدرتی طور پر مجلس بلدیہ میں نہیں جا سکتے تھے اور سیڑھیوں پر چڑھ کر فتح کا افواہی تاج نہیں لے سکتے تھے۔ میں اس بات کو سمجھتا ہوں۔"

الکیبادس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور ستر لاو کو، جو بستر پر لیٹا ہوا تھا، بھینچی ہوئی آنکھوں سے تکتا رہا۔ نہ انتیس تھیلس نے اور نہ ہی ستر لاو نے اس کی طرف نگاہ ڈالی۔

وہ پھر سے سامنے کی طرف جھکا اور اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے گھٹنے کو پکڑا۔ اس کا لمبا پتلا بچوں جیسا چہرہ کسی قدر رکا تھا۔ مگر اس سے اس کے اندرونی خیالات اور جذبات کی غمازی نہ ہوتی تھی۔

"تم نے کس وجہ سے یہ نہ کہا کہ تم کسی اور جگہ پر زخمی ہوئے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کیونکہ کانٹا ابھی تک میرے پاؤں میں ہے۔" ستر لاو نے درشتی سے جواب دیا۔

"ہاں تو یہ وجہ تھی؟" الکیبادس نے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں۔" وہ جھٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بستر کے قریب آیا۔

"افسوس کی بات ہے کہ میں اپنا فتح کا افواہی تاج ساتھ نہیں لایا۔ میں نے اسے اپنے ایک آدمی کے سپرد کیا تھا سنبھالنے کی خاطر ورنہ میں اسے اب تمہیں پیش کر دیتا۔ تم میری بات پر اعتبار کر سکتے ہو کہ میں تمہاری دلیری کا قائل ہو گیا ہوں۔ میں کسی دوسرے شخص کو نہیں جانتا جو ان حالات میں وہ بات بتاتا، جو تم نے بیان کی ہے۔"

جب خسان مچے نے اس کا پاؤں دھویا اور کانٹا باہر نکالا، تو اس نے بگڑ کر کہا۔ "اس سے خون میں پیپ پڑ سکتی تھی۔"

"کم از کم۔" فلاسفر نے جواب دیا۔

☆

بقیہ لافانی عشق

جہاں پر نیا ایڈیشن چھپنے سے پہلے سابقہ ایڈیشن کی باقی ماندہ کتابیں ردی کے بھاؤ بکتی ہیں۔

اس دوران میں کاتھی نے دوسری الماری میں رکھے ہوئے بہت سے فوٹو البم نکال لئے تھے اور ان کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ اچانک وہ ایک تصویر پر آن کر رک گئی۔ لگتا تھا کہ وہ کسی کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں کتابوں کو الماری میں واپس رکھنے کے بعد اس کی طرف گیا تو کاتھی نے مجھ پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی اور پوچھا کیا یہ تصویر تمہاری نہیں ہے؟

میں نے فوٹو البم کو اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے تصویر پر نظر ڈالی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ سچ مچ میری تصویر تھی، جو اس شام کھینچی گئی تھی، جب میں ہیلے کے ساتھ اس کے دوستوں کی محفل میں شامل ہونے کیلئے گیا تھا، جو ولیس ولیس کی لوک کہانیاں مل کر پڑھتے تھے اور مجھ سے ہندوستان کے فوک کلچر پر بات کرنا چاہتے تھے۔ تصویر کے نیچے ہیلے نے لکھ رکھا تھا: "لافانی عشق، جس کو میں ساری عمر نبھا سکوں گی"۔

(کرلیلنڈ۔ ۲ مئی۔ ۱۷ اگست ۲۰۰۲ء)

نظمانے

ڈاکٹر منیر الدین احمد

سکھوں کا راج

ایک اجنبی سے کسی نے کہا
"راولپنڈی کو دیکھنا ہو تو
اندھیرا پڑنے کے بعد
راجہ بازار میں جاؤ
یا جھنگی محلے کا رخ کرو
تمہیں یوں لگے گا، جیسے تم
سکھوں کے وقتوں میں آ نکلے ہو"

"آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر"
اجنبی نے جواب دیا
"میں دن کے وقت
پنڈی کے گلی کوچوں میں گھوم چکا ہوں"

☆

مچھلیاں کس حساب میں ہیں؟

کہتے ہیں کہ پہلے وقتوں میں
سیانوں کو پرندوں کی بولیاں آتی تھیں
وہ درختوں کی سرگوشیاں سنتے تھے
اور مچھلیوں کی بات بوجھتے تھے
ہواؤں کی سرسراہٹ کا راز جانتے تھے
زمین ان پر اپنے خزانے کھول دیتی تھی
اور ستارے ان کو راستہ دکھاتے تھے
آسمان ان کی ڈھال بن جاتا تھا
درندوں کے ساتھ ان کا روز کا واسطہ تھا
اور جانوروں کے ساتھ ان کی یاری تھی

ہمیں پرندوں کی بولیوں سے کوئی سروکار نہیں
نہ درختوں کی سرگوشیوں سے واسطہ
مچھلیوں کی باتیں بے معنی ہیں
اور ہواؤں کی سرسراہٹ لاحاصل
ستاروں کے ہم عرصہ ہوا محتاج نہیں رہے
نہ آسمان ہمارا کچھ بگاڑ سکتا ہے
درندوں کا ہم نے صفایا کر دیا ہے
اور جانور بھی دنوں کے مہمان ہیں
اس کے بعد درختوں کی باری آئے گی
رہیں مچھلیاں
تو وہ کس حساب میں ہیں؟

☆

بزدل

میرا دادا کسرتی بدن نہ رکھتا تھا
اسے ڈنٹر پیلنے نہ آتے تھے
دوڑ میں وہ سب سے پیچھے رہ جاتا تھا
لڑائی جھگڑے سے وہ کتراتا تھا
اس کی بزدلی ضرب المثل تھی

پھر طاعون پھیل گیا
اور لوگ مکھیوں کی طرح مرنے لگے
گھر گھر میں ماتم کی صفیں بچھ گئیں
لوگ بیماروں کو چھوڑ کر گھروں سے بھاگنے لگے
گاؤں خالی ہو گیا
بیماروں کا کوئی پرسان حال نہ رہا
ان کو ان کی قسمت پر چھوڑ دیا گیا
میرے دادے کا ایک بھائی اور بھاوج بھی
ان میں شامل تھے

سارا خاندان گاؤں سے تین میل دور

ایک کھوہ میں رہنے لگا
کوئی اب گاؤں کا رخ نہ کرتا تھا
سوائے میرے دادا کے
جو صبح اور شام
بیماروں کو دیکھنے جاتا تھا
ان کے لئے دوائیاں لاتا تھا
خورونوش کا سامان پہنچاتا تھا

یہ معمول رہا اس کا
اس روز تک
جب بیماروں نے ایک ہی روز
اس کے بازوؤں میں دم توڑا

میرا دادا یہ خبر لے کر
اپنے کنبے کے پاس پہنچا
مگر کوئی اس کے ساتھ چلنے کو تیار نہ ہوا
مُردوں کو دفنانے کے لئے

یہ کام بھی اس نے اکیلے ہی کیا
قبریں کھودیں
نعشوں کو قبرستان میں پہنچایا
اور ان کو سپردِ خاک کیا

میرا دادا طاعون سے نہیں مرا
اور گاؤں بھر میں
اس کی بزدلی ضرب المثل رہی

مجھے اس کی بزدلی پر
فخر ہے

☆

ناٹک

جب جرمنی جاگ اٹھا
اور ہٹلر نے زمامِ اقتدار سنبھالی
تو نازی پارٹی نے
اپنے مخالفوں کا ناطقہ بند کر دیا
اخباروں پر پابندیاں لگ گئیں
یونین کے ممبروں اور اشتراکیوں کے
گھروں پر چھاپے مارے گئے
جو لوگ اپنے آریہ ہونے کا ثبوت نہ دے سکتے تھے
انہیں یہودیوں اور حبشیوں کے ساتھ
کنسنٹریشن کیمپوں میں بھوکوں مارا گیا
اور گیس چیمبروں میں ان کی جان لی گئی
ان کی ہڈیوں سے صابن بنایا گیا
تا کہ جلاد اپنے ہاتھ دھو سکیں

یہ ناٹک اتنا بھی پرانا نہیں
کہ دوبارہ نہ کھیلا جا سکے
یہاں پر، وہاں پر، یا میرے وطن میں
ہٹلر ہر زمانے میں پیدا ہوتے ہیں
اور ہر کوئی اپنے آریا ہونے کا ثبوت نہیں دے سکتا

☆

سایوں کی بہتات

پرانے وقتوں میں
چین کے صحرائی شہر کوچا میں
مجرموں کو سزائے موت کی بجائے
سزائے حیات دی جاتی تھی
طلوعِ شمس کے وقت مجرموں کو
ایک درخت کے سامنے کھڑا کر کے
ان کے سائے کو درخت کے تنے پر
نقش کر دیا جاتا تھا
آنے والے برسوں میں سایہ

معاشرے میں ان کی قائم مقامی کرتا تھا
خود مجرموں کو ان کے گھروں میں
بند کر دیا جاتا تھا
مکمل ملاقات اور بات چیت کی
ممانعت کے ساتھ

ہمارے وقتوں میں
درختوں کی قلت ہی
اس روایت کے احیا
کے راستے میں روک نہیں ہے
بلکہ یہ امر بھی کہ
ایک ایک آدمی میں
کئی کئی سائے بسنے لگے ہیں

☆

راستہ

لوک کہانیوں کا ہیرو
اپنی مہموں کے دوران
ایک چوراہے پر پہنچتا ہے
جہاں پر ایک تختی لگی ہوئی ہے
جس پر لکھا ہے کہ
جو کوئی یہاں سے دائیں ہاتھ
یا بائیں ہاتھ کو مڑے گا
یا ناک کی سیدھ میں آگے جائے گا
اس کا استقبال موت کرے گی

مجھے خبر نہیں ہے کہ ہیرو نے
کونسا راستہ اختیار کیا تھا
میں صرف یہ جانتا ہوں کہ
مجھے اس تختی کے سامنے کھڑے
ایک عمر بیت چکی ہے
اور میں نہیں جانتا ہوں کہ
مجھے کون سا راستہ لینا چاہیے
واپسی کا راستہ مسدود ہے
اور پلوں کو اپنے پیچھے
میں نے توڑ دیا ہے اور
کشتی کو نذرِ آتش کر چکا ہوں

☆

زندہ مردہ

کون جانتا ہے کہ
حضرت نوح کو
کتنی صدیوں تک
سیلاب کی راہ تکنی پڑی
جس کے آنے کی خبر دیتے
وہ تھکتے ہی نہ تھے

پھر کتنے عشروں تک
ان کی کشتی
پہاڑ کی چوٹی پر
ٹنگی رہی
اور کتنے زمانے لگے
زمین کو خشک ہونے میں
درختوں کو اگنے میں
فصلوں کو پکنے میں
نسلوں کو پھیلنے میں
شہروں کو آباد ہونے میں

حضرت نوح کو
بھلا جلدی بھی کیا تھی
کہتے ہیں کہ
وہ نو سو برس جیئے

جلد بازی تو

ہماری قسمت میں لکھی تھی

ہمارے وقتوں میں
سارے ریکارڈ ٹوٹ چکے ہیں
زندگی کے پیچھے بھاگنے کے
اور موت کے آگے

بعض اوقات
یوں لگتا ہے
جیسے مجھے مرے ہوئے
نو سو برس ہو چکے ہیں

☆

مجسمہ ساز

چین کے بادشاہ
اکیلے نہ مرتے تھے
ان کے ساتھ
مرنا ہوتا تھا
حرم کی رانیوں کو
محل کی لونڈیوں کو
گھربار کی باندیوں کو
شاہی پہرہ داروں کو
فوج کی ایک پوری پلٹن کو
گھوڑوں اور خچروں کو
کتوں اور بلیوں کو

یہ رسم جاری رہی
اس روز تک
جب ایک مجسمہ ساز کو
ایک انوکھی تجویز سوجھی
زندوں کی جگہ پر
مجسموں کو بادشاہ کی
قبر میں دفن کرنے کی
بادشاہ کی زندگی میں
سارے مجسمے تیار کئے گئے
ان لوگوں کے
جنہیں وہ اگلے جہان میں
اپنی معیت میں دیکھنا چاہتا تھا

ایک وسیع و عریض قبر میں
ان کو ایستادہ کر دیا گیا
بادشاہ کی موت کے
انتظار میں

اور جب بادشاہ مرا
تو خوشیاں منائی گئیں
ماتم کی بجائے
کیونکہ رانیوں اور درباریوں
محل کے باسیوں اور
ہزاروں لشکریوں کی
جانیں بچ گئیں

صرف مجسمہ ساز کی جان
نہ بچ سکی
اس کو بادشاہ کے دائیں ہاتھ پر
زنجیروں سے جکڑ دیا گیا
قبر پر منوں مٹی ڈالنے سے پہلے

اسے اگلے جہان میں
مجسموں میں روح پھونکنی ہوگی
اور شاید بادشاہ کو
مزید لشکریوں کی ضرورت پڑ جائے

مالک رام مرحوم کا مذہب

منیر الدین احمد

جناب مالک رام کا نام میں نے تقسیم ملک سے پہلے روزنامہ "الفضل" قادیان میں چھپنے والے ایک علمی اشتہار میں پہلی بار دیکھا تھا، جو سالہا سال تک چھپتا رہا تھا اور جس میں اولاد نرینہ کے خواہش مندوں کے لئے بتائی جانے والی دوائی "زوجام عشق" کے لئے آپ کے تعریفی خط کا حوالہ دیا جاتا تھا، جو آپ نے اسکندریہ (مصر) سے لکھا تھا۔ اس مسلم ہندو نام نے میرے اندر دلچسپی پیدا کی اور میں نے ان کے بارے میں جاننا چاہا۔ پتا چلا کہ موصوف پہلے آریہ سماجی تھے، پھر احمدیت کا لٹریچر پڑھ کر مسلمان ہو گئے تھے۔ اس بات کا علم مجھے بہت بعد میں جا کر ہوا کہ وہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک آریہ سماجی ہفتہ وار "آریہ گزٹ" کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ جو لوگ مرزا غلام احمد قادیانی کی آریہ سماج کے ساتھ مذہبی مجادلات اور موصوف کے پنڈت لیکھرام کے ساتھ ہونے والے مباہلہ کی تفصیلات سے واقف ہیں وہ ہی سمجھ سکتے ہیں کہ دونوں فرقوں میں اپنے مدمقابل کے لٹریچر کا مطالعہ کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جناب مالک رام نے جماعت احمدیہ کے لٹریچر کا مطالعہ جارحانہ جذبات کے تحت کیا ہوگا مگر اسلامی تعلیم کے حسن کا شکار ہو کر خود اسلام کے نزدیک آ گئے تھے۔

ان کے مسلمان ہونے کا حتمی ثبوت اس وقت ملا، جب مجھے ۱۹۷۱ء میں اقوام متحدہ کے ایک ذیلی ادارہ کی طرف سے قاہرہ (مصر) بھیجا گیا۔ وہاں پر میری ملاقات الاستاذ محمد بسیونی سے ہوئی، جن کی قیام گاہ پر جماعت احمدیہ قاہرہ کے ممبران جمعہ کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ الاستاذ بسیونی اردو سہولت کے ساتھ پڑھ سکتے تھے اور اپنا خطبہ مرزا غلام احمد قادیانی کی کتب کی روشنی میں تیار کرتے تھے۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ ان کو اردو جناب مالک رام نے سکھائی تھی جو لمبے عرصہ تک اسکندریہ میں قیام پذیر رہے تھے اور نماز جمعہ کی ادائیگی جماعت احمدیہ کی معیت میں کرنے کی خاطر خاص طور پر قاہرہ آیا کرتے تھے۔ الاستاذ بسیونی نے ان کی مدد سے مرزا غلام احمد قادیانی کی متعدد کتب پڑھی تھیں اور جماعت احمدیہ کے دوسرے لٹریچر، بالخصوص مرزا بشیر الدین محمود احمد کی تفسیر کبیر کا مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے ہی مجھے بتایا کہ جناب مالک رام کے ہاں پہلے دو لڑکیاں (وشا اور ارونا) پیدا ہوئیں۔ نرینہ اولاد کی طلبی خواہش کو پورا کرنے کے لئے قادیان کے ایک دواخانہ سے دوا منگوا کر استعمال کرتے رہے۔ پھر مرزا غلام احمد قادیانی کے خلیفہ اول حکیم مولوی نور الدین بھیروی کے ذوقی نسخے پر عمل کرتے ہوئے تیسری لڑکی کا نام بشریٰ (یعنی خوشخبری) رکھا، جس کے بعد ان کے ہاں دو بیٹے آفتاب اور سلمان پیدا ہوئے۔ اگر میرا حافظہ مجھے دھوکہ نہیں دیتا تو انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ نام خلیفہ ثانی مرزا بشیر الدین محمود احمد کے تجویز کردہ تھے، جن سے برکت حاصل کرنے کی خاطر نام رکھنے کی درخواست کی گئی تھی۔

جناب ڈاکٹر مختار الدین احمد (علی گڑھ) اس سلسلے میں رقم طراز ہیں کہ ان کے یورپ میں تعلیمی قیام سے واپسی کے وقت موصوف قاہرہ سے دہلی آ چکے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ دہلی میں ان سے مل کر آگے علی گڑھ جائیں۔ چنانچہ ان کے گھر پر رات گزارنے کے بعد اگلی صبح کا احوال یوں بیان ہوا ہے۔

"صبح سویرے ہی بچوں نے پوچھا "سلمان فارسی" یا "سلمان ہندی"۔ ہنس کر بولے "سلمان ہندی"۔ چائے پلائی۔ ان کی بڑی بیٹی "وشا" مجھے یاد تھی لیکن اور بچوں کے نام حافظے میں نہ تھے۔ ایک صاحبزادے آئے، سلام کر گئے۔ اپنا نام "آفتاب" بتایا۔ پھر دوسرے صاحب آئے۔ میں نے نام پوچھا۔ بولے "سلمان"۔ دوسری صاحبزادی گزریں، آداب بجا لائیں، انہوں نے نام "بشریٰ" بتایا۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ مالک رام صاحب بھانپ گئے۔ بولے آپ کو کچھ تعجب ہوا اس نام پر؟ پھر خود ہی انہوں نے بتایا کہ ان کے یہاں لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوتی تھیں۔ انہوں نے اسی زمانے میں ایک بزرگ (برسوں بعد ایک موقع پر انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کے خلیفہ کا نام بتایا) کے ملفوظات میں پڑھا کہ اگر لڑکی کا نام صدق نیت سے "بشریٰ" رکھ دیا جائے تو پھر لڑکی کے بجائے لڑکا پیدا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے نومولود لڑکی کا نام "بشریٰ" رکھ دیا۔ اس کے بعد ان کے یہاں لڑکا ہی پیدا ہوا، جن کا نام انہوں نے "آفتاب" اور "سلمان" رکھے۔ مالک رام صاحب یہ نسخہ کئی احباب کو بتا چکے ہیں اور سب اس کے تیر بہدف ہونے کے قائل ہیں۔"

"وہ اس زمانے کا بہت دلچسپ لطیفہ سناتے ہیں۔ بچے کی پیدائش پر والدہ صاحبہ آئیں۔ بچے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ پوچھا کیا نام رکھا ہے۔ بولے۔ "آفتاب"۔ انہوں نے کچھ منہ بنایا اور کچھ حیرت کا اظہار کیا۔ کہنے لگیں۔ "یہ نام تو کچھ مسلمانوں جیسا لگتا ہے؟" بولے "اماں جان، آپ نے بھی تو میرا نام کچھ مسلمانوں جیسا رکھا تھا۔""

(مختار الدین احمد۔ "مالک رام۔ ایک تعلق کا سفرنامہ"۔ اس مضمون کی فوٹو کاپی میرے پاس موجود ہے جو مجھے جناب ڈاکٹر مختار الدین احمد نے خود بھجوائی تھی مگر جس پر یہ درج نہیں ہے کہ یہ مضمون کس رسالے یا اخبار میں چھپا تھا)۔

جناب گیان چند جین نے لکھا ہے کہ "ایک بار میں نے ان کے یہاں ان کی پانچ چھ سالہ نواسی (پوتی) کو دیکھا۔ انھوں نے بتایا کہ اس کا نام اُمّ انشاء ہے۔" (گیان چند جین۔ "مرحوم مالک رام کا مذہب (ناتھ رام سے عبد

لما لک تک)"۔ہماری زبان۔نئی دہلی ۲۲فروری۱۹۹۲ء)

روایت ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد وہ اسلامی نام اختیار کرنا چاہتے تھے۔چنانچہ اس سلسلے میں چوہدری انور احمد کاہلوں نے اپنی انگریزی کتاب "ظفر اللہ خان، میرے مربی" میں اپنے سفر یورپ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا جو انہوں نے اکتوبر ۱۹۳۹ء میں چوہدری ظفر اللہ خان کی معیت میں کیا تھا اور جس کے دوران اسکندریہ (مصر) میں ان کی ملاقات جناب مالک رام سے ہوئی تھی۔

"اگلی رات ہم لوگ اسکندریہ میں ٹھہرے۔وہاں پر حکومت ہند کے ٹریڈ کمشنر مسٹر مجید ہمارے استقبال کو موجود تھے۔ان کے ساتھ ان کے سٹاف کے ایک رکن مالک رام بھی تھے، جو گہرے مطالعہ کے بعد احمدی ہو گئے تھے۔ احمدیت کی آغوش میں آنے کے بعد انہوں نے حضرت امام جماعت احمدیہ ثانی سے درخواست کی کہ وہ ان کا کوئی دینی نام تجویز فرمائیں۔حضرت صاحب نے انہیں بتایا کہ حضرت صاحب کو اس نام میں کوئی غیر دینی بات نظر نہیں آتی، اس لئے یہی نام رہنے دیں۔اس وقت اسکندریہ میں ان کی والدہ محترمہ ان کے ہمراہ رہتی تھیں، مگر وہ بدستور ہندو رہیں۔ان کے لئے کھانا علیحدہ رسوئی میں پکتا رہا کیونکہ وہ اپنے غیر ہندو بیٹے کے باورچی خانے میں پکی ہوئی کوئی چیز کھانے کی روادار نہ تھیں۔وہ اپنا کھانا خود ایک عارضی سی رسوئی میں تیار کرتی تھیں۔" (بحوالہ۔پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی۔سویڈن۔"مالک رام کا ذکر خیر"۔روزنامہ "الفضل"۔ربوہ ۴ستمبر ۱۹۹۷ء)

جناب مالک رام کو مصر بھیجنے میں چوہدری ظفر اللہ خان کا ہاتھ تھا، جس کا ذکر جناب جلیل احمد قدوائی نے ایک تحریر میں کیا ہے جو جناب مالک رام کی وفات پر چھپی تھی۔

"یہ خبر عام تھی کہ مالک رام سر ظفر اللہ خان (اس زمانے میں وائسرائے کی کونسل کے ممبر محکمہ تجارت) کے بڑے چہیتے ہیں۔اور ان کی اسلامی تقاریر کے لئے یہی مشری مواد فراہم کرتے ہیں۔سر ظفر اللہ خان سے قربت روابط کی بنا پر اکا دکا لوگ یہ کہتے بھی سنے جاتے تھے کہ وہ مسلمان ہو چکے ہیں۔مگر مصلحتاً اعلان نہیں کرتے۔ (اس وقت تک متحدہ ہندوستان میں کم از کم پنجاب سے باہر احمدی یا قادیانی احباب کو شدت کے ساتھ خارج از اسلام نہیں قرار دیا گیا یا سمجھا جاتا تھا)----

پیروی کی ملازمت میں وہ غالباً چند ماہ ہی رہے۔پھر سنا کہ وہ اسکندریہ جانے والے ہیں۔میں نے اس واقعہ کی تحقیق نہیں کی نہ معلوم ہوا کہ غالب کے سلسلہ میں وہ کیا کر رہے ہیں۔مگر غالباً شملہ ہی میں یہ خبر گرم ہوئی کہ ظفر اللہ خاں صاحب کے پاس اسکندریہ کے ٹریڈ کمشنر کی طرف سے ایک ایسے مسلمان کی مانگ آئی ہے جو نہ صرف عربی لکھنے اور بولنے میں اہل اسکندریہ سے ٹکر لے سکے بلکہ اسلام اسلامی تاریخ اور عربی ادب کا بلند مذاق بھی رکھتا ہو۔پھر معلوم ہوا کہ ظفر اللہ خاں صاحب نے ٹریڈ کمشنر کو جواب میں لکھا یہاں پر کوئی مسلمان ایسا نہیں مل سکتا۔اس لئے میں ایک ہندو مالک رام کو مقرر کر کے بھیج رہا ہوں جو سیکڑوں مسلمانوں پر بھاری ہے۔چنانچہ یہ مصر چل دیئے۔"

(قومی زبان، کراچی۔مئی
۳۰۔اپریل ۱۹۹۲ء)

اس کتاب کا عملی ثبوت کہ وہ کئی مسلمانوں سے بڑھ کر عربی اور دینیات اسلامی کا علم رکھتے تھے، پروفیسر کلیم سہرامی، راجشاہی یونیورسٹی (بنگلہ دیش) کے مضمون "مالک رام----ایران سے ہندوستان" میں ملتا ہے جہاں پر وہ رقم طراز ہیں۔

"۱۹۶۹ء جون آخر یا جولائی کا اوائل تھا۔تہران یونیورسٹی میں گرمیوں کی تعطیل تھی۔ایک دن ڈاکٹر اطہر دہلوی نے کہا کہ مالک رام تہران پہنچ گئے ہیں۔کل دن کے دس بجے تہران یونیورسٹی کے سامنے کتابوں کی دکان میں خریداری کے لئے آئیں گے۔اگر ملنا چاہتے ہو تو آ جاؤ۔میں نے کہا انہیں پڑھا تو بہت لیکن دیکھا نہیں، اس لئے ضرور آؤں گا۔چنانچہ حسب وعدہ بروقت تہران یونیورسٹی کے بالمقابل پہنچ گئے۔اطہر صاحب نے ایک سن رسیدہ لیکن دراز شخص، شیروانی ٹوپی میں ملبوس سے میرا تعارف کرایا (جو مالک رام تھے) وہ بہت خوش ہوئے۔پھر ہم دونوں مالک رام کے ساتھ کتابوں کی دکان کا چکر لگاتے رہے----اس کے بعد یونیورسٹی کی نو تعمیر مسجد میں گئے، جس پر سنگ مرمر کی ایک تختی پر یہ الفاظ کندہ تھے کہ جنرل ایوب خاں صدر پاکستان نے اس کا سنگ بنیاد رکھا (تھا)۔پھر ہم ایک کشادہ صحن میں داخل ہوئے، جس میں وضو کے لئے حوض بنا ہوا تھا۔اس سے گزر کر اصل مسجد کا برآمدہ شروع ہوا جہاں ہم سب جوتے اتار کر مسجد کے اندرونی ہال میں داخل ہوئے۔چاروں طرف نظر دوڑائی گنبد کی چھت میں جلی خط نسخ میں عربی کی عبارتیں لکھی ہوئی تھیں۔ڈاکٹر اطہر نے مالک رام صاحب کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہوئے کہا کہ یہ دیکھئے خطاطی کا فن اب بھی ایران میں زندہ ہے۔کلام پاک کی آیتیں کس قدر دلکش انداز میں لکھی ہوئی ہیں۔مالک رام صاحب نے ایک نظر دوڑائی اور چند منٹ کے بعد فرمایا کہ یہ کلام اللہ کی آیات نہیں ہیں۔مجھے بڑی تعجب ہوا کہ ایک مسلمان کے نزدیک یہ کلام مجید کی آیتیں ہیں اور ایک غیر مسلم کے خیال میں نہیں----

ہم لوگ مسجد سے باہر نکلے تو نہایت ادب کے ساتھ مالک رام صاحب سے استفسار کیا کہ اگر ان کا تعلق کلام اللہ سے نہیں (تو) وہ کیا ہیں۔انہوں نے مسکرا کر فرمایا پہلے تم بتاؤ۔میرا ذہن شیعی دینیات کی طرف منتقل ہو گیا۔میں نے کہا "نادِ علی" جس کا تعلق شیعی اعتقاد سے ہے۔انہوں نے فوراً میری تائید کی اور بہت خوش ہوئے۔"

(قومی زبان۔کراچی۔ص ۱۲۸۔اپریل ۱۹۹۲ء)

جہاں تک ان کے مسلمان ہونے کا تعلق ہے میرے لئے اس سلسلے میں الاستاذ محمد بسیونی کی گواہی کافی ہے۔ اس کا ذکر میری خودنوشت "ڈھلتے سائے" میں ذیل کے الفاظ میں ہوا ہے۔

"میں نے پوچھا۔ کیا مالک رام مسلمان تھے؟ اس پر بسیونی صاحب نے کہا کہ جو شخص سالہا سال تک ہمارے ساتھ مل کر نمازیں پڑھتا ہو اور جس نے اپنے بچوں کو اسلامی نام دیے ہوں اور بچے اپنے آپ کو پیدائشی مسلمان کہتے ہوں، اس کی مسلمانی کے بارے میں کیسے شبہ کیا جا سکتا ہے؟ پھر مالک رام نے "عورت اور اسلامی تعلیم" کے عنوان سے ایک کتاب بھی لکھی تھی، جس کا ایک نسخہ بسیونی صاحب کے پاس موجود تھا۔ انھوں نے یہ نسخہ، جس میں مالک رام نے کتابت کی غلطیاں اپنے قلم سے درست کر رکھی تھیں، مجھے عنایت کر دیا۔ بسیونی صاحب نے اس کا ترجمہ عربی میں کیا تھا، جو الاخوان المسلمون کے پریس میں چھپنے والا تھا، جب ۱۹۵۶ء میں الاخوان المسلمون کو حکومت نے غیر قانونی قرار دے کر ان کی تمام املاک ضبط کر لیں، تو پریس میں موجود سارے مسودے بھی اٹھا لیے گئے تھے، جن میں مالک رام کی کتاب کا عربی ترجمہ بھی شامل تھا۔ آگے چل کر اس کتاب کا ترجمہ ایک سکھ عالم نے کیا تھا، جو آج بھی مصر کے کتب خانوں میں مل جاتا ہے۔ مالک رام کی زندگی میں اس کتاب کا اردو ایڈیشن دوسری بار ہندوستان سے چھپ گیا تھا۔ اس کتاب کو پڑھنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مالک رام کو قرآن اور حدیث و سنت پر کس درجہ عبور حاصل تھا۔ بسیونی صاحب کو انھوں نے بتایا تھا کہ وہ ایک آریہ سماجی خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور ابتدا میں آریہ سماج کے ایک رسالے کے مدیر رہے تھے، جس میں اسلام کے خلاف بہت زہر اگلا جاتا تھا۔ مگر جب ان پر اسلام کی تعلیم کی حقیقت روشن ہو گئی تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ زندگی وہ اس دین کی خدمت میں بسر کریں گے۔
"

(شمیم الدین احمد "ڈھلتے سائے"۔لاہور ۲۰۰۶ء ص ۳۲۵)

باقاعدگی کے ساتھ باجماعت نمازیں پڑھنے کی تصدیق الاستاذ بسیونی کے بیان سے ہو چکی ہے۔ اب رمضان میں روزہ رکھنے کا ذکر جناب ڈاکٹر رشید احمد جالندھری (مدیر اعلیٰ معارف۔لاہور) کی معرفت سن لیں۔

"قاہرہ میں ان کی ملاقات مالک رام سے ہوئی۔ چند ملاقاتوں کے بعد جب تعلقات استوار ہوئے، تو ایک دن مالک رام نے ان سے کہا کہ آپ کسی روز فیملی کے ساتھ ہمارے ہاں آیئے اور میرے ساتھ روزہ افطار کیجئے۔ انہوں نے معذرت کر لی۔ اس پر مالک رام نے کہا تو پھر آپ کسی روز ہمیں بلایئے کہ روزہ آپ کے ساتھ افطار ہو۔" (ڈاکٹر محمد سلیم پنجاب یونیورسٹی لاہور "مالک رام کے انتقال پر"۔روزنامہ جنگ لاہور ۹ جنوری ۱۹۹۴ء)

جناب شیخ منظور الٰہی اپنی کتاب "سلسلۂ روز و شب" میں جناب مالک رام سے دہلی میں ان کے گھر پر اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب شیخ صاحب نے کہا کہ عربی فارسی میں بھی آپ کے علم کا شہرہ ہے تو اس کے جواب میں جناب مالک رام صاحب نے کہا۔

"فارسی کے ساتھ شناسائی پھالیہ مڈل سکول سے ہو چکی تھی۔ گجرات کالج میں داخل ہوا تو فارسی شاعری کی شیرینی بہا کے لے گئی۔ وزیر آباد تو احباب کے پاس اسلامی کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ شملہ میں ایک دوست سے تیرہ سیپارے با ترجمہ پڑھے۔"

"آپ کی ملازمت کا بیشتر حصہ اسلامی ممالک میں گزرا۔"

"جنگ عظیم سے کچھ عرصہ پہلے محکمہ تجارت کی طرف سے سکندریہ میں تعینات ہوا تھا۔ وہاں تین برس رہا، پھر بغداد، انقرہ، قاہرہ میں رہا۔ میرا شوق دیکھ کر مہربان عرب دوست پڑھانے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ میں نے کلام الٰہی اور احادیث کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔"

دوران گفتگو دلیل دیتے وقت مالک رام بڑے اطمینان سے کلام الٰہی اور احادیث کے حوالے دے رہے تھے۔" (بحوالہ پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی۔"مالک رام کا ذکر کرو"۔الفضل۔ربوہ ۳ ستمبر ۱۹۹۷ء)

قرآن کریم کے ساتھ ان کا شغف اس درجہ تھا کہ وہ دوسروں کو پڑھانے کے لئے وقت نکالنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ چنانچہ جناب جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں۔

"غالباً ۱۹۴۲ء میں میں نے قرآن شریف پڑھنے کا عزم کیا۔ ظاہر ہے کہ مالک رام سے بہتر قرآن پڑھانے والا کہاں سے میسر آتا۔ میں نے ان سے درخواست کی۔ انہوں نے قبول کر لی۔

کیا پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اس زمانے میں وہ مولانا آزاد کی تصانیف "ترجمان القرآن"، "غبار خاطر" اور "تذکرہ" کی ترتیب و حواشی کے کام میں مصروف تھے۔ اور اس سلسلہ میں ساہتیہ اکیڈمی کے دفتر میں بیٹھا کرتے تھے۔ میں قریب ہی پریس انفارمیشن بیورو میں انفارمیشن آفیسر تھا۔ طے پایا کہ میں لنچ کے اوقات میں ان کے پاس پہنچ جایا کروں گا۔ میں نے پابندی کے ساتھ ان کی خدمت میں پہنچنا شروع کیا اور کلام پاک پڑھنے کی میری دیرینہ آرزو پوری ہونے لگی۔---

اس ضمن میں جو بات مجھے آج تک متاثر کر رہی ہے اور جس پر میں آج تک عمل پیرا ہوں یہ ہے کہ مالک رام صاحب نے سورۃ فاتحہ شروع کرانے سے قبل مجھے قرآن شریف کو ہاتھوں میں اٹھانے اور میز پر رکھنے کے آداب سے آشنا کیا۔ کلام پاک کا احترام تو مجھے ابتدا ہی سے گھر میں سکھایا گیا تھا۔ لیکن مالک رام صاحب نے میری تعلیم قرآن کی ابتدا اس احترام سے کی اور سورۃ

تاخیر پڑھنے سے قبل ہی مجھے دو مذہب سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔"

("مالک رام" ص ۱۔ "کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کچھ دن اور"۔ بحوالہ ماہنامہ قومی زبان۔ کراچی۔ ص ۱۰۲۔ اپریل ۱۹۹۴ء)

جناب مالک رام کے مذہب کے بارے میں بہت سی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں ایک واقعہ بہت دلچسپ لگا، جو جناب گیان چند جین نے بیان کیا ہے آپ لکھتے ہیں۔

"ان کے عقیدے کے سلسلے میں قادیانیت کی بات بے وجہ نہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے مجھے بتایا کہ ۲۵۔۳۰ سال پہلے وہ مالک رام سے پہلی بار ملنے ان کے گھر جانے والے تھے۔ نثار احمد فاروقی نے شرارتاً انہیں سمجھایا کہ مالک رام قادیانیت کے خلاف باتیں سن کر خوش ہوتے ہیں۔ تم ان کی خوشنودی چاہو تو ان کے سامنے قادیانیت پر تنقید کرنا۔ خلیق انجم جھانسے میں آگئے اور مالک رام صاحب کے سامنے قادیانیت کی سخت مذمت کی۔ اس پر مالک رام پھر اُن کے روزمرہ میں پیچھے میں آگئے جیسے خلیق انجم کی جان لے لیں گے۔"

("مرحوم مالک رام کا مذہب (ناتھو رام سے عبدالمالک تک)"۔ ہماری زبان۔ نئی دہلی۔ ۲۲ فروری ۱۹۹۴ء)

اس بارے میں جماعت احمدیہ کے آرگن "الفضل"، ربوہ نے جناب ڈاکٹر محمد سلیم۔ پنجاب یونیورسٹی کا مضمون "مالک رام کے انتقال پر"، جو روزنامہ جنگ، لاہور ۹ جنوری ۱۹۹۴ء چھپا تھا، نقل کرنے کے بعد مندرجہ ذیل اضافہ کیا تھا۔

ضروری نوٹ

"اس مضمون کے فاضل مصنف نے جو ایک قابل احترام شخصیت ہیں، مضمون ہٰذا کے آخر میں محترم مالک رام صاحب کی دین حق سے غیر معمولی وابستگی کا ذکر کر کے اس کا جواز تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

فی الحقیقت اس قسم کا کوئی جواز تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ محترم مالک رام ایک مخلص احمدی تھے۔ انہوں نے احمدیت قبول کرنے کے بعد اس کا علی الاعلان اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن قادیان کے رہنے والے احمدی اور دیگر متعدد احمدی احباب اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ہمارے ایک بزرگ اور محترم ہماری مکرم کیپٹن محمد عبداللہ صاحب نے ہمیں جماعت احمدیہ کی ایک اہم دستاویز کا حوالہ بھجوایا ہے جو ذیل میں درج ہے۔

"تحریک جدید انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ نے جون ۱۹۵۹ء میں ایک کتاب شائع کی تھی، جس کا نام ہے "تحریک جدید کے پانچ ہزاری مجاہدین" اس میں چندہ تحریک جدید میں حصہ لینے والے پانچ ہزار احمدی مخلصین کے نام درج ہیں جنہوں نے نومبر ۱۹۳۴ء سے لے کر اکتوبر ۱۹۵۳ء تک اس چندہ کی ادائیگی کی تھی۔ اس کتاب کے صفحہ نمبر ۲۸۰ پر فراوانیا کے عنوان کے تحت نیچے دوسری سطر میں محترم مالک رام صاحب کا نام بھی بہ تفصیل ذیل درج ہے۔

چوہدری مالک رام صاحب ایم۔ اے (اسکندریہ)۔ میزان رقوم ۷۔۱۷۔۲۹۷ روپے۔ کیفیت ۱ تا ۱۲ سال۔

اس کتاب میں فہرست کے آخر میں یہ نوٹ درج ہے۔

"یاد رہے آپ کا نام صرف اسی جگہ ملے گا جہاں سے آپ نے ۱۹ویں سال کا وعدہ کیا تھا۔ اس جگہ کی جماعت یا براہ راست حلقہ افراد میں اپنا نام تلاش کریں۔"

یاد رہے کہ محترم مالک رام صاحب ایک خاصا عرصہ قاہرہ اور اسکندریہ میں رہے۔ جہاں آپ وزارت خارجہ بھارت کی ملازمت کے دوران متعین تھے۔"

(روزنامہ الفضل۔ ربوہ ۳ فروری ۱۹۹۴ء)

دلچسپ امر مجھے یہاں پر یہ نظر آتا ہے کہ جب مرزا بشیر الدین محمود احمد نے نومبر ۱۹۳۴ کو تحریک جدید کا اعلان کیا، جس کے تحت غیر ممالک میں اسلامی تبلیغ کا ایک جال پھیلایا جانا تھا اور جس کے لئے تمام احمدیوں کو چندہ دینے کی تحریک کی گئی تھی تو اس وقت بھی جناب مالک رام "ریاستی وفادار" آریہ گزٹ" کے مدیر تھے۔ چونکہ "تحریک جدید انجمن احمدیہ" کے ریکارڈ کے مطابق آپ پہلے سال سے وعدہ کنندگان میں شامل تھے اور آئندہ تیرہ برس تک باقاعدگی کے ساتھ چندہ ادا کرتے رہے اس لئے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ آپ شروع سے شامل تھے یا بعد میں کسی وقت شامل ہوئے تو پچھلے برسوں کے لئے بھی چندہ ادا کیا۔

جب میں ان کی زندگی میں پیش آمدہ واقعات پر نظر ڈالتا ہوں، تو میرے دل میں ان کے مذہبی مسلمان ہونے کے بارے میں ذرہ بھر شک پیدا نہیں ہوتا۔ جناب شیخ منظور الٰہی لکھتے ہیں۔

"باتوں باتوں میں ایک بین الاقوامی میلے کا ذکر آ گیا جو ---- میں منعقد ہو رہا تھا۔ وہاں جانے کے لیے میں ریل گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ کوئی صاحب رات کو آ کر سو گئے، صبح ناشتے کے وقت ڈائننگ کار میں ملاقات ہوئی۔ وہ فوجی وردی میں تھے اور رغبت سے ٹماٹر کھا رہے تھے۔ میں نے سوچا ممکن ہے بفر ملی ہوں سامنے نہ پایا تو مجھے خیال آیا یا م کی بفرانی کا نہیں ہو سکتا۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ مذہب کی رو سے تو یہ جانور حرام ہے۔"

"ارے صاحب اس زمانے میں جنس تھا جب گندگی کے ڈھیر پر پڑا رہتا تھا۔ اب تو اس کی پرورش سائنس کے اصولوں پر ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "منع کرنے والے کو معلوم تھا کہ ایسا وقت آئے گا جب اس کی پرورش سائنٹیفک طریقے سے ہوگی تب بھی منع فرما دیا۔" وہ صاحب چپکے ہو رہے جیسے میری بات کا یقین نہ آیا ہو۔ دوسرا واقعہ ایک پروفیسر صاحب

کے متعلق تھا جو مالک رام سے ملنے علی گڑھ سے آئے تھے۔ ماہ رمضان تھا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو میں نے کہا کھانا کھایئے۔ انہوں نے کہا میرا روزہ ہے۔

"آپ سفر میں ہیں روزہ قضا نہ کیا؟"

"قضا کرلیں تو دوبارہ رکھنے میں سستی ہو جاتی ہے اور آج کل سفر کون سا سفر ہے۔"

"اجازت دینے والے کو معلوم تھا کہ سفر کٹھن ہو جائیں گے بہر حال حاکم اعلیٰ کی اجازت بھی حکم کے مترادف ہوتی ہے۔"

اس پر میں نے عرض کیا کہ مجھے کسی نے یہ مسئلہ یوں سمجھایا تھا کہ یہ دوست (اور اپنے دوست) کی طرف سے تحفہ ہے اسے قبول نہ کرنا سوء ادب ہے۔ مالک رام صاحب یہ بات سن کر محظوظ ہوئے۔"

(بحوالہ پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی۔ "مالک رام کا ذکر خیر"۔ الفضل ربوہ ۲۴ ستمبر ۱۹۹۴ء)

گیان چند جین ان کی کتاب "اسلامیات" کو پڑھنے کے بعد یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ

"کتاب اسلامیات میں وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کی نظر میں اسلام ہی بہترین مذہب ہے۔ اسلامی تاریخ و قرآن و حدیث پر ان کی کتنی گہری نظر تھی یہ دیکھ کر عش عش کرنا پڑتا ہے۔"

اسی مضمون میں دوسری جگہ پر آپ لکھتے ہیں۔

"لیکن اسلامیات کے مضامین کو پڑھ کر یہ ماننا پڑے گا کہ ان کے نزدیک اسلام نہ صرف بہترین مذہب ہے بلکہ یہی سب سے سچا مذہب ہے۔ یعنی وہ دل سے مسلمان تھے لیکن کسی مصلحت کی وجہ سے باقاعدہ تبدیلی مذہب نہیں کی۔"

(گیان چند جین۔ "مرحوم مالک رام کا مذہب (ناتھو رام سے عبدالمالک تک)"۔ ہماری زبان۔ نئی دہلی ۲۲ فروری ۱۹۹۴ء)

مالک رام صاحب کی کتاب اسلامیات میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں۔

☆ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ
☆ الاسلام
☆ اسلامی خلافت
☆ خلق عظیم
☆ افصح العرب
☆ عورت مذاہب عالم میں

کیا فی الواقعہ جناب مالک رام نے عملی طور پر ایک مسلمان کی زندگی بسر نہیں کی؟ نماز روزے کے وہ پابند تھے اور دوسروں کو بھی اس پابندی کی تلقین کرتے تھے۔ پروفیسر نثار الدین احمد کی گواہی ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

"میں نے ایک بار انہیں لکھا کہ میرے کام وقت پر نہیں ہوتے۔ سیمینار کا مقالہ آخری رات لکھتا ہوں۔ اور ریڈیو کی تقریر کا کچھ حصہ ٹرین پر اور کچھ قیام گاہ پہنچ کر مکمل کرتا ہوں۔ بہت سے کام یا تو ہوتے نہیں یا ادھورے رہ جاتے ہیں۔ کوئی ترکیب بتایئے۔ جواب حسب معمول فوراً آیا۔ انہوں نے لکھا آپ کے مرض کا علاج میں بتا رہا ہوں۔ کرنا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔ آپ نمازیں پابندی سے وقت پر پڑھیں اور زیادہ بہتر ہو اگر پانچوں وقت کی نمازیں مسجد جا کر با جماعت ادا کریں۔ میں حیران ہوا کہ یہ مشورہ مالک رام دے رہے ہیں یا بہار کے مشہور محقق اور عالم حدیث عالم مولانا عبدالمالک آروی۔"

(پروفیسر نثار الدین احمد۔ "مالک رام۔ کچھ ذاتی تاثرات"۔ آج کل۔ نئی دہلی۔ اپریل ۱۹۹۴ء)

پھر اسی پر بس نہیں۔ ذیل کی تحریر، جو جناب مالک رام کے قلم سے نکلی ہے میرے نزدیک کسی غیر مسلم کی نہیں ہو سکتی۔

"رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا میرا وظیفہ حیات رہا ہے۔ مجھے حق حاصل ہے کہ اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا کروں، جس نے اتنے ڈھیر سے علوم سے میری علمی پیاس بجھانے کا سامان پیدا کیا۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ۔ میں نے اپنی بساط بھر اس کے حکم وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ کی تعمیل میں اس علم کی نشر و اشاعت میں کوتاہی نہیں کی۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ غرض پوری زندگی تین لفظوں میں محدود ہے۔ خام بودم پختہ شدم سوختم۔ میں کیسے یقین دلاؤں کہ میرا بال بال اپنے رب ودود کا شکر گزار ہے۔ میں اپنی ابتدا جانتا ہوں اور جو کچھ میں آج ہوں، میں اس سے واقف نہیں۔ لب سفر کنارے پر آن لگا ہے۔ صرف یہی دعا کرتا ہوں۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔"

(پروفیسر نثار الدین احمد۔ "مالک رام۔ کچھ ذاتی تاثرات"۔ آج کل۔ نئی دہلی۔ اپریل ۱۹۹۴ء)

رسالہ "آج کل" نئی دہلی میں جو اداریہ جناب مالک رام کی وفات پر چھپا تھا، اس میں سے ایک اقتباس۔

"قرآن شریف کا بہت سا حصہ انہیں زبانی یاد تھا۔ احادیث کی کتب ان کے مطالعہ میں اکثر رہا کرتی تھیں۔ اسلام کے فلسفے سے وہ کلی طور پر واقف تھے۔ اور انہوں نے اسلام میں عورتوں کے حقوق جیسے مسائل پر ہم عصر علماء سے کہیں زیادہ باریکی سے روشنی ڈالی۔ "نقوش" کے "سیرت نمبر" میں "لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" کے عنوان سے شائع ان کا مضمون ان کے احساسات کی غمازی کرتا ہے۔"

(آج کل نئی دہلی۔ اپریل ۱۹۹۴ء)

جناب ضیاء الدین اصلاحی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ کے ایک مکتوب سے اقتباس، جو ہماری زبان، نئی دہلی، میں چھپا تھا۔

"میرے کانوں میں بھی اس کی بھنک پڑی تھی کہ ان کو قادیانی کہا جاتا ہے۔ اسی لیے کئی بار جی چاہا کہ ان کے دین و مذہب کے بارے میں ان سے براہ راست دریافت کروں، مگر اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ان کی وفات سے دو تین برس پہلے ایک دفعہ کچھ اسی طرح کی باتیں ہو رہی تھیں تو میں یہ عرض کر ہی بیٹھا کہ آپ کے عقیدہ و مذہب کے بارے میں عجیب عجیب باتیں سننے میں آتی ہیں۔ فرمایا جی ہاں، میں بھی سنتا ہوں۔ کچھ لوگ مجھے قادیانی کہتے ہیں۔ اور بھی باتیں میری نسبت کہی جاتی ہیں۔ خیر لوگ جو بھی کہیں مجھے اللہ تعالےٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہ مجھے بخش دے گا۔ اس کے آگے مجھے کچھ کہنا یاد نہیں ہوا"

(ہماری زبان۔ نئی دہلی۔ ۸ اپریل ۱۹۹۴ء)

میرا ذاتی خیال ہے کہ جناب مالک رام دل و جان سے احمدی تھے۔ البتہ اس جماعت کی پاک و ہند میں مخالفت کے سبب اس امر کا اعلان کرنے سے کتراتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنے قیام مصر کے دوران نماز جمعہ کی ادائیگی کے لئے ہر ہفتے اتنا لمبا سفر کر کے اسکندریہ سے قاہرہ کیوں آتے اور وہاں پر جماعت احمدیہ کے اراکان کے ساتھ مل کر نماز جمعہ کیوں ادا کرتے۔ جامع مسجد اسکندریہ میں موجود ہے جہاں پر مسلمان نماز جمعہ پڑھنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ جناب مالک رام سانی کے ساتھ اپنے شہر میں عامۃ المسلمین کے ساتھ مل کر نماز جمعہ ادا کر سکتے تھے۔ ان کا یہ معمول اس وقت بھی رہا جب ان کی تعیناتی آگے چل کر قاہرہ میں ہوئی۔

ایک سوال، جو میرے دوست جناب منصور الٰہی شیخ (ریڈ فورڈ) کی رائے میں بہت اہم ہے یہ تھا کہ آیا جناب مالک رام کی تدفین اسلامی طریق سے ہوئی تھی یا ان کا جسد خاکی نذر آتش کیا گیا تھا۔ اس بارے میں جناب ڈاکٹر نثار الدین احمد نے اپنے خط نام گیان چند جین میں لکھا تھا۔

"مالک رام میں عرفت کافی تھی۔ انہوں نے کچھ صاف کہنے کی بجائے محققین کرام کے لئے طبع آزمائی کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ وہ نذر آتش کئے گئے۔ معلوم نہیں ان کی مرضی کیا تھی۔ وصیت نامہ ان کی اہلیہ کے قول کے مطابق ان کے بیٹوں کی آمد پر کھلے گا۔ اس میں کچھ ذکر ہو مجھے اس کی توقع نہیں۔"

ان کی وفات پر منعقد ہونے والی محفل تعزیت کا احوال جناب کمال احمد صدیقی کی زبانی سنیے۔ لکھتے ہیں۔

"مالک رام کی وفات پر میں ان کے یہاں گیا اور پنڈال میں بھی حاضری دی۔ آغاز قرآن خوانی سے ہوا۔ جس میں ڈاکٹر سید عابد علی اور جناب ایم حبیب خاں نے بھی شرکت کی تھی۔ اور یہ انتظام بھی شاید جناب ایم حبیب خاں ہی نے کیا تھا۔ مالک رام کے جسد خاکی کو سپرد آتش کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود قرآن خوانی ہوئی اور اس پر کسی کو اعتراض نہیں تھا۔"

(کمال احمد صدیقی۔ "مرحوم مالک رام کا مذہب"۔ ہماری زبان۔ نئی دہلی۔ ۸ اپریل ۱۹۹۴ء)

الاستاذ محمد بسیونی نے مجھے بتایا تھا کہ جناب مالک رام میری طرح حضرت امام احمد بن حنبل کی محبت سے سرشار تھے۔ اس بات کا ذکر ڈاکٹر نثار الدین احمد نے بھی اپنے مضمون "مالک رام۔ ذاتی تاثرات" میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ مالک رام صاحب کو امام احمد بن حنبلؒ سے گہری عقیدت رہی۔ ممکن ہے ان سے عقیدت پیدا کرنے میں مولانا آزاد کی خود نوشت "تذکرہ" کا کچھ دخل ہو۔ امام احمد بن حنبلؒ سے اپنی دلچسپی کا اظہار انہوں نے مجھ سے ۱۹۵۳ء میں اسکندریہ میں کیا تھا۔ میں جب ۱۹۵۳ء میں ہولینڈ (کذا ۔ درست ہالینڈ) میں مقیم تھا تو وہاں لائیڈن یونیورسٹی لائبریری کے ایک عربی مخطوطے میں امام صاحب کے مفصل حالات ملے۔ میں نے ان اوراق کا عکس انہیں بھیج دیا۔ یا کہ بہت مسرور ہوئے اور شکریے کا بہت اچھا خط انہوں نے تحریر کیا۔ انہوں نے مسند احمد بن حنبلؒ (جو ششم مجلدات میں ہے) ایک بار نہیں کئی بار پڑھی۔ یہ تبحر علم تو اس عہد کے دینی مدارس کے عالم کو بھی شاید ہی ملا ہو۔ امام احمد بن حنبلؒ سے ان کی شیفتگی دیکھ کر مجھے کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ مالک رام اگر کسی مسلمان خانوادے میں پیدا ہوتے تو ان کا گھرانہ حنفی یا شافعی یا مالکی ہوتا بھی تو وہ ترک کر کے حنبلی مسلک اختیار کر لیتے۔"

(پروفیسر نثار الدین احمد۔ "مالک رام۔ کچھ ذاتی تاثرات"۔ آج کل، نئی دہلی۔ اپریل ۱۹۹۴ء)

جناب پروفیسر نثار الدین احمد نے اپنے مضمون "مالک رام۔ ایک تعلق کا سفرنامہ" میں لکھا ہے کہ جناب مالک رام صاحب امام احمد بن حنبلؒ پر ایک مفصل اور جامع کتاب لکھنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ مجھے اس چیز کے پیچھے مولوی نور الدین بھیروی خلیفہ اول مرزا غلام احمد قادیانی کی ایک دیرینہ خواہش کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ یہ امر شاید بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مولوی نور الدین کو امام احمد بن حنبلؒ کے ساتھ ایک گونہ محبت تھی اور وہ چاہتے تھے کہ ان کی مسند کی تبویب صحیح بخاری کے انداز میں کی جائے۔ چنانچہ اس امر کا بیڑا آپ کے بیٹے مولوی عبدالمنان عمر نے اٹھایا، جو علی گڑھ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اور پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل تھے۔ جب وہ سالہا سال تک اس پروجیکٹ پر کام کر چکے اور ان کی علمی شہرت جماعت احمدیہ سے باہر بھی پھیلنے لگی تو مرزا بشیر الدین محمود احمد کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں یہ شخص ان کے بعد خلافت ثالثہ کے معاملے

میں ان کے بیٹے مرزا ناصر احمد پر بازی لے جائے۔ چنانچہ ان کا پتّا کاٹنے کے لئے ایک سازش کی گئی، جس کے تحت مولوی عبدالمنان عمر پر خلافت کے عہدے کا خواہاں ہونے کا الزام لگایا گیا۔ اس جرم کی پاداش میں ان کو جماعت ربوہ سے خارج کر دیا گیا۔ ان کے متوقع کارنامے تبویب مُسند احمد بن حنبل کا سدِباب کرنے کی خاطر یہ سکیم بنائی گئی کہ جماعت احمدیہ کے علماء کی ایک کمیٹی ہنگامی طور پر تبویب کا کام شروع کرے اور ایک ڈیڑھ سال کے اندر پہلی جلد شائع کر دی جائے۔ چنانچہ یہ کام ہنگامی طور پر سرانجام پایا، مگر پہلی جلد کے بعد کام ٹھپ ہو گیا، کیونکہ مقصد بازی لے جانا تھا نہ کہ علمی خدمت کرنا، جس کی جماعت احمدیہ میں روایت نہیں پائی جاتی۔

کچھ ایسی ہی صورت حال اس سے قبل بھی ایک بار پیش آ چکی تھی۔ جب خلیفہ اول مولوی نورالدین بھیروی کی وفات پر مولوی محمد علی، جو جماعت احمدیہ میں خلافت قائم کرنے کے خلاف تھے، اپنے متعدد ساتھیوں سمیت قادیان کو خیرباد کہہ کر لاہور منتقل ہو گئے اور جاتے ہوئے قرآن کریم کے انگریزی ترجمے کا پروجیکٹ اپنے ساتھ لیتے گئے، جس کو وہ جماعت احمدیہ کی طرف سے چلا رہے تھے۔ ان کا ترجمہ قرآن کریم قریب قریب مکمل تھا۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد کو خطرہ پیدا ہوا کہ لاہور سے ترجمہ قرآن کریم چھپ گیا، تو قادیانی جماعت علمی طور پر پیچھے رہ جائے گی۔ اس لئے فوری طور پر مختلف افراد پر مشتمل ایک قرآن بورڈ بنایا گیا، جس کو کہا گیا کہ ایک سال کے اندر اندر پہلے سپارے کا انگریزی ترجمہ چھاپ کر شائع کر دیں۔ اس طرح مولوی محمد علی کے ترجمہ سے پہلے قادیان کی طرف سے چھپنے والا پہلا سپارہ مارکیٹ میں آ گیا تھا۔ پورے قرآن کریم کے ترجمے کا کام مولوی شیر علی کے سپرد ہوا تھا، جن کو یہ کام مکمل کرنے پر مزید بیس سال لگ گئے۔

امام احمد بن حنبلؒ اسلامی تاریخ کی ایک نہایت ثقہ شخصیت تھے، جن کے ثبات کردار اور جرأت ایمانی کو دیکھتے ہوئے کون تاریخ دان ہوگا، جو متاثر نہ ہوا ہوگا۔ مجھے بھی ان کے ساتھ عشق کی حد تک عقیدت ہے۔ جس زمانے میں میں اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ جرمنی کی ہمبرگ یونیورسٹی میں لکھ رہا تھا، تو تاریخ بغداد کے مصنف الخطیب البغدادی کا امام احمد بن حنبلؒ کے لئے جوش و خروش مجھ میں سرایت کر گیا تھا اور قریب تھا کہ میں اسلامی نظام تعلیم پر مقالہ لکھنے کی بجائے محنۂ خلق قرآن اور بالخصوص امام احمد بن حنبلؒ پر ڈھائے جانے والے مظالم پر قلم اٹھاتا۔ پھر میری نظر سے والٹر پٹن کی کتاب Ahmad ibn Hanbal and the Mihna گزری، جس میں اس آشوب کا حال بیان ہوا ہے۔ اس سے میری تسلی ہو گئی اور میں نے اپنا عندیہ بدل دیا۔ اس لئے جب مجھے استاذ محمد بسیونی نے بتایا کہ جناب مالک رام بھی میری طرح امام احمد بن حنبلؒ کی محبت میں سرشار تھے تو مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی پذیرائی

واشنگٹن ڈی۔سی (امریکا) ۔۳ اگست۔ علیگڑھ المنائی ایسوسی ایشن نے ہندوستانی سفارت خانے کے اشتراک سے اس عہد کے ایک ممتاز اور منفرد ادیب اور شاعر ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے ایک مشاعرے اور کوی سمیلن کا اہتمام کیا جس کی صدارت ڈاکٹر شعیب قدوائی نے کی۔ اس موقع پر ایسوسی ایشن کے سیکریٹری اور تقریب کے منتظم ڈاکٹر ظفر اقبال نے مہمانوں اور شرکاء کا استقبال کیا اور تقریب کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ یہ تقریب اس لئے بھی اہم ہے کہ اسے برصغیر کی جشن آزادی سے جوڑ دیا گیا ہے۔ انہوں نے جنگ آزادی اور قومی یکجہتی میں شعراء اور ادیبوں کے کردار کو سراہتے ہوئے کہا کہ حالات کی دھوپ کتنی بھی کڑی ہو، سیاست کی نیرنگیاں کیسی بھی ہوں، یہ ہمارا شاعر ہی تو ہے جو قوم کو سہارا دیتے ہوئے کہتا ہے

اپنا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

تقریب میں علیگڑھ المنائی کی جانب سے ہندوستانی سفارت خانے کی کلچرل افیئرز کے منسٹر سنجے سنہا نے ڈاکٹر آنند کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایوارڈ پیش کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر عبداللہ نے ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی زندگی اور شاعری کا احاطہ کرتے ہوئے بتایا کہ انوکھا مطالعہ، اسلوب بیان، آزاد نظموں روایت کا استعمال ان کا کمال ہے۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر آنند کی نظموں میں امیجز' images کا بہاؤ ہے وہ ایک مرکزی استعارہ لیکر رنگ گیر چھوٹے چھوٹے images کو اکٹھا کر کے ایک visual picture بناتے ہیں اور ایک چلتی جاگتی اور کبھی کبھی ہلتی ہوئی بات سامنے نظر آتی ہے جو ان کے شعری متن کو مزید اجاگر کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے شکریہ کا اظہار کرتے ہوئے ایسوسی ایشن کی خدمات اور اس کے ساتھ اپنے دیرینہ تعلقات پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر انہوں نے ایک نعتیہ نظم اور تین ہندی نظمیں پڑھیں جو اپنے سادہ اور پُراثر اسلوب کی وجہ سے سامعین کا دل موہ لے گئیں۔ پاکستانی اور انگلش شاعر محمد انور نے ایک منظوم خراج تحسین ڈاکٹر آنند کی نذر کیا۔ تقریب کے پہلے حصے کا اختتام ڈاکٹر شعیب قدوائی کے کلمات سے ہوا۔ وقفہ نماز کے بعد مشاعرہ ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر رضی الدین نے انجام دیئے۔

رپورٹ: نصیر اعظم، ظفر اقبال (واشنگٹن ڈی۔سی)

لافانی عشق

منیر الدین احمد

اگر اس روز کوئی واقف کار مجھے اوہلسڈورف کے قبرستان میں داخل ہوتے ہوئے دیکھتا، تو یہی سمجھتا کہ میں کسی جنازے میں شرکت کرنے کے لئے آیا تھا۔ جب کہ اس چیز کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ میری آمد ایک ٹورسٹ کی طرح تھی، جسے سیاحت کا شوق شہر کے مختلف حصوں میں لئے پھر رہا تھا اور اب قبرستان کی باری آئی تھی۔ میرے لئے ہمبرگ کے قبرستان اوہلسڈورف میں داخل ہونے کا وہ پہلا موقع تھا۔ میں نے اس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اور کئی بار وہاں پر جانے کا ارادہ بھی باندھ چکا تھا۔ مگر ہمیشہ کوئی دوسرا کام آن آتا تھا اور مجھے اپنا پروگرام بدلنا پڑتا تھا۔ یہ بھی نہیں ہے کہ مجھے وہاں پر جانے کی کچھ ایسی جلدی تھی۔ قبرستان میں آخر سب کو ایک روز پہنچنا ہی ہے۔ آج نہیں، کل کو ہماری باری بھی آ جائے گی۔ مگر میتوں والی کالی گاڑی میں وہاں پر پہنچائے جانے سے پہلے میں خود اپنے قدموں سے چلتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ سب کچھ سچ ہے جو اس قبرستان کے بارے میں مشہور ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگ اسے باغ عدن قرار دیتے ہیں۔ بہر صورت ہمبرگ کے باغوں میں کوئی اس کا مثیل نہیں ہے۔

اوہلسڈورف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا رقبہ دنیا کے کسی بھی قبرستان سے بڑا ہے۔ اتنا بڑا کہ اس میں ایک دو چھوٹے موٹے شہر سما سکتے ہیں۔ اس میں پختہ سڑکیں بنی ہوئی ہیں۔ جن پر موٹر کاریں چلتی ہیں۔ چونکہ فاصلے اتنے لمبے چوڑے ہیں کہ کسی دور دراز علاقے میں پائے جانے والے قطعے تک پہنچنے کے لئے پیدل چلنے والوں کو آدھا پونا دن درکار ہوتا ہے۔ اس لئے قبرستان کے اندر دو منی بسیں چلتی ہیں۔ جن کا چکر انہیں دو تین گھنٹوں میں جا کر پورا ہوتا ہے۔ چونکہ بڑے گیٹ سے مختلف سمتوں میں جانے والی بسیں ہر پندرہ منٹوں کے بعد چھوٹتی ہیں۔ اس لئے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بارہ پندرہ بسیں ہر وقت قبرستان کے اندر گھوم رہی ہوتی ہیں۔ البتہ قبرستان کی حرمت کے پیش نظر ان کی رفتار دھیمی رکھی جاتی ہے اور وہ اتنی خاموشی سے چلتی ہیں، جیسے وہ ماتم کے جلوس کا حصہ ہوں۔ بس پاس سے گزر جائے، تو خبر ہی نہیں ہوتی۔ یوں لگتا ہے جیسے ہوا کا ایک جھونکا سرسراتا ہوا نکل گیا ہو۔ جرمنی میں یوں بھی سڑکوں پر گاڑیوں کو ہارن بجانے کی ممانعت ہے اور صرف استثنائی حالات میں، مثلاً ٹکر لگنے کا خطرہ پیدا ہو جانے پر، ان کو ہلکی سی آواز میں چیں کرنے کی اجازت ہے۔ البتہ قبرستان میں یہ آزادی بھی سلب کر لی جاتی ہے۔ کیا مجال ہے کہ پورے قبرستان میں کسی قسم کی گڑگڑاہٹ یا شور شرابا سننے میں آئے۔ رونے دھونے یا کھلے بندوں ماتم اور واویلا کرنے کا یوں بھی یورپ میں رواج نہیں ہے۔ بہت ہوا تو پس ماندگان کو اپنی تر آنکھیں پونچھتے ہوئے اور رومال میں ناک سڑکتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی فرد اپنا غم نہیں دکھاتا اور نہ ہی کوئی پچھاڑ کھا کر گرتا ہے۔ جنازے میں شرکت کرنے والے پھول لے کر آتے ہیں اور اس روز اپنا بہترین لباس پہنے ہوتے ہیں۔ بلکہ اکثر شرکا خاص طور پر اس موقعہ کے لئے نئے کپڑے خریدتے ہیں، جو عام طور سے کالے رنگ کے ہوتے ہیں، جو ماتم کیلئے مخصوص ہے۔

میں نے بھی اس روز کالا سوٹ پہن رکھا تھا۔ میں نے بس لینے کی بجائے پیدل چلنے کا ارادہ کیا تاکہ گاہے بگاہے سڑک کو چھوڑ کر دائیں بائیں پائی جانے والی قبروں کے قطعات پر نظر ڈالتا چلوں۔ پس ماندگان عام طور سے اپنے عزیزوں کی قبروں پر پھول بوٹے لگاتے ہیں اور مذہبی تہواروں پر یا ان کی برتھ ڈے منانے کے لئے قبروں پر جمع ہوتے اور گویا ان کی معیت میں پکنک کرتے ہیں۔ اب تو یہ رواج ہو چلا ہے کہ قبرستان کی انتظامیہ یا کسی فرم کو بیس پچیس برسوں کے لئے قبر کی دیکھ بھال کا ٹھیکہ دے دیا جاتا ہے۔ یوں بھی قبروں کو پچیس برسوں کے بعد ہموار کر دیا جاتا ہے تاکہ نئی قبریں اس جگہ پر بنائی جا سکیں۔

موسم خزاں اپنا آخری دم لے رہا تھا۔ رات بھر بارش ہوتی رہی تھی اور اگرچہ اس روز صبح سے دھوپ نکلی ہوئی تھی، ہوا میں اچھی خاصی خنکی تھی۔ قبرستان میں زائرین کی تعداد کچھ ایسی زیادہ نہ تھی۔ عام طور سے جنازے متعلقین کی سہولت کی خاطر دوپہر کے بعد رکھے جاتے ہیں۔ وہاں پر موجود لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کسی جنازے میں شرکت کی خاطر آئے تھے یا میری طرح بس یونہی گھوم پھر رہے تھے۔ آخر میرے وہاں پر ہونے کی بھی تو کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھ لیتا کہ تم یہاں پر کیا کرنے آئے ہو، تو میں کیا جواب دے سکتا تھا۔ قبرستان میں سیاحت کی خاطر آنے کا ذکر کرتے ہوئے مجھے ضرور شرمندگی ہوتی، اس لئے کہ وہاں پر لوگ اپنے عزیزوں کو دفن کرنے یا ان کی قبروں پر سوگ منانے کی خاطر آتے ہیں۔ ان کو پتہ چلے کہ میں اپنے سیاحتی شغل کو پورا کرنے کے لئے آیا تھا، تو انہیں یقیناً دکھ ہوگا۔ اس لئے میں بھی دوسروں کی طرح سنجیدہ صورت بنائے ہوئے چل رہا تھا۔ بس فرق اتنا تھا کہ سوگواروں کے ہاتھوں میں پھولوں کے گلدستے تھے اور میں خالی ہاتھ تھا۔

پھر میں نے دیکھا کہ مجھ سے آگے چلنے والے لوگ راستے میں پڑنے والے چیپل کی طرف مڑنے لگے۔ جو سڑک سے تھوڑے فاصلے پر تھا اور جہاں پر پہلے سے بہت سے لوگ موجود تھے۔ میں بھی ادھر کو مڑ گیا، جیسے مجھے وہیں پر جانا تھا۔ میں نے سوچا کہ قبرستان میں آن نکلا ہوں، تو کیوں نہ لگے ہاتھوں کسی جنازے کی کاروائی بھی دیکھتا چلوں۔ عام طور سے جنازوں میں شرکت پر کوئی پابندی نہیں ہوتی اور جو چاہے ان میں شامل ہو سکتا ہے۔ آج کل تو لوگ شادی بیاہوں بلکہ عام ہاؤس پارٹیوں میں بھی بن بلائے آن گھستے ہیں۔ چیپل کے

دروازے پر ماتمی کاروباری ادارے کے کارکن لوگوں سے پھولوں کے گلدستے وصول کر رہے تھے، جن کو قبر تیار ہونے پر مناسب طریقے سے سجایا جاتا تھا۔ دروازے کے پہلو میں ایک اسٹینڈ بنا ہوا تھا، جس پر کاغذ اور قلم دھرے تھے۔ سب لوگ باری باری اپنے نام ایک فہرست میں درج کرتے جاتے تھے، جس کو آخر میں پس ماندگان کے حوالے کیا جانا تھا۔ میں نے بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی اپنا نام فہرست میں درج کردیا اور گویا باقاعدہ طور پر جنرڈ ماتمی بن گیا، جس کی شمولیت پر کوئی اعتراض نہیں کرسکتا تھا۔

چیپل اچھا خاصا بھرا ہوا تھا۔ مجھے آخری قطار میں سیٹ ملی۔ حاضرین میں کوئی جانی پہچانی شکل دکھائی نہ دیتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ میں عام طور سے لوگوں کی صورتوں کو بھول جاتا ہوں اور ان کے نقوش اس طرح میری یادداشت کی سلیٹ پر سے مٹ جاتے ہیں جیسے کسی نے اس پر گیلا کپڑا پھیر دیا ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مجھے ان کی باتیں یاد رہ جاتی ہیں۔ بعض اوقات لوگ مجھے ملنے کیلئے آتے ہیں اور اگر مجھے پہلے سے ان کے بارے میں بتایا نہ گیا ہو، تو میں ان سے کسی اجنبی کی طرح ملتا ہوں۔ پھر جب وہ مجھے بتاتے ہیں کہ ہماری ملاقات کب ہوئی تھی، تو مجھے اس ملاقات کی ایک ایک بات یاد آجاتی ہے حتیٰ کہ وہ باتیں بھی جنکو میرے ملاقاتی بھلا چکے ہوتے ہیں۔

جب پادری نے اپنے خطبے میں مرحوم میلے مارکس کے بچپن اور نوجوانی کا ذکر شروع کیا اور بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کی یاد تازہ کرانے لگا، تو مجھے اس کی باتیں جانی پہچانی لگیں۔ میں بھی اسی زمانے میں جرمنی میں پہنچا تھا، جہاں پر دولت کی ابھی وہ ریل پیل نہ تھی، جو آج کل دیکھنے میں آتی ہے البتہ اس وقت تک دوسری جنگ عظیم کے بعد پیدا ہونے والی کساد بازاری کا زمانہ گذر چکا تھا اور جرمن پہلی بار چھٹیوں میں غیر ملکوں کی سیاحت کے لئے جانے لگے تھے۔ مگر ملک میں مکانوں کی کمی تھی، جس کے سبب ایک ایک فلیٹ میں دو اور تین فیملیاں رہ رہی تھیں۔ یونیورسٹی کے طالب علموں کی رہائش کے لئے ہوسٹل نہیں پائے جاتے تھے اور انہیں پرائیویٹ فیملیوں کے پاس کمرہ کرائے پر لے کر رہنا پڑتا تھا۔ طالب علموں کو عام طور سے کسی مہمان کو اپنے پاس ٹھہرانے کی ممانعت تھی۔ بلکہ اگر کوئی ملنے والا آتا تھا، تو اس کو شام کے دس بجے سے پہلے فلیٹ سے رخصت ہونا پڑتا تھا۔ بیشتر گھروں میں سرے سے کسی لڑکی کو اپنے ساتھ لانے کی اجازت نہ تھی۔

پادری بتا رہا تھا کہ میلے کے ماں باپ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کا باپ جنگ کے خاتمے پر روسی قید میں تھا اور ماں کو بچی سمیت ایک فیملی کے ساتھ مل کر ایک مختصر فلیٹ میں رہنا پڑا تھا۔ ان کے پاس صرف ایک کمرہ تھا، جس میں ان کو نہ صرف سونا، بلکہ کھانا بھی پکانا ہوتا تھا۔ گویا میلے کا واسطہ پہلے دن سے تنگی اور عسرت سے پڑا تھا، جس پر قابو پانا اس کی زندگی کا سب سے بڑا چیلنج بن گیا تھا۔ وہ سارا دن ایک فرم میں سیکرٹری کے طور پر کام کرنے کے بعد شام کو ایک ایوننگ اسکول میں پڑھنے کے لئے جاتی تھی، جس کا سلسلہ برسوں تک چلتا رہا۔ تب کہیں جا کر وہ جمنازیم کا آخری امتحان ابیٹور پاس کرسکی تھی، جس کے بغیر جرمنی میں یونیورسٹی میں داخلہ نہیں مل سکتا۔ اس طرح اس کی ماں کی عمر بھر کی خواہش پوری ہوئی تھی، جو خود تو یونیورسٹی میں تعلیم حاصل نہ کرسکی تھی، مگر چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی کو یہ چانس ملے۔

جرمنی میں لڑکیوں کے ناموں میں میلے کچھ ایسا عام نہیں ہے۔ خال خال اس نام کی لڑکیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ اتفاق ایسا تھا کہ میں طالب علمی کے دنوں میں اس نام کی ایک لڑکی کو جانتا تھا، جس کو میں نے پہلی بار یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں دیکھا تھا۔ میانہ قد، قدرتی بلونڈ، مضبوط ہاتھ پاؤں، نیلی نیلی آنکھیں۔ ایک میں ہی نہیں دوسرے طالب علم بھی اس کے حسن پر نثار ہونے کو پھرتے تھے۔ مگر وہ ہم سب کو نظر انداز کرنے پر تلی بیٹھی تھی۔ میرے دوستوں میں سے کسی کو پتہ نہ تھا کہ وہ کون تھی اور کیا پڑھتی تھی۔ ہمیں تو یہ شبہ ہونے لگا تھا کہ وہ سرے سے یونیورسٹی کی طالبہ ہی نہیں۔ اس زمانے میں بہت سی لڑکیاں اور لڑکے یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں شام کے وقت جمع ہوجاتے تھے۔ میں نے جانا کہ وہ بھی ان میں سے ایک ہوگی۔ پھر ایک روز میں کیفے ٹیریا میں چائے کی پیالی اور کیک اٹھائے ہوئے بیٹھنے کے لئے خالی کرسی کی تلاش میں گھوم رہا تھا کہ اس نے مجھے یہ بتانے کے لئے اشارہ کیا کہ اس کے پہلو میں پڑی ہوئی کرسی خالی ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ اس نے جواب میں اپنا نام بتایا اور کہا کہ وہ مجھے فلسفے کے پروفیسر وائس ایکر کے لیکچروں میں کئی بار دیکھ چکی ہے۔ یہ لیکچر جمعرات کی شام کو یونیورسٹی کے بڑے ہال میں ہوتا تھا اور اس میں شمولیت کے لئے ساری یونیورسٹی امڈ پڑتی تھی۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میلے بھی ان لیکچروں کو سنتی تھی۔ اس طرح ہمیں بات کرنے کے لئے موضوع مل گیا۔ بلکہ ہم کیفے ٹیریا سے اٹھ کر اکٹھے اس روز لیکچر سننے کے لئے گئے، جو دس بجے ختم ہوتا تھا اور جس کے بعد ہر کسی کو گھر پہنچنے کی جلدی ہوتی تھی۔ مجھے سحری کے وقت اٹھنا اور مزدوری کی خاطر اپنی جاب پر پہنچنا تھا۔ میلے نے کہا کہ اسے بھی سویرے سویرے فرم میں جانا تھا، جہاں پر وہ سیکرٹری تھی۔ ہم نے اگلے روز شام کے وقت کیفے ٹیریا میں ملنے کا وعدہ کیا۔ میں اس رات ٹھیک سے سو نہیں سکا تھا۔ مجھے اپنی خوش بختی پر اعتبار نہیں آرہا تھا۔

اس کے بعد ہمارا ملنا بیٹھنا روز کا معمول بن گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میرے سوالوں پر کبھی کھلتی نہیں جاتی تھی اور شاید جاننا بھی نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ اگر میں نے کسی دوست یار سے اس کا تعارف کرانا چاہا، تو اس نے کسی قسم کی گرمجوشی نہ دکھائی۔ میرے دوستوں کا خیال تھا کہ میلے کی ناک بہت اونچی ہے مگر اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہ تھا کہ مجھ میں بھلا کونسا سرخاب کا پر لگا

ہوا تھا کہ وہ میرے ساتھ دوستی کرنے کو پھرتی تھی۔

پھر ایک روز اس نے مجھے اپنے دوستوں کے ہاں چلنے کو کہا، جو ہفتے میں ایک بار ملتے تھے اور ادبی موضوعات پر گفتگو کرتے تھے۔ ان دنوں میں وہ دیس دیس کی لوک کہانیاں مل کر پڑھ رہے تھے اور اس بارے میں گفتگو کرتے تھے کہ ان کہانیوں کے پیچھے کیا حقیقت چھپی ہوئی ہے۔ مجھ سے وہ ہندوستان کے لوک کلچر پر بات کرنا چاہتے تھے۔ پتہ چلا کہ ان میں سے اکثر اسکول کے زمانے میں سبیلے کے کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ ان میں سے دو یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے، جبکہ دوسرے بنکوں یا دیگر کمرشل اداروں میں ملازم تھے۔ مگر سبیلے کے سوا وہاں پر اور کوئی لڑکی موجود نہ تھی۔ وہاں پر بھی میں نے محسوس کیا کہ سبیلے کی سب کے ساتھ دوستی تھی، مگر یاری کسی کے ساتھ نہ تھی۔ خود میری حیثیت ایک اچھے وقت کار سے بڑھ کر نہ تھی۔ میں نے اگر کبھی اس بارے میں اس سے بات کرنا بھی چاہی، تو وہ ٹال گئی۔ میرے دوستوں کا کہنا تھا کہ اس کی توقعات بہت اونچی ہیں اور وہ شاید کسی شہزادے کی راہ تک رہی ہے۔

میں اپنی طالب علمی کے دنوں کی یادوں میں ڈوبا ہوا کہیں کا کہیں نکل گیا تھا۔ پھر میں نے پادری کو کہتے ہوئے سنا کہ سبیلے مارکس نے بہت متنوع زندگی بسر کی تھی۔ مگر وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ آیا وہ اس زندگی سے خوش بھی تھی یا نہیں۔ قرین قیاس تھا کہ اس کے ماں باپ کے درمیان پیدا ہو جانے والی ناچاقی کا اثر سبیلے اور اس کے بھائی پر بھی پڑا ہوگا، کیونکہ معاملہ طلاق تک پہنچا تھا۔ بچے ماں کے ساتھ مقیم رہے تھے، جب کہ باپ ایک دوسری عورت کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ سبیلے کا بھائی اپنے باپ کے بہت قریب تھا، جب کہ سبیلے نے باپ سے ملنا تک چھوڑ دیا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ میری وقت کار سبیلے کے ماں باپ کے درمیان بھی ناچاقی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کا باپ اچھا خاصا مالدار تھا، مگر ماں کو اتنی تھوڑی رقم خرچ کے لئے دیتا تھا کہ اس کو گھر کا خرچ چلانے کے لئے ملازمت کرنی پڑتی تھی۔ اسکول کے دنوں میں سبیلے ایک اخبار اپنے محلے کے خریداروں میں تقسیم کر کے تھوڑے سے پیسے کماتی رہی تھی۔ صرف اس کا بھائی اس طرف نہیں جاتا تھا۔ سبیلے کو شبہ تھا کہ جب وہ ہفتے کے ہفتے باپ کو ملنے کے لئے جاتا تھا، تو وہاں سے اس کو پیسے مل جاتے تھے، جو اتنے کھلے ہوتے تھے کہ ماجیز ہوے نے چھوٹی عمر میں ہی سگریٹ نوشی کی لت ڈال لی تھی۔ ماں کو اس بات کا بہت دکھ تھا اور جب کبھی سبیلے کا باپ ان کے گھر آتا تھا، تو اس بات پر دونوں کے درمیان خوب جھڑپ ہوتی تھی۔

پادری نے بیان کیا کہ سبیلے مارکس پوری پوری آرٹسٹ تھی۔ بچپن میں اس کو پیانو بجانا سکھلایا گیا تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ اس میں صلاحیت پائی جاتی ہے اور اگر وہ باقاعدگی سے مشق کرتی رہی، تو بہت بڑا نام پیدا کر سکے گی۔ مگر اس نے پیانو بجانا چھوڑ دیا اور سبیلے ڈانس کی کلاس لینے لگی۔ یہاں بھی اس کو سراہا گیا اور اسے ایک دو بار اوپیرا ہاؤس میں پرفارمنس کا موقع ملا۔ بہت جلد اس سے بھی اس کا جی بھر گیا اور اس نے ڈیزائن اور فیشن کے کپڑوں کی طرف توجہ دینی شروع کی۔ پھر ایک بار کامرانی اسکے قدموں کو چومنے لگی۔ مگر اس کی طبیعت میں ایسا تلون پایا جاتا تھا کہ اس کام سے بھی اس کا جی اوب گیا۔ اس نے ایک امریکن سے شادی کی اور گھر بھی بسالیا۔ مگر بے اولاد رہی۔ آخری برسوں میں وہ ہمبرگ لوٹ آئی تھی، جہاں کا وہ پودا تھی اور جہاں پر اس کے دوست بستے تھے۔ جنازے میں شریک ہونے والوں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ تخمینہ کیا جا سکتا تھا کہ اسکا اپنے دوستوں پر اعتماد غلط نہ تھا۔

آخر میں کالے کپڑوں میں ملبوس جنازے کے چھ کہار چیپل کے پچھلے دروازے سے داخل ہوئے اور تعظیم کی خاطر مرنے والی کے آگے اپنے ہیٹ اتار کر سر جھکانے کے بعد تابوت کو اٹھا کر باہر کی طرف چل دیئے۔ پہلی قطار میں بیٹھنے والے ان کے پیچھے اور پھر دوسری اور تیسری قطار والے باہر نکلے۔ میں چونکہ آخری قطار میں بیٹھا تھا، اس لئے میری باری سب سے آخر میں آئی۔ چیپل کے دروازے پر مرنے والی کے پس ماندگان کھڑے تھے، جن کے ساتھ باہر نکلنے والے اظہار تعزیت کرتے تھے۔ میں نے بھی ایسا کیا اور دوسروں کی طرح میرے ہاتھ میں بھی ایک کارڈ تھما دیا گیا، جو قبرستان کے بڑے گیٹ پر واقع ایک ریستوران کا تھا۔ پس ماندگان کی طرف سے سب کو تدفین کے بعد وہاں پر جمع ہونے اور قہوے کے عصرانے میں شامل ہونے کی دعوت تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے وہاں پر جا کر کیا لینا ہے۔ میں ماتم میں شریک ہونے والوں میں سے کسی کو نہیں جانتا اور مرنے والی سے بھی واقفیت نہیں رکھتا۔ اس لئے میرا وہاں پر جانا بیکار ہے۔ اب اگر معاملہ تدفین کا تھا، یہاں کی رسوم و رواج کے بارے میں مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اگر آنکھوں سے تدفین بھی دیکھ لی جائے، تو حرج کی بات نہیں۔ تدفین کے بعد میرا ارادہ چپکے سے وہاں سے کھسک جانے کا تھا۔

جنازے کے پیچھے ماتمی جلوس کھدی ہوئی قبر کی طرف جو وہاں سے زیادہ دور نہ تھی، چیونٹیوں کی چال میں رواں ہوا۔ اکثر لوگ دو دو کی جوڑیوں میں جا رہے تھے۔ صرف میں اکیلا تھا اور سب سے آخر میں چل رہا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان عورت میری طرح بچھڑی چھانٹ تھی۔ اس کو بھی شاید کوئی جوڑی نہ ملی تھی۔ عین اس لمحے جب میں اس کی طرف تک رہا تھا، اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کھل گئی اور اس نے آگے بڑھ کر میرے بازو میں اپنا بازو ڈال دیا، جیسے ہم ایک دوسرے کو ہمیشہ سے جانتے ہوں۔ تابوت کے قبر میں اتارے جانے کے بعد پادری نے بائیبل میں سے چند آیات پڑھ کر سنائیں اور کھلی ہوئی قبر کے پہلو میں پڑے ہوئے ایک کھرپے کو اٹھا کر تین بار مٹی کو قبر پر ڈالتے ہوئے مٹی کے مٹی میں مل جانے کی بات کی۔ اس

کی پیروی میں باری باری سارے سوگواروں نے اپنے ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے پھول تابوت پر نچھاور کئے اور پھر تین تین مٹھیاں مٹی کی اس پر ڈالیں۔ اس کارروائی پر بہت سا وقت لگ گیا۔ سب سے آخر میں ہماری باری آئی اور میں نے اور میری جوڑی والی عورت نے قبر پر مٹی ڈالی۔ اس سارے عرصے میں ہمارے درمیان کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ البتہ اس کے جسم سے اٹھنے والی بھینی بھینی خوشبو مجھے مسحور کر رہی تھی۔ میں نے قیاس کیا کہ وہ مرحومہ بیٹلے مارکس کی سہیلی ہو گی۔ اب مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اگر میری جوڑی والی محترمہ تعزیتی عصرانے میں شرکت کرنے کا ارادہ رکھتی ہے تو پھر میرے لئے وہاں سے چپکے سے کھسک جانا ممکن نہ ہو گا۔ یوں بھی اب میں اکیلا نہ تھا اور محترمہ کی معیت میں نہ صرف تعزیتی محفل میں، جہاں پر کافی اور کیک ملنے کی امید کی جا سکتی تھی، بلکہ کہیں بھی جانے کے لئے تیار تھا۔

جب سب لوگ کھلی قبر پر مرحومہ بیٹلے سے رخصت لے چکے اور ابھی اس پر مٹی ڈال کر ہموار کرنے کا مرحلہ باقی تھا، جو بعد میں گورکن سرانجام دیتے ہیں، تو سوگواروں کا قافلہ ریستوران کی طرف چل دیا۔ میری جوڑی والی محترمہ بدستور میرے بازو میں بازو ڈالے ہوئے تھی۔ اس نے کہا کہ اس کا نام یوں تو کاتھرین ہے مگر میں اس کو کاتھی کے نام سے پکار سکتا ہوں۔ مرحومہ بیٹلے کے بارے میں اس نے کہا کہ اس کے ساتھ اس کی دوستی نہیں تھی۔ بس وہ ایک دوسرے کو جانتی تھیں، جیسے ایک ہی بلڈنگ میں رہنے والے ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں۔

جب ہم ریستوران میں پہنچے تو گول میز اور دوسری مرکزی سیٹوں پر لوگ قبضہ جما چکے تھے۔ ہمارے لئے ایک چھوٹے میز پر، جو جرمن محاورے میں بلیوں کا میز کہلاتا ہے، دو کرسیاں باقی بچی تھیں۔ کاتھی میرے پہلو سے لگ کر اس طرح بیٹھی ہوئی تھی جیسے ہم سچ مچ ایک نیا بیاہتا جوڑا ہوں۔ بیٹلے کے بھائی نے اپنے خاندان کی طرف سے اور اپنی مرحومہ بہن کے نام پر سب حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے لئے یہ امر ڈھارس بندھانے کا موجب تھا کہ بیٹلے کے دوست یار بڑی تعداد میں اس کی تدفین کے موقع پر موجود تھے۔ کاش وہ اس امر کو خود دیکھ سکتی اور اس کا دوستوں کی کمی کا گلہ دور ہو جاتا، جس کا اظہار وہ آخری برسوں میں کیا کرتی تھی۔

پہلا دور کافی اور کیک کا چلا۔ اکا دکا کونیاک اور وسکی کے آرڈر بھی دیئے جانے لگے۔ آدھ پون گھنٹے کے اندر اندر ہر طرف شراب کی بوتلیں کھل رہی تھیں اور سوگواروں کی دھیمی آوازیں لطیفوں اور قہقہوں کا روپ دھار چکی تھیں۔ ریستوران کے ویٹر اس قدر تیزی سے آرڈر لے اور سامان خورد و نوش لا رہے تھے، جیسے ہم قبرستان کے پہلو میں نہیں بیٹھے تھے، بلکہ منڈی مویشیاں کے بیچوں بیچ بیٹھے ہوئے تھے۔ شور بڑھتا جا رہا تھا اور مجھے پہلو میں بیٹھی ہوئی کاتھی کی بات کو سمجھنے میں دقت ہو رہی تھی۔ جوں جوں شراب کا نشہ لوگوں کے سروں میں چڑھتا جاتا تھا، توں توں ان کی آوازیں بلند سے بلند تر ہوتی جاتی تھیں۔ سوگواری کی فضا عیش کوشی میں ڈھل چکی تھی۔

میں اس ماحول سے کسی قدر بدمزہ ہو رہا تھا۔ میں نے کاتھی سے کہا کہ کسی دوسری جگہ پر چل کر بیٹھتے ہیں۔ مگر وہ وہاں سے اٹھنے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ اس نے کہا: کیوں اپنی جیب سے پیسے خرچ کرنے کو پھرتے ہو۔ یہاں پر ہر چیز مفت میں مل رہی ہے۔ کھاؤ پیئو اور عیش کرو۔ بیٹلے کا جنازہ روز روز نہیں اٹھتا۔ وہ بھی کیا یاد کرے گی کہ ہم نے اس کے غم کو کس طرح غلط کیا تھا۔

محفل کہیں آدھی رات کو جا کر ختم ہوئی۔ سوگواروں کا گروپ ریستوران سے باہر نکلا تو سب کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے اور وہ ایک دوسرے کو سہارا دے کر چل رہے تھے۔ کاتھی نے پھر سے میرا بازو سنبھال لیا تھا۔ مگر اب وہ شراب کے نشے سے جھوم رہی تھی۔ اس نے کہا جہاں چاہو مجھے لے چلو۔ اور اگر تمہارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے تو پھر میرے ساتھ آؤ اور آج کی رات میرے گھر پر رہو۔ مجھے اس بات کے تصور سے ہی ابکائی آ رہی تھی کہ شراب کے نشے میں چور عورت کے پہلو میں جا کر رات گزاروں۔ میں نے اس کی دعوت کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں اس کی پیشکش کو کسی دوسرے موقعے پر کیش کروں گا۔

چند روز کے بعد کاتھی کا فون آیا اور اس نے مجھے اپنے گھر پر آنے کی دعوت دی۔ ساتھ ہی اس نے بتایا کہ بیٹلے کا ذاتی سامان، جو آخر دم تک اسی بلڈنگ میں مقیم رہی تھی، وہ بک رہا تھا۔ اس غرض کیلئے اس کے فلیٹ کو "اوپن ہاؤس" قرار دے دیا گیا تھا۔ جو کوئی چاہے اس روز فلیٹ میں گھوم پھر کر اپنی پسند کی چیزیں چن لے اور قیمت ادا کر کے ان کو ساتھ لیتا جائے۔ میں نے کہا کہ ایک خاتون کے فلیٹ میں بھلا ایک مرد کے لئے کونسی چیز ہو گی، جس کو حاصل کرنے کی مجھے خواہش ہو سکتی ہے۔ کاتھی نے کہا کہ چیزوں پر ایک نظر ڈالنے میں کیا حرج ہے۔ اور پھر مجھے اس کی دعوت کا پاس کرنا چاہئے، جو ابھی تک قائم ہے۔ مجھے یاد آیا کہ سچ مچ اس نے مجھے اپنے گھر پر آنے کی دعوت دی تھی اور میں نے اسے قبول کرتے ہوئے کہا تھا کہ وقت اور دن ہم بعد میں طے کر لیں گے۔

میں کاتھی کے ہاں پہنچا تو وہ بیٹلے کے فلیٹ میں جانے کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہاں پر لوگوں کی خوب ریل پیل ہو گی۔ مگر میری توقع کے برعکس بس ایک دو ہمسائے گھر کی چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ ہم نے سارے کمروں کا چکر لگانے کے بعد ڈرائنگ روم کی ایک الماری میں رکھی ہوئی کتابوں کو دیکھنا شروع کیا۔ کاتھی کا خیال تھا کہ مجھے کوئی نہ کوئی نادر کتاب ضرور مل جائے گی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ کتابیں زیادہ تر جرمن ادب سے متعلق تھیں اور سب میری پڑھی ہوئی تھیں۔ یوں بھی بیشتر کتابیں پیپر بیک تھیں اور ان کا کاغذ پیلا پڑ چکا تھا۔ کتابیں انسان اس سے بہتر حالت میں کسی بھی اسٹور میں خرید سکتا ہے۔

۔باقی زخمی سقراط میں۔

مزاج دوستانہ

فارحہ شا (لندن)

منیر الدین احمد صاحب نے اردو ادب میں تازگی و توانائی کی اتنی دولت شامل کر دی ہے کہ اس کو فراموش کرنا یا اس سے سرسری گزر جانا آنے والے زمانے کے قاری کے لیے ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا۔

احمد ندیم قاسمی

منیر الدین احمد اردو ادب میں ابھی تک وہ مقام حاصل نہ کر سکے ہیں جو ان کا حق بنتا ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ان کے ذہن کی جدت طرازی اور گہری مشاہدے کی دھوم کچھ اس طور ہوگی کہ دیکھنے اور سننے والا حیرت میں گرفتار ہو جائے گا۔

قرۃ العین حیدر

منیر کے اندر چلنے والا کہانی کا بھانجر ایک نہ ایک دن جو لا مکھی کا روپ ضرور دھارے گا اور اس دن منیر کے ساتھ اردو ادب کی کامیابی کا دن بھی ہوگا۔

ممتاز مفتی

منیر الدین احمد نے مغربی تعلیم، تہذیب، تمدن اور ثقافت کو جس نفاست، سادگی اور سلیقے سے اردو ادب میں منتقل کیا ہے اس سے اردو ادب کا مقام اور مرتبہ کچھ اور بلند ہو گیا ہے۔

جیلانی کامران

"پنج مسل کا ایک نسخہ پہنچا۔ ایک ہی نشست میں پوری کتاب ختم کر دی۔ آپ نے مسل کی کیفیتوں اور دوسری تکنیکات و افکار کا نہایت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ عبارت سادہ اور رواں ہے کہیں جھول نہیں۔ اس کتاب کے ذریعے جرمنی کے ایک مقبول و جدید ادیب سے شناسائی ہوئی۔ آپ نے بہت نیک کام کیا۔"

شوکت صدیقی

"میرے نزدیک آپ کا ذہن انتہائی تربیت یافتہ، مرتب اور مہذب ہے اور آپ کی نظر کی رسائی جہاں تک ہو سکتی ہے وہاں پر دوسروں کے پر جلتے ہیں۔ آپ کی نگارشات اس دور کی ایسی و قیع معتبر تاریخی دستاویزات میں سے ہیں جن کا ہر چاپ ہر عہد میں امتیازی حیثیت کے ساتھ ہوتا رہے گا۔ یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ آپ نے مزاج دوستانہ اور طبیعت ہمہ گیر قسم کی پائی ہے۔ آپ بہت کی باتیں قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں جن کے لئے ہم جیسوں کو بڑی دیر تک سوچنا پڑتا ہے۔ آپ ڈاکٹر نفسی سے کام لیں، مگر ہمارے ادب کو آپ نے اتنا کچھ دیا ہے کہ اگر اس کو یکجا کیا جائے تو ایک دفتر یا دستی بن جائے گا۔ صدیوں تک اہل قلم آپ کو آپ کی نگارشات کے تناظر میں یاد کریں گے۔"

ڈاکٹر عبدالقوی ضیاء

"سب سے پہلے آپ کے اور جدولی صاحب کے خطوط کو پڑھنا شروع کیا۔ کتاب کھولی تو پھر کتاب ہاتھ سے چھٹتی ہی نہ تھی۔ ذرا سا تعجب نہیں کہ پاکستان اور ہندوستان کے نامور ادیب ان خطوط کے سحر میں گرفتار تھے۔ خطوط بے مثال ہیں۔ اور علاوہ موضوعی دلچسپی اور تنوع کے نثر کا اسلوب نہایت عمدہ اور دلکش ہے۔ (خیال پڑتا ہے محمد علی ردولوی کے خطوط بھی زبان کے چٹخارے کے باعث بہت اچھے لگے تھے)۔ افسانے سب بے حد دلچسپ ہیں۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے افسانہ کی ایک ذیلی صنف کی داغ بیل ڈالی ہے، جس میں مصنف اپنے پورے تشخص کے ساتھ موجود ہو؟ آپ کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے مطالعہ کا احاطہ کتنا وسیع ہے۔ پھر آپ کی لسانی لیاقت بھی ہم لوگوں کی طرح محدود نہیں۔ آپ اپنے وطن کے لئے اور وطن ثانی دونوں کے لئے قابل فخر ہیں۔"

ڈاکٹر ریاض الاسلام

"ہندوستان کے ایک اشاعتی ادارے کی طرف سے، جس نے ایک دم سے آپ کی چار کتابیں شائع کی ہیں، مجھے ان کتابوں کا پیکٹ موصول ہوا۔ ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ میں نے یہ پیکٹ کھولا۔ کسی دوست (کیا میں آپ کو اپنا دوست کہہ سکتا ہوں؟) کی طرف سے جب ایک دم سے بہت سی محبت ملے تو خوشی بہت بڑھ جاتی ہے۔ اور آج کل میں واقعی بہت خوش ہوں کہ آپ نے مجھے اپنی محبتوں میں یاد رکھا۔

پیارے منیر الدین احمد صاحب (میں کچھ زیادہ بے تکلف تو نہیں ہو رہا) آپ نے بڑے مزے کی کتابیں لکھی ہیں۔ آپ کے افسانوں کی کتاب ("بنت حرام اور دوسرے افسانے") اپنے خاص Locale اور کرداروں کے حوالے سے منفرد ہے۔ آپ نے اس میں انسانی جذبات اور احساسات کی وہ دنیا دکھائی ہے جو مغرب اور مشرق کی ذہنی فضا کے فرق اور جداجدا معاشرت کو پاتی نظر آتی ہے۔ ایک سادہ مگر پر اثر بیانیہ آپ کی ایک خاص پہچان ہے۔

جرمن شاعروں کے تراجم پر مبنی دو کتابیں "دو دروازے" اور "میں اسے ڈھونڈتا پھرا" کے مطالعے نے بہت لطف دیا کہ دونوں زبانوں کے عالم ہونے کی وجہ سے آپ وہ سب کچھ ہم تک پہنچانے میں کامیاب رہے ہیں، جس کے لئے بہت سے لوگ سوائے ہانپنے کے اور پڑھنے والے کو دوڑا دوڑا کر تھکا دینے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔ ان تراجم نے بہت لطف دیا اور ایسے فنکاروں سے متعارف کرایا جن کے ساتھ ہماری یاد اللہ بھی واجبی سی تھی۔ ان فنکاروں میں سے جو موجود ہیں اور آپ کے قریب ہیں ان تک مجھ فقیر کا شکریہ ضرور پہنچایئے گا کہ ان کی وجہ سے زندگی کچھ اور اچھی لگنے لگی ہے۔

آپ کی کتاب "صدمے یاریاں" کو میں نے ڈرتے ڈرتے کھولا۔

وہ اس لئے کہ یہ کتاب آپ کا بڑا کڑا امتحان ہو سکتی تھی۔ کیونکہ ادیب، شاعر یا تو اپنی خودنوشت میں پکڑا جاتا ہے یا اپنے خطوط میں۔ لیکن آپ صاف بچ کر نکل گئے۔ سید احمد سعید ہمدانی صاحب کے ساتھ آپ کی خلابازی بہت جاندار رہی اور پھر اسی کتاب میں کچھ اور لوگوں کے حوالے بھی در آئے۔ یوں آپ کی ذات ایک چمکیلے جسم والے اور سنہری پروں والے پرندے کی طرح میری طرف آئی ہے (چاہے آپ مجھے لالچی سمجھیں اس وقت میرا دل آپ سے جھپٹی ڈالنے کو مچل رہا ہے) کہ آپ کے خلا اپنی ذات کی پرتیں کھولنے کے علاوہ وقت کی تاریخ اور جغرافیہ بھی ہیں۔ کئی سالوں پر محیط آپ کے کام کرنے کی لگن آپ کے مجلہ سے اور روحانی سفر کی داستان "فقرعرب" بھی ہے۔ ان ساری کتابوں کے لئے، اس سارے بھاری بھرکم کام کے لئے میری طرف سے دلی مبارکباد۔"

"ہاں درمیان میں ایک بات آپ کے افسانوں کے حوالے سے رہی جاتی ہے یعنی اسلم کاشمیری کا آپ کی کتاب "بنت حرام" پر تبصرہ کے ضمن میں یہ کہنا کہ "یہ سرے سے افسانے ہی نہیں ہیں"۔ اس کی ایک وجہ شاید آپ کے افسانوں کا خالصتاً یورپی ماحول، کردار اور پھر آپ کا صیغہ واحد متکلم کا استعمال ہے۔ اور پھر ایک خاص طرح کی صورت کی موجودگی---- یہ سب مل کر لوگوں کو خوب دھوکہ دے رہے ہیں۔ اور یہ مجھے اچھا لگا ہے کہ آپ کم از کم اسلم کاشمیری کو دھوکہ دینے میں ضرور کامیاب رہے ہیں۔ لیکن ذہین قاری ایسا دھوکہ کبھی نہیں کھاتا۔ وہ ساری اصل بات کو سمجھتا ہے۔ یہ تو ایک اسلوبیاتی چیز ہے ورنہ کوئی عقل کا اندھا بھی نہیں سرے سے افسانے نہ ماننے جیسی بات نہیں کر سکتا۔ یہ یقیناً افسانے ہیں۔ اور آپ ہی کے افسانے ہیں۔ اصل میں جو لوگ مروجہ Style کے پیچھے نہیں بھاگتے، ان میں ایسا ہوتا ہے اور لوگ بعض اوقات ابہام کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہاں اس طرح کی ایک مثال ہمارے گوجرانوالہ کی ہے۔ یہ تھے رفیق چوہدری۔ میرے دوست بھی تھے۔ مجھے وہ محض اس لئے پسند تھے کہ جو وہ لکھتے تھے وہ ان کے اندر اپنے انداز کا ہوتا تھا۔ فطری لیکن غیر تصنعی۔ کہ جو وہ لکھتے تھے وہی ان کا Style بھی تھا۔ ایسا ہی آپ کے ساتھ بھی ہے کہ آپ بھی لکھتے ہوئے سٹائل بالکل نظر نہیں آتے۔ اور یہ اچھا ہے بلکہ بہت اچھا ہے۔"

محمود احمد قاضی

"انتہائی دلچسپ اور بیش قیمت تحفہ "ڈھلتے سائے" کی صورت میں موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔ یہ بات پرسوں---- شب---- کی ہے لیکن کتاب دیکھ کر جو اشتیاق ہوا وہ اتنا ناقابل برداشت تھا کہ فوراً ہی سب کچھ چھوڑ کر اسی میں لگ گیا۔ کل اتوار کی دوپہر تک دیمک کی طرح چاٹ ڈالی۔ اب بہت سی باتوں پر دوبارہ سرسری نظر ڈال رہا ہوں۔

پہلی مبارکباد دینا ہے کہ آنجناب نے انتہائی باقاعدگی کے ساتھ واقعات کی تدوین کی ہے کہیں بھی ادھر ادھر بھٹک جانے یا غیر ضروری امور کو نمایاں کرنے کی فرو گذاشت نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کتاب ذاتی ڈائری ہونے سے مبرا ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا معلوماتی خزانہ ہے جس سے پڑھنے والوں کی نظر میں کشادگی کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ جن مقامات یا امور کے بارے میں اشارے ہیں وہ بہت بلیغ اور قابل لحاظ ہونے کے ساتھ ہی اہل فکر کے لئے لائق غور وفکر ہیں۔"

قیصر تمکین

"آپ کے افسانے میں بلا کی قوت اور شدت ہے اور سارے افسانے کیفیت و احساس میں اپنی جگہ مکمل ہیں۔ آپ نے سچ کے نئے گوشے تلاش کئے، گونگے جذبوں کو زبان دی اور غموں کی نشان دہی کی ہے۔ آپ کے افسانے ابدی جذبے کا اظہار کر رہے ہیں۔ جب تک ابدی جذبات زندہ ہیں آپ کے افسانے بھی زندہ رہیں گے۔ یہ نئے صنم تراشنے کی کوشش نہیں، سورج کی طرح روشن حقیقت ہے۔ ان میں معانی کی اتنی سطحیں موجود ہیں کہ جو افسانہ ہمدانی صاحب کو آج پست نظر آتا ہے وہ کل سچ و احساس کی نئی دنیا کا اعلان ہوگا۔"

اے۔ سیّد

"ابھی کل ہی میں جناب افتخار عارف کے پاس آپ کی کتاب "آدمی جس نے اپنے آپ کو بھلا دیا" اٹھا کر دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ شاید یہ کتاب میرے پاس نہیں ہے۔ لیکن جونہی گھر پہنچا تو جرمن ایمبیسی کے ذریعے آپ کی بھجوائی ہوئی یہ کتاب میری میز تک پہنچ چکی تھی۔ وللّٰہ فرصت میں یعنی آج اسے پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ وجہ یہ کہ میں اسے پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تراجم اور بہترین اشیاء کے بہترین تراجم کے حوالے سے آپ کا نام ایک سند کا درجہ اختیار کر چکا ہے اور patent ہو چکا ہے۔ نتیجہ اگرچہ واقعے سے پہلے برآمد نہیں کیا جا سکتا۔ مگر آپ کی کتابوں کے بارے میں پڑھنے سے پہلے ہی پیش گوئی کی جا سکتی ہے کہ وہ لطف دیں گی، سابقہ تجربات کی بنا پر۔

میں آپ کی شخصیت اور کاموں سے بلا شبہ متاثر ہو کر یہ چند سطور نذرانے کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ مجھے اپنا مخلص سمجھیں۔ ایک ادنیٰ سا مخلص قاری جو اپنے محبوب مصنف کی تحریروں اور شخصیت سے بے لوث محبت کرتا ہے اور بس۔ اس کے ثبوت میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب بھی میں بے مقصد ادب کے ضخیم و قیم مجموعوں کو پڑھ کر بور ہوتا ہوں تو آپ کی کوئی کتاب اٹھا کر ورق گردانی کرتا ہوں، جو مجھے ایک نئی کائنات سے روشناس کراتی ہیں۔"

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

"شمیر الدین احمد کا اسلوب بیانیہ ہے اور اس حوالے سے ہمیں ان کے ہاں ان تجربات کا نشان نہیں ملتا جو اردو افسانے میں پچھلے تیس سالوں کے دوران کئے جاتے رہے ہیں۔ وہ کہانی کو غیر روایتی انداز میں کسی بھی جگہ سے شروع کرتے ہیں اور بیانیہ زور پر چلاتے ہوئے کسی نقطے پر ختم کرتے ہیں۔ اس

طرز میں کہانی لکھنا ایک مشکل فن ہے۔ ہر دفعہ یہ خدشہ گھیرے رہتا ہے کہ کہانی سپاٹ نہ ہو جائے۔ اچھی بات یہ ہے کہ انہوں نے اس تکنیک کو اچھے انداز میں برتنے کی کوشش کی ہے اور "جولیا جولیا"، "مبروک"، "تنہائیاں کے نہاں خانے"، "نوکروں کا زینہ" اور خاص طور پر "رستے کنویں کے سائے میں زندگی" ان کے کامیاب افسانے ہیں۔ منیر الدین احمد کی کہانیوں کے کردار متنوع جاندار اور زندگی کی حرارت سے بھرپور ہیں۔ انہوں نے نفسِ انسانی کا مطالعہ بڑی گہری نظر سے کیا ہے اور انسان کے بعض ایسے روپ سامنے لائے ہیں جو عموماً ہماری نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ پہلے مقدمے کا ملزم، جولیا اور رستے کنویں والا فضل حرف بحرف اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ کئی دوسرے کردار بھی خاصی کامیابی سے تخلیق کئے گئے ہیں۔"

"منیر الدین احمد کے بیانیہ میں کافی قوت ہے اور انہوں نے کافی رواں نثر لکھی ہے۔ اس میں موضوعات کی جدت قاری کے لئے دلچسپی کے کافی سامان رکھتی ہے۔ ان افسانوں کو پڑھتے ہوئے قاری ان حالات و کیفیات سے دوچار ہوتا ہے جو ابھی ہمارے معاشرے کے لئے اجنبی ہیں۔ جنہیں خود افسانہ نگار نے ہمارا مستقبل قرار دیا ہے۔ جو بقول ان کے اگر کسی کی جگہ نہیں نظر آ جائے تو اسے اتفاق نہیں سمجھنا چاہئے۔"

"تجرِ ممنوعہ" میں منیر الدین احمد کے تیرہ نثر پارے شامل ہیں۔ ان فن پاروں میں چونکا دینے والے انجام کے کل پر طنز کے نشتر سے مختلف معاشرتی رویوں کو ہدف بنایا ہے۔ ان نثر پاروں میں بھی کہیں دو تہذیبیں پہلو بہ پہلو چلتی ہیں۔ زیادہ تر نثر پارے جدید مغرب اور منیر الدین احمد کے حوالے سے بطور خاص جرمن تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بعض بعض جگہ پر طنز بہت کاری ہے اور پڑھنے والے بھی اس کی چبھن محسوس کرتے ہیں۔ دوسرے مقامات پر طنز اگرچہ تیکھی ہے لیکن اس کی مارکاٹی نمایاں ہے۔ اس سلسلے میں ایک مثال درج ذیل ہے۔

"ہمسائے" میں انہوں نے مغربی معاشرے کی منافرت اور افراد کی ایک دوسرے سے لاتعلقی کو موضوع بنایا ہے اور اس موضوع کو بیان کرنے کے لئے انہوں نے خوبصورت طرز کو اپنایا ہے۔

"کون تصور کر سکتا ہے اس تین سالہ بچے کے ہم و غم کو جس نے اپنے ہمسایوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کی خاطر ڈھیروں کاغذوں کو پھاڑ کر دروازے میں بنی ڈاک کی درز سے باہر پھینکا تھا۔ بلکہ اپنے عزیز ترین کھلونوں کو بھی اسی راستے مکان سے باہر دھکیل دیا تھا۔ ہمسایوں کو اس کے رونے کی آوازیں سنائی نہ دی تھیں۔ انہوں نے آپس میں چہ میگوئیاں کی تھیں اور اس کی ماں کو کوسا تھا، جو اپنے بچے کو اس طرح دروازے پر گند پھیلانے سے نہ روکتی تھی۔ پولیس کو انہوں نے اس وقت بلایا جب تین روز تک دودھ کی بوتلیں دروازے پر جمع ہوتی رہی تھیں۔ پولیس دروازہ توڑ کر اندر گئی تو دیکھا کہ بچہ بھوک، پیاس اور غم سے نڈھال اپنی ماں کے پاس فرش پر بیٹھا ہوا تھا، جو تین روز قبل دل کا دورہ پڑنے سے مر گئی تھی۔"

"اس مختصر سے نثر پارے میں انہوں نے جس خوبصورتی سے معاصر مغربی زندگی کے ایک رخ کو پیش کیا ہے اسے شاید کسی طویل افسانے میں اتنی خوبصورتی سے پیش کرنا مشکل تھا۔ ایسا بچہ جو تین دن تک اکیلا اپنی ماں کی لاش کے پاس بیٹھا رہا ہو اس کے ذہنی و نفسیاتی احوال کا تصور ہی فرد پر لرزہ طاری کرنے کے لئے کافی ہے۔"

امجد طفیل

"اس کتاب میں بارہ کہانیاں ہیں۔ ایک سے ایک بہتر۔ آپ خود اندازہ لگائیں کہ منیر الدین احمد کے فن نے ترقی کی کتنی منازل کو طے کر لیا ہے۔ کہانی کا بیانیہ، کہانی کی تہ داری، کرداروں کی ساخت پرداخت، واقعات کا اظہار و بیان، کہانی کے عروج کا مقام مستزاد ڈرامائیت کا ٹچ، ڈرامائیت کی اپنی پیچ و پیچ کہانی میں کیا ستارہ بندی کرتی چلی جا رہی ہے۔ افسانوں میں زندگی کی ناکامیاں اور کامیابیاں ہوتی ہیں۔ نفسِ انسانی کی گہرائیوں کے ہمرکاب ناہمواریاں اور کہانیاں ہوتی ہیں۔ دکھ سکھ کی حکایتیں ہوتی ہیں۔ زندگی اپنے ہزار رنگوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ کتنی عمر کی بات ہے کہ ہر کہانی میں منیر الدین احمد کا مشاہدہ کہانی کے حرف و بیان کا رکاب دوڑتا چلا جاتا ہے۔ مجھے از بس خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ منیر الدین احمد کی یہ کہانیاں چمنستانِ حیات کے نوع بہ نوع رنگوں سے مزین ہیں۔ اہلِ مغرب کی کہانیاں اردو میں پڑھنے کو بہت کم ملیں گی۔ منیر الدین احمد نے یہ خوانچہ جو خالی پڑا تھا، خالی نہیں رہنے دیا۔ اس لحاظ سے انہوں نے اس خالی خوانچے کو دلچسپ کہانیوں سے بھر دیا ہے۔ یہ کام بجائے خود بہت بڑا کام ہے۔ جس پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔"

آغا بابر

میں جب بھی ڈاکٹر منیر الدین احمد کی تخلیقات پڑھتا ہوں تو حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہوں کہ کس طرح کوئی تنِ تنہا شخص اس قدر اہم اور وقیع کام سر انجام دے سکتا ہے جو بڑے بڑے ادارے انجام دینے سے اکثر قاصر ہوا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شان الحق حقی

ڈاکٹر منیر الدین احمد نے بے شمار جرمن شعرا کو جس محنت شاقہ کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے وہ اردو ادب کا قیمتی سرمایہ بن گیا ہے (ERICH FRIED) کی ایک سو نظموں کا اردو ترجمہ بھی ڈاکٹر منیر الدین کا ایک یادگار کارنامہ ہے۔ انھوں نے ایک مشکل پسند شاعر کو جس شستگی اور خوبصورتی سے اردو میں منتقل کیا ہے اس سے شاعر اور شاعری کی اصل روح قاری سے ہمکلام ہو جاتی ہے۔

مظفر علی سید

''چہارسُو''

نقشِ کفِ پا

شبنم رومانی (کراچی)

اس تاثر کے سوا کچھ نہیں کہنا مجھ کو
تنگ کرتا ہے بہت موسمِ سرما مجھ کو

وہ روش میں نے تراشی جو الگ تھی سب سے
دیکھتا رہ گیا ہر نقشِ کفِ پا مجھ کو

زندگی کچھ بھی سہی، ہے تو بہت رنگا رنگ
کیسے کہدوں کہ بُری لگتی ہے دنیا مجھ کو

رقص کرنے کے لیے جشن منانے کے لیے
ہمسفر چھوڑ گئے دشت میں تنہا مجھ کو

میں نہ رانجھا، نہ مہینوال، نہ فرہاد نہ قیس
کیا بزرگانِ محبت سے علاقہ مجھ کو!

○

شہریار (علی گڑھ بھارت)

تکتا ہے ہر کوئی یہاں مجھ کو حیرانی سے
میں نے تجھ کو بھلا دیا کتنی آسانی سے

کچھ مجبوری ہے ورنہ میں بتا چکا ہوتا
ٹوٹ گیا کیوں رشتہ میری پیاس کا پانی سے

حال ترے ماضی پہ مجھ کو کتنا رشک آیا
کل جو اچانک ملنا ہوا اک یارِ پرانی سے

جینے کے سب طور طریقے پہلے جیسے ہیں
کبھی کبھی وحشت ہوتی ہے دل ویرانی سے

وقت کی قید سے میں نے خود کو کر تو لیا آزاد
دیکھو کب فرصت ملتی ہے ہجر سکانی سے

○

محمود شام (کراچی)

سفر۔ سفر پہ سفر۔ ہم مگر وہیں کے وہیں
مکیں بدلتے ہیں لیکن ہیں گھر وہیں کے وہیں

نظارے اور نظریات کب کے ختم ہوئے
کھڑے ہیں آج بھی اہلِ نظر وہیں کے وہیں

زمانہ پہلو سے ان کے گزر کے جاتا رہا
یہ قائدین رہے بے خبر وہیں کے وہیں

نہ چھاؤں اتنی گھنی ہے، نہ دھوپ اتنی کڑی
مسافروں کے لیے ہیں شجر وہیں کے وہیں

○

رب نواز مائل
(کویت)

جسے غم ہی تو اس کی زندگی ہو
اُسے پھر کیا کوئی سی بھی خوشی ہو

جہاں سے روشنی اِک وہ کہ آئے
توجہ اپنی سب اُس سمت ہی ہو

ہدایت کو سُخن یہ کیوں نہ بُوں لیں
کسی جتنی بھی چھوٹی ہو، بڑی ہو

خیال اپنے نہیں کیا بھولوں سے اب؟
کہ جس شے کو بھی دیکھیں فاری ہو

بہت ہی درد سے مائلؔ یہ بولوں
یہ دُنیا تو، نہ اور بھی اب بُری ہو

شبنم شکیل (اسلام آباد)

بدل چکی ہے ہر اک بار اپنی صورت بھی
وہ عہد رفتہ کا ہر خواب ہر حقیقت بھی

کچھ اُن کے کام نکلتے ہیں دشمنی میں مری
میں دشمنوں کی ہمیشہ سے ہوں ضرورت بھی

کسی بھی لفظ نے تھاما نہیں ہے ہاتھ مرا
میں پڑھ کے دیکھ چکی آخری عبارت بھی

یہ جس نے روک لیا مجھ کو آگے بڑھنے سے
وہ میری بے غرضی تھی مری ضرورت بھی

مری شکستہ دلی ہی بروئے کار آئی
وگرنہ وقت تو کرتا نہیں رعایت بھی

میں دل کی بات کسی سے بھی کر نہ پاؤں گی
مجھے تباہ کرے گی یہ میری عادت بھی

میں کیسے بات بھلا دل کی مان لوں شبنمؔ
کہ اُس کو مجھ سے محبت بھی ہے عداوت بھی

یہ میرا عجز کہ دل میں اُسے اترنے دیا
یہ اُس کا مان کہ مانگی نہیں اجازت بھی

مظفر حنفی (دہلی بھارت)

مرتبے رنگ نے، خوشبو نے، ہوا نے پائے
خار تھے ہم، ترے نزدیک نہ آنے پائے

آج بستی میں بپھرتا ہوا سیلاب آیا
کہ گھروں کو نہ کوئی آگ لگانے پائے

ہم بھی جاتے ہیں کلیجے سے لگائے غم کو
دیکھیے حال وہاں کون سنانے پائے

ہر قدم ساتھ رہا پاسِ ادب صحرا میں
گردِ وحشت بھی نہ جی بھر کے اڑانے پائے

ان سے کیا پوچھیے جو خاک میں آسودہ ہیں
آسمانوں کو جھکاتے تھے جھکا نہ پائے

گُل بھی کردے مجھے آندھی تو نہ گھبرانا تُو
روشنی! دیکھ مری بات نہ جانے پائے

شہر بھر میں نہیں اک باغ مظفر صاحب
غول چڑیوں کا جہاں شور مچانے پائے

ڈاکٹر صابر آفاقی (مظفرآباد آزاد کشمیر)

اس دور میں انداز نرالے نکل آئے
ہم لوگ کہاں درد کے پالے نکل آئے

آسان کہاں تھا سفرِ راہِ محبت!
تلووں میں جو تھے بھید میں چھالے نکل آئے

ہم زاہد و مےخوار کی محفل میں گئے تو
پر ہاتھ سے دستار سنبھالے نکل آئے

جانے میں بھی آزاد تھے آنے میں بھی آزاد
یہ بات نہیں جب بھی نکالے نکل آئے

تھا عکس ترا دائرہ در دائرہ روشن
اور نور کے واں سینکڑوں ہالے نکل آئے

مچلا مرے ہونٹوں پہ اگر حرفِ صداقت
جیبوں میں جو رکھے تھے وہ تالے نکل آئے

ہم وہ ہیں کہ ہر دور میں معتوب ہی ٹھہرے
خنجر کبھی چمکے کبھی بھالے نکل آئے

اے خاکِ وطن تیرا مقدر بھی عجب ہے
تجھ پہ کبھی گورے کبھی کالے نکل آئے

معلوم ہی کب تھا ہمیں یہ مرتبہ اپنا
اپنے تو کتابوں میں حوالے نکل آئے

آباد تھا جو گھر ہوا ویران وہ صابرؔ
ہر گوشۂ دیوار سے جالے نکل آئے

مامون ایمن (نیویارک)

کرب کی راہ سرخوشی ہو گی
موت اک روز زندگی ہو گی

گرد چہرے پہ جب جمی ہو گی
داستاں موڑ پر رکی ہو گی

خامشی میں تباہی ہو گی
یار کے دل سے دل لگی ہو گی

کون سے موڑ پر رکا قصہ
بات کس بات سے چلی ہو گی

کس کو معلوم تھا محبت میں
زندگی ایک پھول جھڑی ہو گی

پاس ہو گی ازل کی تنہائی
دور محفل کوئی سجی ہو گی

جڑ گئی ہو گی یاس امبر سے
آس کی ڈور جب کٹی ہو گی

جگ ہنسائی تو ہو گی لوگوں میں
غم میں شامل اگر ہنسی ہو گی

کوئی کہہ دے کبھی یہ ایمن سے
آپ سے اب نہ شاعری ہو گی

پی ایس جین جوہر (میرٹھ بھارت)

مرے دل سے محبت کی فراوانی نہیں جاتی
میں اکثر سوچتا ہوں کیوں یہ نادانی نہیں جاتی

شمارِ تجد کرتے کرتے عمریں بیت جاتی ہیں
مگر جو دل میں خیمہ زن ہے شیطانی نہیں جاتی

گھروں کی رونقیں کلکاریاں بچوں کی ہوتی ہیں
کھلونوں سے سجا کر گھر کی ویرانی نہیں جاتی

یہ حالت ہو گئی ہے شدتِ خطراتِ پیہم سے
کہ اچھے آدمی کی شکل پہچانی نہیں جاتی

نہ راہ و رسم ہے اُن سے نہ باقی واسطہ کوئی
مگر پلکیں جو کرتی ہیں نگہبانی نہیں جاتی

یہ ہندو بھی ہیں مسلم بھی سرِ مقتل میں سرگرداں
کسی کے خوں سے اسکی ذات پہچانی نہیں جاتی

جوانی میں تو اپنی لغزشوں پر ناز ہوتا ہے
ضعیفی میں گناہوں کی پشیمانی نہیں جاتی

محبت کے سفر میں اک مقام ایسا بھی آتا ہے
جو دل پر چوٹ پڑتی ہے تو گردانی نہیں جاتی

عزیزوں کے گذر جانے سے دل بیزار ہوتا ہے
مگر دنیا سے دلچسپی بہ آسانی نہیں جاتی

غزل کے روپ میں ہے نظم کے رنگوں کی آمیزش
یہ وہ طرزِ سخن ہے جس کی جولانی نہیں جاتی

نظر میں کانپتا ہے اک جہنم زار کا منظر
مگر سینے میں ارمانوں کی طغیانی نہیں جاتی

شباب و حسن ڈھکنے کو کوئی پوشاک موزوں ہو
لباسِ تنگ سے جسموں کی عریانی نہیں جاتی

ملک زادہ جاوید (نوئیڈا، بھارت)

اپنی کم مائیگی کو مان لیا
اُس نے جب میرا امتحان لیا

ڈنکیں کھولتی ہیں منھ ہر دم
ہم نے بازار میں مکان لیا

اک پرندے نے پر کو پھیلا کر
اپنے حصے کا آسماں لیا

ختم ہو جائیں گے برے منظر
موسموں نے اگر یہ ٹھان لیا

لوگ تنقید پر اتر آئے
میری کمزوریوں کو جان لیا

چھوڑ کر چھاؤں ورثے کی
دھوپ کا میں نے سائبان لیا

آج باتوں میں خوشبوئیں جاویدؔ
کس کے ہونٹوں سے زعفران لیا

دوغزلہ

تعفن ہی تعفن ہے فضا میں
دھرا ہے کیا تری میری انا میں

یہی تو فلسفہ ہے زندگی کا
بقا کا راز پنہاں ہے فنا میں

ہوائے شہر جیسے حبس بے جا
کوئی دم خم نہیں بادِ صبا میں

دلوں میں بغض و کینہ کے ہیں بچھو
اثر آئے گا پھر کیسے دعا میں

ذرا سا فرق دونوں میں نہیں ہے
سیاست اور طوائف کی ادا میں

ذرا ملنا تو پھر تم پر کھلے گا
بڑے گن ہیں ضیاؔ ابھی قضا میں

☆

مہک ہے اُس کے لہجے کی صبا میں
دریچہ کھولیے تازہ ہوا میں

ہوا سے بیر ہے میرا پرانا
دیا میں نے جلایا ہے ہوا میں

ستاروں کی طرح رویا ہوں شب بھر
کہ دھندلاہٹ تھی سورج کی ضیا میں

ادھوری سی تیری انگڑائی جیسے
لکیریں کھینچتا ہوں میں ہوا میں

کسی طوفان کا ہے پیش خیمہ
کہ بوئے خوں بھی شامل ہے ہوا میں

وفا کا پھول مرجھاتا نہیں ہے
ضیاؔ احساس کی آب و ہوا میں

سید ضیاء شبنمی (ملتان)

اپنی مٹھی میں گم

جوگندر پال (دہلی بھارت)

میرا گاڑی چلانے کا لائسنس کھو گیا ہے اور میں اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پریشان ہو گیا ہوں۔

"جو آپ ہی ہر پل کھویا ہو" میری بیوی شوبھا مسکراتے ہوئے میرے سر پر آ کھڑی ہوتی ہے "اس کی چیزیں بھی کیوں نہ کھوئی رہیں؟"

میری زندگی واقعی ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہی بیت رہی ہے ہر وقت کچھ نہ کچھ کھویا رہتا ہے اور نہ کھویا ہو تو بھی غیر شعوری طور پر اسی الجھن میں رہتا ہوں کہ مجھے کچھ ڈھونڈنا ہے اور اس حالت میں اکثر سامنے کی اشیاء بھی دکھائی دینے میں نہیں آتیں۔

کل پرسوں کا ذکر ہے کہ میں اپنے دفتر کی چابی تلاش کرنے کے لیے شوبھا کی ساڑیوں کی الماری میں سر ڈالے ہوئے تھا۔

"تمہارے دفتر کی چابی میری ساڑیوں میں کیسے ملے گی؟"

لیکن کوئی شے کسی غلط مقام پر پہنچ کر ہی تو گم ہوتی ہے اسے جواب دیے بغیر میں اس کی ساڑیوں کو ٹٹولنے میں لگا رہا اور پھر اچانک ایک کونے میں کسی بچے کے چھوٹے چھوٹے کپڑے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"یہ کپڑے ـــــــ؟"

وہ لپک کر میرے قریب چلی آئی "چھوڑو، انہیں خراب کرو۔"

میں کچھ سوچ کر اس کے پیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ "تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" چابی بھول کر میں نے اسے قریب ہی پلنگ پر بٹھا دیا اور آپ بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "بولو مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

"میری طرف جی بھر کے دیکھا کرو تو تمہیں آپ ہی سب کچھ معلوم ہو جایا کرے"

میں سر کھجا کھجا کر مسکراتے ہوئے اس کے پیٹ کو دیکھے جا رہا تھا۔ جیسے کوئی سالوں کی گمشدہ شے اچانک اپنے سامنے ہی پڑی مل گئی ہو۔ اپنے اس بچے کو میں کئی سال سے ڈھونڈ رہا تھا۔ شوبھا کی کوکھ کیا بار بار چھان مارا، مگر اندر سے اندر دیکھنے سے کچھ ہاتھ تھوڑی ہی آتا ہے۔

"میں نے تو ہمیشہ یہی کہا، آرام سے کام لو، اپنی چیز ہوگی تو ضرور مل جائے گی۔"

چابی میرے ذہن سے اس لیے محو ہو چکی تھی کہ قفل آپ ہی کھلا ہوا مل گیا تھا۔ "مجھے کیا پتہ تھا ـــــــ"

"تمہیں کب کچھ پتہ ہوا؟ اٹھو، اپنی چابی ڈھونڈو اور دفتر جاؤ۔"

شوبھا کی آنکھوں کی خندہ کشادگی میں میرا چہرہ بڑی بے فکری سے کھل رہا تھا اور وہ مجھے اچھی لگ رہی تھی۔

اپنی میز کے دراز پر جھکے میں گویا ابھی تک شوبھا کی آنکھوں میں کھویا ہوا ہوں۔

میرے بیشتر ضرورت کے کاغذات اسی دراز میں پڑے ہوتے ہیں۔ راشن کارڈ، ریڈیو کا، ٹی وی کے لائسنس، بینک کی پاس بک اور چیک بک، گارنٹیاں، رسیدیں اور چٹھیاں ـــــــ مجھے ہلکا سا احساس ہونے لگا ہے کہ چند ہفتے پیشتر میں نے اپنی گاڑی کا لائسنس یہیں دیکھا تھا۔ اس سے پہلے بھی میں ایک بار یہاں ہاتھ مار کر دیکھ چکا ہوں مگر اب میں ہر کاغذ کو بڑے دھیان سے الگ کر کے دیکھ رہا ہوں۔

"آرام سے دیکھو گے تو مل جائے گا" میری بیوی مجھے ہدایت کر کے کچن کی طرف ہو لی ہے۔

آج دفتر سے لوٹتے ہوئے مجھے گاڑی کا حادثہ پیش آ گیا۔ پولیس نے چھوٹتے ہی ڈرائیونگ لائسنس طلب کیا۔ گاڑی چلاتے ہوئے لائسنس میں اپنے پاس نہیں رکھتا۔ پولیس انسپکٹر کے سوال پر میں اپنی جیبیں اس طرح ٹٹولنے لگا جیسے اسے اپنی میز کے درازوں میں تلاش کر رہا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ وہیں کسی دراز میں ضرور مل جائے گا۔ انسپکٹر کو شاید شک گزرا کہ میں لائسنس کے بغیر ہی گاڑی چلاتا ہوں مگر شریف آدمی تھا۔ مجھے ہکلایا ہوا پا کر اس نے چھوٹ دے دی کہ کل صبح تک لائسنس اسے پولیس چوکی میں دکھا آؤں۔

دراز کے کاغذات میں مجھے لائسنس نہیں ملا ہے۔ میں نے آنکھوں پر زور ڈال ڈال کر خالی دراز میں دیکھا ہے اور لائسنس کی ملی جلی نیلاہٹ کو اپنی نظر میں ڈوبتے ہوئے محسوس کیا ہے۔ مجھے ہمیشہ انجانا سا خوف رہتا ہے کہ میری چیزیں میری نہیں اور میں انہیں کھو دوں گا، اس لیے میں انہیں دیکھ دیکھ کر اپنی نظر میں اتار لیتا ہوں۔ میں نے جو کچھ بھی کھویا ہے اسے میری اپنی ہی نظر نے اڑا رکھا ہے اور میرا المیہ یہ ہے کہ اپنی کھوئی ہوئی اشیا کو بوقت ضرورت اپنی نظر سے نکال کر میں کام میں نہیں لا سکتا۔ میری نظر اتنی ہوتی کہ نہ ہوتی تو میرا سب کچھ میرے استعمال کے لیے ہر دم مجھ سے اپنی اپنی جگہ موجود رہتا۔

مجھے اب یہ گمان ہو رہا ہے کہ میرا گاڑی کا لائسنس ایک مدت سے یہیں اگر میرے دیکھنے میں نہیں آیا۔ شاید کسی گرم سوٹ کی جیب میں پڑا رہ گیا ہو۔ میں اپنے کپڑوں کی الماری کے قریب چلا آیا ہوں اور اسے کھول کر لٹکے ہوئے کپڑوں کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے۔ ایک کے بعد ایک بھی جیبیں مجھے خالی مل رہی ہیں۔ نہیں، میرے عہد کالج کے اس اسپورٹس بلیزر کی اندرونی جیب پھٹی ہوئی ہے۔ میں نے ہاتھ نیچے لا رہا ہے اور مجھے وہاں پھنسا ہوا ایک خستہ سا کاغذ ملا ہے۔ یہ میرے مرحوم باپ کی ایک پرانی چٹھی ہے۔ ان دنوں کی، جب میں اپنے کالج کے ہوسٹل میں رہائش پذیر تھا۔ بابا اور ماں میرے سفر کے دورے کے

بارے میں بڑے فکر مند رہتے تھے۔ بابا کی ہر چھٹی ہدایتوں سے بھری ہوتی۔ رات کو جلدی سو جایا کرو۔ گائے کے دودھ میں شہد ملا کے پیا کرو۔ اپنے سر کو بادام روغن سے تر بتر رکھا کرو۔ میرے سر کا درد اتنے سالوں میں ابھی تک نہیں گیا۔ ہر وقت دھیمے دھیمے محسوس ہوتا رہتا ہے۔ جو میری معمول کی صحت کا کچھ اس طرح حصہ بن چکا ہے کہ اس کا محسوس نہ ہونا میری بیماری کی علامت بن جاتا ہے۔ میں جینے لگا ہوں ۔۔۔ ہماری صحت کے مانند چین بھی نسبتی اور اعتباری ہوتا ہے۔ بنیادی نہیں، اسی لیے ہماری ایک زمانے کی کوئی ضرورت کسی دوسرے زمانے میں اہم تو کیا، ہر گز بھی معلوم نہیں ہوتی۔

پیارے دھار ۔۔۔ میں واپس اپنی میز کے سامنے کرسی میں آ بیٹھا ہوں اور اس بوسیدہ کاغذ کو کھول کر بابا کی مختصری تحریر پڑھ رہا ہوں۔ تمہاری ماں کی حالت بہت بگڑ چکی ہے۔ فوراً گھر چلے آؤ اور اُس سے مل لو۔ میں اپنے سارے کام چھوڑ کر ماں سے ملنے روانہ ہو گیا تھا اور سارے راستے میں ڈر رہا تھا کہ وہ چل بسی تو کیا ہو گا؟ ۔۔۔ کیا ہوا؟ ۔۔۔ یہی، کہ وہ چل بسی۔ ہوتا صرف وہی ہے جو ہونا ہے، باقی سب کچھ ہم آپ ہی اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں۔ ماں کو کھو کر مجھے بڑا دھکا لگا۔ مگر ہو نہ ہو کا دھکا بھی ہو تو اُسی دم لگتا ہے، ہوش سنبھال کے بعد بھی آدمی لوٹتا پلٹتا رہے تو دوسروں کو کرتب دکھا رہا ہوتا ہے۔ میں نے بھی کئی ماہ سارے کام چھوڑ کر ماں کو یاد کر کر کے رونے دھونے کا حلیہ بنائے رکھا اور پھر امتحان میں فیل ہو گیا تو اپنے آپ کو سمجھایا کہ ابھی تم اسٹوڈنٹ ہو۔ ابھی سے غم جیسی مہنگی لگژری کے لیے تمہارے پاس پیسے کہاں ہیں؟ پہلے موٹی سی کمائی کے قابل ہو جاؤ، پھر جی بھر کے غم پالو اور جو جی چاہو کھا پی لینا۔ بے پروائی کا شکر ہے کہ میں سنبھل گیا، اور اتنا سنبھلا کہ بابا کے کوچ پر مجھے کسی جھٹکے کا احساس ہی نہ ہوا۔ میری پہلی بیوی میرا ادھر بندھ جانے لگی تو اس کی ماں ہی پن پر فریفتہ ہو ہو کر میں اسے ڈھارس دینا شروع کر دیتا۔

ہاں، شوبھا میری دوسری بیوی ہے۔ میری پہلی بیوی رشما نے مجھ سے طلاق لے لی تھی۔ کیوں؟ ۔۔۔ وہ مجھے بڑی محبوب تھی، مگر محبت کرنے والے ایک دوسرے سے بڑی ناجائز توقعات باندھنے لگتے ہیں اور ان کے پورا نہ ہونے پر جھگڑے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہماری طلاق ہماری محبت کی وجہ سے ہی ہوئی۔ اپنے مسلسل جھگڑوں سے ہم ایک دوسرے سے عاجز آ چکے تھے مگر گرہستی کی گاڑی محبت و حجت سے تھوڑی ہی چلتی ہے۔ چلانے کی ٹھان لو تو یہاں سے وہاں تک یونہی چلتے چلتے حادثہ پیش آ جائے گا ۔۔۔ لائسنس!

"کیوں، لائسنس ملا؟" شوبھا نے کچن سے لوٹ کر مجھ سے پوچھا ہے۔

"نہیں۔"

میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا ہے۔ شاید میرا بچہ ابھی تک وہیں کھیل رہا ہو۔

"میری آنکھوں میں تمہیں اپنا لائسنس کہاں ملے گا؟ وہاں اپنی میز پر یا فائل کیبنٹ ڈھونڈو۔"

اُس کی آنکھوں کی خالی خالی کشادگی میں دور دور تک دھوپ اتری ہوئی تھی۔ میں نے سوچا، بچہ بہت میں لوٹ کر سو گیا ہوگا۔ "تم گھوم پھر کیوں رہی ہو۔ لیٹ کیوں نہیں جاتی؟"

"مجھے اس طرح گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟ میں کوئی گم تو نہیں ہو گئی۔"

اُس کے چہرے پر ننگی کے باعث مجھے واقعی گیا احساس ہوا ہے کہ وہ وہاں نہیں ہے۔ میرا بچہ لانے کے لیے نامعلوم کہاں پہنچی ہوئی ہے۔ یہاں اور شوہر شاید اسی لیے نہیں مل پائے ۔۔۔ رشما؟ ۔۔۔ وہ تو میری محبوب تھی۔ پورے چار سال میرے ساتھ ہی رہی۔ اپنے بچے کی ماں کے روپ میں دیکھنے کا مجھے کبھی گمان ہی نہ ہوا۔ اپنے انگ انگ میں وہ آپ ہی مجھ سے مل لیتی۔ اب کہاں ہے؟ کیا معلوم، کھو کر کس کے ہاتھ جا لگی ہے؟ نہیں، جب سے ہماری طلاق ہوئی ہے، ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔

"میں بھی تمہارے ساتھ لائسنس ڈھونڈتی ہوں۔"

"نہیں، تم آرام کرو۔ مجھے ڈر ہے کہ بل بل کر شوبھا خواہ مخواہ اپنے بچے کے آرام میں خلل ڈال رہی ہے۔"

وہ پھر باہر چلی گئی ہے اور میں نے فائل کیبنٹ کی طرف کرسی موڑ لی ہے اور کیبنٹ کو کھولتے ہوئے اپنے آپ کو بتا رہا ہوں کہ ہو سکتا ہے لائسنس کو بے خیالی میں میں نے کسی فائل میں ڈال دیا ہو ۔۔۔ سب سے پہلے گاڑی کا فائل دیکھوں گا ۔۔۔ میں فائلوں کے فلیپ پڑھنے لگا ہوں ۔۔۔ ہاؤس ۔۔۔ ریزرو فنڈ ۔۔۔ ڈیپازٹس ۔۔۔ مرچنڈائزنگ ۔۔۔ انشورنس ۔۔۔ جنرل ۔۔۔ شوبھا ۔۔۔ میں نے گھبرا کر اپنی بیوی کو آواز دی ہے ۔۔۔ یہاں تو گاڑی کا فائل بھی دکھائی نہیں دے رہا۔ نہیں، مت آؤ، مل گیا ہے۔ میں اچانک یہ محسوس کر کے گھبرا گیا ہوں کہ میرے سر کا درد ایک دم رک گیا ہے لیکن پھر دو تین چھینکیں آنے پر ویسے ہی دھیما دھیما اٹھنے لگا ہے اور میں نے اطمینان کی سانس لی ہے۔

کیبنٹ سے گاڑی کا فائل نکال کر میں نے بڑی پر امید سرعت سے اس کے ورق الٹے ہیں۔ لائسنس میری نظر میں صاف اٹکا ہوا ہے مگر فائل میں نہیں ہے۔ فائل بند کر کے میں اسے واپس کیبنٹ میں رکھنے لگا ہوں کہ اس میں سے ایک فوٹو نیچے گر گیا ہے۔ میں نے اسے اٹھا لیا ہے۔ اپنی ہنی مون کا یہ فوٹو ڈھونڈنے کے لئے ایک دفعہ میں نے سارا گھر الٹ پلٹ دیا تھا۔ اور اپنا ذہن بھی، اور اسے کہیں نہ پا کر میری سراسیمگی کی حد نہ رہی تھی۔ میری نظر؟ ہاں! دوسری اشیاء کی طرح یہ تصویر بھی میری نظر نے اٹھالی تھی، مگر اس مدت میں یہ

وہاں سے سرک سرک کر میرے ذہن میں آ گئی اور پھر ذہن سے کیا پتہ کہاں غائب ہو گئی؟ شاید مجھے اپنی طرف متوجہ نہ پا کر اپنے گمشدہ اصل میں جا پہنچی۔ میرے پاس دوشتاں کی بس ایک تصویر تھی۔ جب ابھی کیمرہ ایجاد نہ ہوا تھا تو لوگ اپنے عزیزوں کی تصویریں ذہنوں میں محفوظ رکھتے تھے اور آئے دن ان کی جھاڑ پھونک کرتے رہتے تھے مگر سائنس کی برکتوں نے ہولے ہولے انہیں اپنی اس ذمہ داری سے آزاد کر دیا۔ آج جب فلیٹ کی جھاڑ پھونک کے لیے نوکر نہیں ملتے تو ذہن کی صفائی کی طرف کون دھیان دے؟ میں نے ابھی اپنا اسکول بھی پورا نہ کیا تھا کہ دوشتاں کی شادی ہو گئی اور میرے بچپن کو اپنے سامان میں ٹھونس کر اپنے شوہر کے ساتھ سمندر پار چلی گئی اور میں کالج میں آ گیا۔ اس کی چٹھیاں آتی رہیں۔ مگر جسے لکھا پڑھا اپنے کام دھندے سے بھی جوڑتے ہوئے کوفت ہوتی ہو اسے اپنی محبتوں کو تیز سے تیز تر قلمبند کرنا کیونکر آئے؟ میرے بابا کی چٹھیوں کے جواب بھی دو فقطی ہوتے تھے جن سے وہ چڑ سے رہتے۔

"میری کچھ میں نہیں آتا بابا، کیا لکھوں؟"

"بس جو بھی لکھ دیا کرو۔"

بھلا تو صرف دو اور دو چار ہے اسے کوئی لکھے بھی تو کیا لکھ کر وہ کیا اطلاع بہم پہنچائے گا؟

مگر جس دن اچانک دوشتاں کے شوہر کا دورے سے تار آیا کہ دوشتاں نے زچگی کے اسپتال میں دم توڑ دیا ہے اس دن میں بہت رویا۔ اس دن میری پہلی بیوی ریشما نے مجھ سے طلاق لی تھی۔ میں نے طلاق کے فیصلے کو بڑے چین سے قبول کر لیا تھا مگر میرا خیال ہے میری بہن کی موت کی خبر نے مجھ میں یہ جرأت پیدا کر دی تھی کہ ریشما کو کھونے پر میں جی بھر کے رو لوں۔ روتے روتے میں نے دوشتاں کی شکل کو آنکھوں میں باندھنا چاہا اور ناکام رہا تو اس کا فوٹو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ بہت ڈھونڈا اور نہ ملنے پر پریشان ہونے لگا کہ اب کیا ہوگا۔۔۔۔ ہوا کیا تھا؟ میں اسے بھول گیا۔ وہ کوئی بھگوان تو نہ تھی کہ اس کی شکل ذہن میں محفوظ نہ ہونے پر بھی اس کے نام کی مالا جپتا رہتا۔

عجب بات ہے کہ مجھے اپنی کھوئی ہوئی بے لوث محبتوں کی ٹوہ کسی پرانے کوٹ کی پھٹی ہوئی جیب کے نیچے دو دبیز تہوں میں ملتی ہے، یا گاڑی چلانے کے غیر شخصی کاغذات کے فائل میں، مل جاتی ہے تو محض اتفاق سے۔۔۔۔ بے موقع۔۔۔۔ کیا محبتیں آپ ہی بے موقع یا با موقع ہوتی ہیں یا محبت کرنے والا ہی انہیں موقعوں سے باندھتا کاٹتا چلا جاتا ہے؟

میں نے دوشتاں کی تصویر کو دیکھتے ہوئے اپنے اوپر اس کی محبت حاوی کرنے کی کوشش کی ہے مگر میرا باطن میرے کھوئے ہوئے لائسنس کی ٹوہ میں لگا ہوا ہے۔ میں نے بے دھیانی میں اپنی بہن کا فوٹو ایک طرف ڈال دیا ہے۔ میری نظر میں میرا گاڑی کا لائسنس ہی موجود ہے مگر کھوئی ہوئی شے واقعی موجود ہونے کی بجائے صرف نظر آتی رہتی ہے۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا ہے کہ اب اُسے کہاں ڈھونڈوں۔ کسی غیر متوقع جگہ پر؟ اپنے ہونے والے بچے کے کپڑوں میں، بیوی کی ساڑیوں میں یا کچن میں؟۔۔۔۔ کہاں؟۔۔۔۔ میں نے دوشتاں کا فوٹو پھر سے ہاتھ میں لے لیا ہے اور اس پر ایک نظر ڈال کر اسے پھر ایک جانب رکھ دیا ہے۔۔۔۔ ہم محبت، نفرت یا جو بھی کرتے ہیں وہی کرتے ہیں جس کی ہمیں اُسی دم حاجت ہو ورنہ محبوبہ کے گلے میں باہیں ڈالے ہم اچانک اُسے چھوڑ کر لیٹرین کی طرف کیوں بھاگ کھڑے ہوتے ہیں؟

میں سوچ رہا ہوں کہ اگر لائسنس نہ ملا تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی میں نے اسے جبل پور سے کوئی ایک دہے پہلے بنوایا تھا۔ پھر میری پوسٹنگ حیدرآباد میں ہو گئی تو وہاں اس کی دوبارہ تجدید کروائی تھی۔

تین اور تین، چھ اور تین، نو سال۔۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرے لائسنس کی آخری تاریخ کو بیتے پورا ایک سال ہو چکا ہے۔ ایک تو میں نے بے تحاشا گاڑی چلاتے ہوئے ایک غریب کو نیچے لے لیا، دوسرا میرا لائسنس گم ہے اور تیسرا پچھلے سال سے میں نے اس کی سرکاری تجدید نہیں کروائی۔ میں واقعی بہت گھبرانے لگا ہوں مگر اپنے آپ کو سمجھا بھی رہا ہوں آرام سے بیٹھو۔ یہ سمے بھی ٹل جائے گا۔ سمے ٹل جانے پر بڑی سے بڑی ضرورت بھی غیر ضروری ہو کر رہ جاتی ہے۔ مجھے اچانک یاد آیا ہے کہ آج شوبھا کو میڈیکل چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔۔۔۔ عورت ماں بننے جا رہی ہو تو اس سے ہر لحظہ بڑی محبت بھری توجہ سے پیش آنا چاہیے۔ اپنے اُلم غلم کاموں سے میرا سر اٹھتا ہی نہیں۔ بے چاری شکایت بھی کرے تو کس سے؟۔۔۔۔ یہ سارا سال اسی طرح گزر گیا ہے۔۔۔۔ ہاں گاڑی تو چلتی رہی مگر میں نے بے بسی سے مسکرا کر اپنا سر جھٹکا ہے۔۔۔۔ مگر لائسنس کی تجدید کے بغیر ہی۔

اچھا! میں نے اپنے آپ سے کہا ہے بیوی کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔ اب کہیں جا کے باپ بننے کی خواہش پوری ہونے کا وقت آیا ہے۔ اُٹھ کے دیکھو قسمت اوٹ میں ہیرے جواہرات لیے کھڑی ہے۔۔۔۔ جب بھی میں کوئی اچھی بات سوچ کر خوش ہوتا ہوں تو مجھے سگریٹ کی اشتہا ہونے لگتی ہے حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ میرے سامنے رکھی ہوئی ڈبیا خالی ہے۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا ہے۔

"شوبھا!" میں نے اپنی بیوی کو آواز دی ہے مگر پھر آپ ہی کہا ہے "کچھ نہیں" میں نے اپنے آپ کو اس لیے روک لیا ہے کہ لائسنس کو تھوڑی دیر اور ڈھونڈ لوں، شاید مل ہی جائے۔ میں نے پھر اپنا سر فائل کیبنٹ کی طرف گھما لیا ہے اور اپنی اسناد کا فائل نکال کر دیکھنے لگا ہوں۔

اس فائل میں میٹرک سے لے کے ایم اے تک میرے سارے سرٹیفکیٹ اور ڈگریاں رکھی ہیں۔ انہیں کھو کر میری ساری قابلیت مشکوک ہو کر رہ

جائے۔ انہی کی بدولت آج میں اپنی یونیورسٹی کی انجینئرنگ فیکلٹی کا ڈین بن پایا ہوں اپنی ڈگریوں کے بیشتر مضامین میں بھول چکا ہوں لیکن میری طرف کوئی انگلی بھی نہیں اٹھا سکا میں پھر بے بسی سے مسکرانے لگا ہوں۔ سارا سوال تو لائسنس کا ہے ــــ فائل میں ایک کاغذ پر میری آنکھیں ٹھہر گئی ہیں ــــ ڈاکٹر کی یہ پرسکرپشن یہاں کیسے آ گئی؟ ــــ چند ماہ ہوئے بمبئی کا ایک مشہور ڈاکٹر یہاں آیا ہوا تھا۔ شوبھا کو دکھانے کے لیے میں اس کے پاس گیا تھا کہ ہمارے بچہ کیوں نہیں ہوتا۔ اس نے یہ دوا لکھ کر مجھے یقین دلایا تھا کہ دو تین مہینوں کے اندر اندر حمل ٹھہر جائے گا۔ یہ پرسکرپشن میں نے دوا لینے سے پہلے ہی کھو دی۔ ہم نے اسے بہت ڈھونڈا اور نہ ملی تو چپ بیٹھ گئے۔ اور اب یہ آپ ہی مل گئی ہے مگر اب کیا فائدہ؟ شوبھا تو دوائی کے بغیر ہی حاملہ ہو گئی ہے ــــ میں نے اپنے آپ کو اس طرح بتایا ہے جیسے وہ میرے ساتھ سوئے بغیر آپ ہی آپ میرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔

"شوبھا!" میں نے شوبھا کو پھر سے آواز دی ہے کہ اسے یہ پرسکرپشن دکھاؤں اور اس کا جواب نہ آنے پر سوچنے لگا ہوں کہ میرا لائسنس بھی اس وقت ملے گا جب اپنی ضرورت کھو چکا ہوں گا ــــ

اپنے گھر کے آس پاس میں اکثر ایک پاگل بڈھے کو دیکھتا ہوں جو پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوتا ہے۔ گلے میں انگنت چابیاں لٹکائے ہوتا ہے۔ اس کی جیبوں میں بے حساب کاغذ ٹھنسے ہوتے ہیں اور کندھے پر رکھی لاٹھی پر بندھی ہوئی گٹھڑی سے عجیب و غریب اشیاء اپنے سر باہر لٹکائے ہوتی ہیں۔

میری بیوی نے مجھے بتایا کہ یہ بڈھا کبھی بہت بڑا ساہوکار تھا اپنا سب کچھ سنبھال سنبھال کر آخر پاگل ہو گیا۔ اب وہ گویا اپنے ماضی میں ہی رہتا ہے اور اپنی دولتوں کی ضرورتوں کو جان سے لگائے مارے مارے گھومتا پھرتا ہے۔

"اسی لیے مجھے کہتی رہتی ہو اپنا سب کچھ سنبھال کے رکھا کرو؟"

"نہیں، تم تو کھو کھو کر پاگل ہو گے"

"تمہیں تو نہیں کھویا"

"میری بڑی خواہش ہے مجھے بھی کبھی کھو دو اور پھر ڈھونڈ ڈھونڈ کر جا کر سو جاؤ"

شوبھا کو معلوم نہیں ہے کہ شکل بدلنے کے سراغ میں اپنا وقت برباد نہیں کرتا۔ بھانت بھانت کے انجانے جذبے خون میں بے کل ہلچل پیدا کرتے رہیں تو آدمی کا درون ویسا ہی حلیہ اختیار کر لیتا ہے جیسا اس بڈھے پگلے کا بیرون۔ شوبھا سے میں اس لیے محبت کرتا ہوں کہ ٹیلیفون، ٹوتھ پیسٹ، پین اور گاڑی کے مانند وہ میری ٹھوس ضرورت ہے۔ اسے واقعی معلوم نہیں میں اسے کھو دوں تو سچ مچ پاگل ہو جاؤں۔ جب کبھی وہ مجھے دھمکاتی کے پیار کا طعنہ دیتی ہے تو میں اسے گلے لگا کر یقین دلاتا ہوں کہ میرا سارا واسطہ اسی سے ہے وہ مجھے میرا کیا سروکار؟ اور میں اس سے جھوٹ نہیں بول رہا ہوتا کوئی سروکار ہی ہوگا جو خالی جذبے کر کے گلے میں باہیں ڈال کر اپنی باپ بننے کی خواہش کو پورا کرنا چاہتا ہو۔

شوبھا بج دھج کر کمرے میں داخل ہوئی ہے اور اس کی تابندہ آنکھوں نے مجھے بے اختیار اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ میرا بچہ اس کی کوکھ سے جاگ کر پھر اس کی آنکھوں میں مچل رہا ہے۔

"بیٹھ جاؤ، کھڑی کیوں ہو؟"

"ڈاکٹر کے پاس نہیں چلو گے؟ چھوڑو لائسنس وائسنس کو"

"چلو"

"پہلے منہ ہاتھ تو دھو لو"

"نہیں، میں ٹھیک ہوں، آؤ"

ہم دونوں اپنے فلیٹ سے نکل کر اپنی گاڑی میں آ بیٹھے ہیں اور گاڑی کا انجن سٹارٹ کرتے ہوئے مجھے لگا ہے کہ میں جرم کا ارتکاب کر رہا ہوں۔ اگر لائسنس نہ ملا تو مصیبت آ جائے گی۔ میں نے اتنی مضبوط احتیاط سے گاڑی کو چلانا شروع کیا ہے کہ گھر کی باؤنڈری سے باہر نکلتے ہی دائیں طرف سے آتی ہوئی ایک گاڑی سے ٹکراتے ہوئے بال بال بچا ہوں۔

"آرام سے چلاؤ، گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

شوبھا کی ڈاکٹر کا دواخانہ ہماری سڑک میں ہی فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ پر واقع ہے۔ میں اپنی ہڑبونگ میں دواخانے سے آگے نکلا جا رہا ہوں کہ شوبھا نے چلا کر کہا ہے، کہاں جا رہے ہو؟ ــــ میں نے یکلخت بریک لگا کر گاڑی روکی ہے اور ہمارے پیچھے سے آتی ہوئی ایک تیز رفتار گاڑی سے کسی نے سر نکال کر مجھے گالی دی ہے جسے تسلیم سے سن کر میں نے گاڑی کو ڈاکٹر کے کمپاؤنڈ کی طرف موڑ لیا ہے۔

ڈاکٹر اپنے مشورے کے کمرے میں ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ میں شوبھا کو اس کے پاس چھوڑ کر باہر آ بیٹھا ہوں۔ ڈاکٹر کے لاؤنج کی دیواروں پر بڑے خوبصورت بچوں کی تصویریں آویزاں ہیں۔ ایک ایک بچے کو نہایت پیار سے دیکھتے ہوئے میرے بوجھل دل و دماغ ہلکے ہونے لگے ہیں۔ میرے عین سامنے ایک بہت بڑی تصویر میں ایک نہایت خوبصورت گول مٹول بچہ سر اٹھائے ہنس ہنس کر بے دم ہوتے ہوئے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل میری طرف تیز تیز بڑھتے چلا آ رہا ہے۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس کے قریب آ کھڑا ہوا ہوں کہ اس کے تصویر کے باہر آتے ہی میں اسے اپنے بازوؤں میں لے لوں گا۔

میں دیر سے یہیں کھڑا ہوں اور بچے پر ٹکٹکی باندھے ہوئے ہوں اور اس کی بشاش لوٹنوں کو اپنے خون میں محسوس کر رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ کام کاج سے فارغ ہو کر مجھے اپنا سارا وقت شوبھا کے ساتھ بتانا چاہیے۔ اس کی دلجوئی میں کوئی کسر روا نہیں رکھنی چاہیے ــــ میرے ذہن سے پیار کا فوارہ

باقی: ایکائی کے بعد میں۔

گرداب

مقصود الہٰی شیخ (یو کے)

بات ایک سے دوسرے کان، دوسرے سے تیسرے مکان اور تیسرے سے چوتھے محلے تک گردش کرگئی۔

عارفہ کی بیٹی بھاگ گئی

آناً فاناً جاننے والے جان گئے!

عارفہ کی بیٹی ثمر فرار ہوگئی۔

عارفہ نے بہت سوچا ایسا کون تھا جس نے یہ آگ لگائی؟ اس کا تو کوئی دشمن نہیں تھا۔

بیٹی کی ایسی وحشت بھری جدائی سے دل فگار تھا، پھٹا جا رہا تھا۔ حیران پریشان عارفہ کا جینا دوبھر ہوگیا۔ در و دیوار کہہ رہے تھے ثمر بھاگ گئی وہ بھاگ گئی!!!

عارفہ بریڈفورڈ میں رہتی تھی اور ثمر نوٹنگھم یونیورسٹی میں پڑھتی تھی، ہوسٹل میں رہتی تھی۔ آتی جاتی تھی۔ یونیورسٹی میں چھٹیاں ہونے پر وہ گھر نہیں پہنچی۔ دو چار روز انتظار میں گزرے۔ فون نہ آیا تب عارفہ کو تشویش ہوئی۔ مصلحتاً پولیس میں گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے سے گریز کیا۔ چپکے چپکے جن پر بھروسہ تھا، ان سے معلوم کیا۔ سبھی بے خبر نکلے۔ ہمدردی کر سکتے تھے اور تلاش کا وعدہ!

تلاش تو تھی مگر بھاگ گئی کا ڈر زیادہ تھا۔

پھر،

عارفہ کو معلوم ہوا ثمر کا قریبی دوست تبریز بھی غائب ہے۔

یا اللہ کیا کروں؟ کیا ہوگا؟ عارفہ دن رات کانٹوں پر لوٹ رہی تھی۔

ایسے میں ایک روز صبح ثمر کا فون آیا۔ لگا دور دراز سے بول رہی ہے۔ چھٹیاں شروع ہونے پر اچانک پروگرام بن گیا۔ میں اور تبریز اسپین آگئے۔ عجلت میں آئے تھے۔ آپ کو اطلاع نہ دے سکے۔ رہائش کا انتظام کیے بغیر آئے تھے۔ مناسب رہائش ڈھونڈنے میں خاصا وقت لگ گیا۔ آپ کو پریشانی ہوئی ہوگی۔۔۔ سوری ماما! عارفہ تبریز کو جانتی تھی۔ وہ پاکستان سے پڑھنے آیا تھا۔ بھلا سا لڑکا۔ دونوں دیکھتے ہی ایک دوسرے کے اسیر ہوگئے ہوں گے۔ دوستی روز بروز بڑھ رہی تھی۔ جسے دیکھتے ہوئے عارفہ کی تو امید بندھ رہی تھی وہ تعلیم پوری کرتے ہی شادی کے بندھن میں بندھ جائیں گے۔

پھر،

یونیورسٹی کھل گئی۔ ثمر نہ آئی۔ کوئی فون یا خبر بھی نہ آئی۔ دونوں لاپتہ ہے۔ عارفہ گھبرا گئی۔ اس کی زندگی اجیرن ہوگئی۔ جیتی تھی نہ مرتی تھی۔ بیٹی کی جدائی تڑپا رہی تھی۔ مجبوراً پولیس میں گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی۔ ثمر کی تصویر اور کوائف دیے مگر دوست تبریز کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ کیا خبر کس طرح آیا ہے؟ کل کو کسی الجھن کا سامنا کرنا پڑے تو؟ وہ نوٹنگھم بھی گئی۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے پولیس کو بتایا اور عارفہ کی درخواست پر ثمر اور تبریز کی گمشدگی کو جوڑ کر بیان کرنے سے گریز کیا۔ عارفہ کی خواہش تھی کہ دونوں جگہ کی پولیس تفتیش ضرور کرے آپس میں تعاون ہو لیکن ثمر اور تبریز کا معاملہ علیحدہ علیحدہ رکھا جائے۔ پولیس نے کمیونٹی اور ریس ریلیشنز کے خیال سے ثمر اور تبریز کے ایک ساتھ غائب ہونے کو راز میں رکھنے اور پوری مدد کرنے کی حامی بھری۔ وہ ایشیائی سماج سے ایک حد تک واقف تھے۔ لڑکوں کی بات اور ہے لیکن لڑکی کا اغوا یا فرار خاندان پر انمٹ دھبہ لگا دیتا ہے۔ لڑکی کی زندگی خراب ہوجاتی ہے۔ عمر بھر کا طعنہ بن جاتا ہے۔

عارفہ کو ایسے کرب کا سامنا تھا جو اس کی روح کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ بیٹی کے یوں بچھڑ جانے کا غم، اس پر یہ کم کون ہے جس نے یہاں سے وہاں تک فرار کا قصہ مشہور کردیا۔ بیٹھے بٹھائے فون آجاتا۔ ثمر آگئی؟ عارفہ جب جب ثمر اور تبریز کا سوچتی یہ خیال تنگ کرتا یہ پراسرار آواز کس کی ہے؟ کسی کے ساتھ اس کی دشمنی نہیں پھر؟ آخر یہ کون؟ خوامخواہ بدنام اور پریشان کر رہا ہے۔ اس نے تنگ آکر مکان تک بدل لیا۔ یہ خبر بھی اسے جانے کیسے مل گئی؟ وہ کون ہے جو اتنے قریب سے جانتا ہے کہ ثمر اور تبریز غائب ہیں۔ یہ وسوسہ بھی آتا کہیں دونوں کسی حادثہ کا شکار تو نہیں ہوگئے؟

گھر پر اکیلے بے مصرف بیٹھے بیٹھے عارفہ حواس باختہ ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے دھیان بٹانے کو اپنی پرانی ملازمت جوائن کر لی۔

دفتر، کام، گھر اور گھر داری! دل کہاں لگتا تھا پھر بھی دماغ ٹھکانے سے تھا۔ رنج کیا ہوتے۔ پولیس اسٹیشن کا پھیرا کر لیا۔ پر جب وہی بدبخت گمنام کال فون کر کے پوچھتا بیٹی آگئی؟ تو یوں دشمنی میں یاد دلانے پر اس کا دل چاہتا دیوار میں جا سر مارے۔ عارفہ بے بس تھی۔ بیٹی کی جدائی کا داغ بھلانے پر قادر نہ تھی۔ بہر صورت یہ عزم کر رکھا تھا اسے پاتال میں اترنا پڑے تو بھی ثمر بیٹی کو ڈھونڈ نکالے گی۔ لیکن سراغ نہ ملنے کے کارن دن بدن یہ خیال حاوی ہوتا جا رہا تھا ضرور کوئی حادثہ ہوگیا ہے ورنہ اس کی بیٹی، ذہین فطین ثمر اپنی ماں کو اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے کب اکیلا چھوڑنے والی تھی۔

ایک روز

اچانک پولیس نے اطلاع دی کہ دونوں اسپین گئے ہی نہیں تھے۔ [illegible] کہ وہ سیدھے پاکستان چلے گئے۔

اس کے بعد پولیس سست پڑ گئی۔ کئی بار عارفہ کے دل میں تعصب جاگا کہ پولیس لاپرواہی کر رہی ہے۔ وہ پوچھتی کوئی پراگریس؟ تو ادھر ادھر کی ہانک کر اسے ٹال دیا جاتا۔ عارفہ نے تو بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا تھا کہ یہ شوشہ، نئی افتاد آ پڑی۔ اس کی بیٹی ایک پاکستانی کے ساتھ چپ چپاتے پاکستان چلی گئی۔ آخر کیوں؟ ان کی شادی پر وہ راضی تھی۔ کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

دوسرے شہر میں پیدا ہوئی، پلی بڑھی۔ اس کا وہاں کون تھا؟ کوئی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔ تبریز پاکستان کا تھا۔ پاکستان سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے آیا تھا۔ تبریز کے متعلق سے عارفہ کو زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ اس نے پوچھ گچھ کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ کیا اس کا اتہ پتہ پوچھتی۔ کوئی انکوائری بٹھاتی تھی؟ اس کا اتہ پتہ بھی نہیں جانتی تھی۔ شمسہ سے اتنا معلوم ہوا تھا کہ اچھے خاندان کا ہے۔ ماں باپ، بہن سب پاکستان میں ہیں۔ خوشحال گھرانہ ہے۔ تبریز کے ڈیڈی ایڈووکیٹ ہیں۔ رسوخ والے ہیں۔ بڑی پہنچ ہے۔ رسائی ہے۔ شمسہ کو خوش دیکھ کر وہ اتنی مطمئن کہ تبریز کے ڈیڈی کا نام تک نہ پوچھا۔ جانے شمسہ کو بھی معلوم تھا یا نہیں۔ اسے اپنی لاپرواہی پر اب تعجب، افسوس اور ملال تھا مگر کیا ہو سکتا تھا۔ پولیس یا یونیورسٹی والوں کو خبر ہو گئی مگر اسی کے کہنے پر انہوں نے تبریز کے معاملہ کو الگ رکھتے ہوئے سراغ لگانے میں جتے ہوئے تھے۔ جب سے پتہ چلا کہ وہ دونوں اسپین ہیں سیدھے پاکستان گئے ہیں دونوں ادارے اس کے ساتھ زیادہ ہی معلومات شیئر کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ عارفہ بار بار پولیس کے یہاں دستک دیتی لیکن ناکام لوٹتی۔ لہٰذا اس کے ساتھ کوئی بھی پہلے سا ہمنوا یا ہمدردی نہیں کر رہا تھا۔

پھر،

جیسے اس کی بے قراریوں کو مایوسی نے نگل لیا۔ جیسے عارفہ تھک کر رہ گئی ہو۔ تعلیم یافتہ تھی۔ قانون سے واقف تھی۔ اس کے باوجود بے بس تھی حالانکہ خون کے رشتوں کے آگے سب ہیچ ہے۔ سیاہی کے بعد وہ اپنے سماج سے بھی خوف زدہ دکھائی دیتی تھی۔ جیسے اس نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہو کہ اس کی بیٹی شمسہ اب نہ ملے گی۔ اسے یہ سوچنے میں راحت ملتی کہ کوئی کچھ کہے، اس کی بیٹی نے خود اسے فون پر کہا تھا کہ وہ اسپین میں ہے۔ یہی کہا تھا اس نے اور اس کے بعد وہ تبریز کے ساتھ غائب ہو گئی۔ زمیں کھا گئی یا آسمان نے اچک لیا۔ پولیس تفتیش، تحقیق کچھ نہیں۔ ان کے ساتھ ان ہونی ہو گئی ہے اور وہ خلاؤں میں گم ہو گئے ہیں!!

اس یاسیت میں بھی عارفہ کو موہوم سی، مبہم امید تھی۔ اسی ایک سہارے پر ایک بے بس ماں جی رہی تھی ورنہ تو جیسے شمسہ کو کچھ پیش نہیں آیا عارفہ ہی مر چکی ہے۔ شمسہ زندہ ہے اور سانس لے رہی ہے۔ یقیناً دوری ہے پر کہیں ایسا بھی نہیں اس کی دلداری بھی کہیں آس پاس ہی ہے۔ ابھی بھی اس نے محسوس کیا تھا۔ وہ اس پل بھی شمسہ کی موجودگی محسوس کر رہی ہے۔

صبح کا ہونا، شام پڑنا۔ دفتر جانا، گھر آنا!!

اپنے جگر گوشے سے جدا تنہا، اکیلی ماں کے شب و روز یہی دستور تھا۔

اور دنیا میں رکھا کیا ہے؟

دنیا یہ بھول کے کہیں دے رہی تھی، آج بھی ایک سے دوسرے کان، دوسرے سے تیسرے مکان اور تیسرے سے چوتھے محلے میں سب کی پسندیدہ گوسپ بنی تھی کہ عارفہ کی بیٹی بیوہ ماں کو چھوڑ کر فرار ہو گئی۔ کئی خواتین کہتیں اب وہ آئے گی بھی نہیں۔ لڑکا بڑا ہینڈسم تھا۔ دولتمند خاندان سے تھا۔

اس پر وقتے وقتے سے ایک پر اسرار فون آتا۔ یہ آواز اب پہچانے ہی عارفہ کے تن بدن میں تھرتھری سی پیدا ہو جاتی۔ لیکن اس پر نظر رکھتا ہے۔ وہ کہاں جائے؟ کس سے فریاد کرے۔ اسے کیوں ستا رہا ہے۔ اگر وہ صرف اتنا بتا دے کہ اس کی شمسہ کہاں ہے؟ زندہ ہے تو وہ اسے معاف کر دے گی۔ ایک دو بار اسے رنگ کے بالکل دوسرے سرے پر ایک ہیولا سا دکھائی دیتا اور وہ سوچتی یہ وہی تو نہیں؟ وہ کون؟ اس کون کو ٹرانسلیٹ کرتے ہوئے وہ کپکپا جاتی۔ وہ ہو تو سکتا ہے جس کے ساتھ اس کا رشتہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ رشتے اکثر ٹوٹتے رہتے ہیں۔ اس پرانے زمانے کی طرح جاہلوں کی طرح خونی جھگڑے کم از کم اس ملک میں تو نہیں ہوتے۔ یہاں کا قانون اجازت نہیں دے گا۔ عارفہ بھول بھی گئی تھی کہ مدتوں پہلے پاکستانی بینک میں ایک صاحب نام جن کا غیور بٹ تھا، جاب پر آئے تھے۔ ان کے ساتھ عارفہ کے ڈیڈی میر قمر زمان کا تعارف ہوا۔ تعلقات بڑھے۔ دونوں خاندانوں میں میل ملاپ اور قربت و خیرسگالی دیکھ کر دوسرے لوگ رشک کرتے تھے۔ ایک روز غیور بٹ صاحب نے اپنے بیٹے تحریم کے لئے عارفہ کا رشتہ مانگ لیا۔ کوئی رسمی رسم نہ ہوئی۔ انڈر اسٹینڈنگ سی ہو گئی۔ جب میر صاحب کو احساس ہوا بیٹی رخصت ہو کر پاکستان چلی جائے گی تو انہوں نے بٹ صاحب سے معذرت کر لی۔ بات آئی گئی ہوئی۔ تین سال بعد غیور صاحب پاکستان جاتے ہوئے اپنے بیٹے تحریم کو ایک مکان خرید کر دے گئے کہ جب وہ آکسفورڈ یا کہیں اور جائے گا تو مکان کے کرائے سے اخراجات پورے کرنے میں مدد ملے گی۔

اس کے بعد دونوں خاندانوں یا لڑکے لڑکی کا کوئی رابطہ ہوا نہ سامنا۔

"صدیاں" بیت گئیں۔

کیا وہی سامنے آ گیا تھا۔

سوال تھا کیا عارفہ اپنے خدشے سے پولیس کو آگاہ کر دے؟ ہاں وہ بتانا چاہتی تھی کہ بچو! دھندو کہیں وہی انتقاماً تو پیچھے نہیں؟ اسی نے تو اس بدنصیب پر نظر رکھی ہو؟ بے رحم ستا رہا ہے۔ اسے خدا کا خوف نہیں؟ جب دو خاندانوں میں کوئی تعلق نہ رہا۔ کوئی سا سمبندھ باقی نہ رہا اور اتنا وقت گزر گیا، پھر اس کی عداوت کا مطلب؟ کہ دوسری نسل کے بچوں تک کو نہیں بخشا جا رہا۔ کوئی تعلیم یافتہ اتنا پست خیال نہیں ہو سکتا۔

یہ بات نہیں، یہ سب پولیس کو بتانے کی ہمت عارفہ میں نہیں تھی۔ ہمت تھی۔ یہی خیال آتا تھا کہ کہیں ایسا کرنے سے معاملات مزید نہ الجھ جائیں۔ وہ ایک بیٹی کی ماں ہے۔ اس کے آگے یہ اس کی سوچ تھم پڑ جاتی۔ اس کے پاس یوں سوچنے کا کوئی جواز بھی نہ تھا۔ یہ عجب سلسلہ تھا کہ جب کبھی اس نے اس بارے میں پولیس کو رپورٹ کرنا چاہا، پر اسرار فون آنا بند ہو جاتا۔ بس یونہی بے سبب دن گزر رہے تھے۔ عارفہ اللہ تعالیٰ سے فریاد

کرتی کسی طرح اس کی آزمائش ختم ہو۔ شمسل جائے یا اسے پتہ چلے وہ زندہ ہو۔ جہاں رہے سلامت رہے۔

کوئی کشمکش سی کشمکش تھی! ایک دن اچھا تو دوسرا انتہائی خراب اور پریشان کن!

وہ بھی ایک عام سے دن کی طرح دوپہر کی کسی قدر خنک سہ پہر تھی۔ اچانک بڑی گھٹن لگنے لگی۔ عارف کا دل کسی بات میں نہیں لگ رہا تھا۔ ٹی وی۔ پینٹنگ۔ اخبار۔ میوزک۔ صبح جیسے وہ عارف نہیں کوئی سایہ یا آسیب ہے کہ پرچھائیں بنی گھر میں گھوم رہی ہے۔ گھٹن گھٹن گھٹن، عجب بے خیالی تھی کہ خیال آیا اس نے کبھی بیک گارڈن میں، ایک مدت سے گھر کے پچھواڑے میں جھانکا تک نہ تھا۔ دفتر آتے جاتے فرنٹ گارڈن پر نظر ڈالتی اور جان لیتی مالی دیکھ ریکھ کر رہا ہے۔ محلے کے نفیس اور صاف ستھرے گھروں میں اس کے گھر کا شمار ہوتا ہوگا۔

یہی خیال ہو گا۔ یہی کچھ سوچتے ہوئے عارف نے چٹخنی (Patoi) کھولا۔ باہر جھانکا تو اس کا دل کھل اٹھا۔ ہوا نے چھوا تو بدن میں تازگی آ گئی۔ اس نے باغیچے کا چکر لگا کر ڈوگ ہاؤس کی مخالف سمت پڑی ہوئی میز کرسی کا رخ کیا، کرسی پر بیٹھ کر عارف نے پیر میز پر رکھتے ہوئے آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان نیلا اور شفاف تھا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ یہ سب کتنا اچھا ہے۔ یہ اس کی آواز تھی۔ اس کے کانوں سے مس ہوئی تو وہ حیران ہوگئی۔ یہ کلمہ حیات آفریں اور بڑا مسرت انگیز ہے۔ کیسے اور کیوں کر اس کے ہونٹوں پر آیا؟ کیا؟ کیا؟ دل کے سب سے نہاں خانے کے کسک ابھری۔ شمسل کے گم ہو جانے کا صدمہ ہلکا پڑنا شروع ہو گیا؟ کچھ ایسی ہلچل کیفیت تھی کہ وہ نروس ہو کر رو دی! نہیں پیاری پیاری شمسل اس کے من میں بسی ہے۔ اسے وہ کبھی بھلا نہیں سکتی۔ مجبوری ہے کہ اس سے ملنے کی آس میں زندگی تو بسر کرنی ہے کہ جب وہ آئے تو دوڑ کر لپٹ کر اس کا استقبال کروں! یقین ہے وہ دن آئے گا جب اس کی ساری، اس کی سسکی، اس کی ہیر جیسی ہنسی مل جائے گی۔

عارف نے نہایت جھک کر آج کے روشن دن اور چاروں طرف پھیلی سبز سبز خوبصورتی کو سراہتے ہوئے موسم پر توجہ مرکوز کی اور مسکرا دی۔ انگریز کے مزاج کے خلاف انگریزی موسم کتنا ناقابل اعتبار اور غیر مستقل ہے۔ مئی کا مہینہ آ گیا اور حال یہ ہے کہ دھوپ میں بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے۔ کل تھوڑی سی بارش اتنی سردی لے آئی تھی کہ سارا دن سنٹرل ہیٹنگ چلانا پڑی تھی!

عارف نے اپنے تھوڑے سفید ہوتے بالوں میں پتلی پتلی انگلیوں سے کنگھی کی۔ سامنے سے ایک گلہری پھدک کر سامنے آئی جیسے آداب بجا لائی ہو۔ پل بھر کو ٹھہری۔ ادھر ادھر تاکا اور پھرتی سے سیب کے درخت پر چڑھ گئی۔ دور کہیں فاختہ بولی۔ اسی باغیچے میں عارف نے کالی کوئل کی کوک سنی ہے۔ اس نے دعا کی اللہ اس وقت تو کوئل نہ گائے اس کی کوک سے عارف کا گھٹن دل چیر کر تو

دکھ دے گی! جنوب سے کالے ٹڈوں کا غول کائیں کائیں کرتا گزرا عارف کے کان جھنجھنانے لگے۔ اس نے منہ پھیرا تو اوپر بیڈ روم کی کھڑکی دکھائی دی۔ سویرے سویرے فریش ائر کے لئے کھڑکی کھولتے پر چڑیوں کے غول اڑتے دیکھے اور چہکتے سنے ہیں۔ پیلی چونچ چمکدار رنگ برنگے پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ نے، ان دنوں اکثر ہی پوچھا ہے کیوں ری تنہا عارف غم صرف تمہیں کو ملا ہے؟ بچی کا وچھوڑا اور یہ تنہائی کی قسمت کیا دکھی، بھوکے اور بچھڑے ہوئے مجبور بندوں کی غم تا کیوں سے زیادہ ہے؟ غم صرف تمہاری ملکیت نہیں، غم بڑی بے کل ہے۔ اس سے مفر نہیں مگر اس کائنات کی ڈھیر ساری نعمتوں میں سے کبھی بھر غم بھی خوشی دینے والے کی طرف سے ہے۔ اس پر کڑھنا، بھولنا، صرف نظر کرنا جیون کے مالک کا انکار ہے۔

عارف کے دل کا بھاری پن کم ہوا۔ پرندوں کے درمیان کمیونیکیشن کے مشاہدے سے لذت آشنائی رکھتی تھی۔ ایک نے دانہ دنکا دیکھا دوسروں کو بلا لیا۔ یہ پرندے کون سی زبان بولتے ہیں؟ وہ بھی شاید یہ بھی انگریزی کی کوئی سی (dialect) بولتے ہوں گے۔ جیسا دیس ویسی بولی!!

اس کا اپنا ہر طبقے کے لوگوں سے انٹرایکشن رہتا ہے۔ وہ کئی بولیاں سن سمجھ اور بول لیتی ہے۔ لے کلچر سے، ادب سے، زبان سے دل چسپی ہے۔ وہ رضاکار بن کر فریضہ جا چکی ہے۔ پاکستان کے زلزلے میں کے دنوں میں موقع پر دکھی انسانوں کا درد بانٹنے کی راحت چکھ چکی ہے۔ کیونکہ وہ ورک کے کنٹیل اس کا وژن فراخ ہوا۔ اس کا تصور انگڑائی لے کر بیدار ہو چکا تھا۔ عارف تصور ہی تصور میں دور تک چلی گئی۔ ہم لوگوں نے اپنا لباس، خوراک، زبان، رسم و رواج کس قدر سنبھال کر رکھا ہے۔ تو انہیں کوئی [illegible] رہی ہیں۔ مسجدیں آباد ہیں۔ گوروں کو برقعوں یا حجاب پر اعتراض ہے نہ اچکن شلوار میں لمبی لمبی داڑھیوں والے مولویوں پر طعن کرتے آوازے کستے ہیں۔ بعض اسکولوں میں بچوں کی وردی کے حوالے سے دو ایک بار چخ ہوتی ہے چھوٹا موٹا جھگڑا بھی ہو جاتا ہے لیکن میلاد کی محفلوں، عید میلاد کے جلوس کی رونق، گھریلو تقریبات عقیقہ، ختنہ، مایوں، مہندی، منگنی، شادی بیاہ کے شور ہنگامے، خواتین کے زرق برق ملبوسات، نئے نئے زیور گہنے کیسے کیسے چلے گئے ہیں۔۔۔۔

بڑی جدوجہد سے لڑکیوں کو اپنا لباس پہننے کی اجازت ملی تھی۔ وہ دن بھی عجب تھے۔ کسی نے بکرا یا مرغی ذبح کی انگریز پڑوسی نے پولیس بلا لی۔ کتنا کچھ بدل گیا ہے۔ پہلے مقامی لوگوں کو کری کی خوشبو اور ہمارے طور طریقے ناقابل برداشت تھے۔ اب دوسری اقلیتوں کے ساتھ ہم ایشیائی بھی [illegible] کے ساتھ (co -exist) کر رہے ہیں۔

عارف کی سوچ واقعی لمبی ہو گئی تھی۔ غم جہاں غم جاناں بھلا دیتا ہے لیکن وہ ابھی پوری طرح اپنی فکر کے دائروں سے باہر نہ آئی تھی۔ کیا آنے والی نسلیں بھی اس ورثے کو سنبھال سکیں گی یا ولایتی رنگ میں رنگی جائیں گی؟

عارفہ اکثر بیٹی کے ساتھ دل کرتا طرح خیال کرتی تھی۔ اپنی ذات سے نکل کر کمیونٹی کے بارے میں قیاس آرائی کرتی تھی۔ جہاں تک زبان، خیالات اور لباس کا تعلق ہے سب کچھ دھیرے دھیرے بدل جائے گا۔ وہ یہ تبدیلی آتے دیکھ رہی تھی۔ خطرہ اور خدشہ یہ تھا کہیں یہاں کی انفرادی آزادی ہماری روایتوں پر غالب آ گئی تو؟ ہم اس معاشرے میں مکمل طور پر مدغم ہونے تو نہیں جا رہے؟ یہ بھی ممکن ہے یہاں سے نکال دیئے جائیں۔ البوی اٹلی نے رنگ یا نسل کی بنیاد پر ایشیائیوں کو نکالا؟ اسپین سے مذہب کی بنیاد پر صدیوں بعد مسلمانوں کو سمندر میں دھکا دیا گیا تھا کہ نہیں؟

عارفہ لمحہ کا کاؤ محسوس کئے بنا نہ رہ سکی۔ اس کا دھیان اسپین میں شمسہ کی طرف مڑ گیا۔ شمسہ نے تو جیسے دو سال پہلے شیراز کی حرکت قلب بند ہو جانے پر وفات کے سوگ کو سے سرے سے جگا دیا ہے۔ پہلے ایک پہلو میں دکھن تھی وہ اب دوسرے پہلو میں رنج و غم اور بے چینی بھری پیڑ ہو رہی ہے۔

عارفہ کی شیراز سے شادی بھی کم ہنگامہ خیز نہ تھی۔

شادی کی تقریب ایک پنج ستارہ ہوٹل کے لمبے چوڑے ہال میں ہوئی تھی۔ سینکڑوں مہمان آئے تھے۔ مبارک سلامت سے ذرا پہلے مولوی صاحب کے کان میں کسی کو سرگوشی کرتے دیکھا گیا۔ کوئی آیا اور پل کی پل میں چھلاوے کی طرح بھیڑ میں گم ہو گیا۔ کوئی اسے نہ پہچان سکا۔ اسی وقت مولوی صاحب عجلت اٹھے۔ رجسٹر بغل میں دبایا، سرٹیفکیٹ دیا، فیس لی اور چلتے بنے۔ کسی نے دیکھا، اکثر نے نہ دیکھا۔ عارفہ کے ڈیڈی میر قمر زمان آگے بڑھے، لڑکی لڑکے سے ایجاب و قبول کرایا اور مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔ مہمانوں میں سے بہت سے ایک روز قبل جنٹریشن یعنی انگریزی شادی میں شرکت کر چکے تھے۔ اس لئے مطمئن تھے۔ نہیں کوئی غرض نہ تھی کیا ہوا، کیا نہیں ہوا۔ مولوی صاحب کی اتری، ان کی جھلک ہی برکت کے لئے کافی تھی۔

چند ہی دنوں میں ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے چوتھے ڈرائنگ روم میں زور دار گپ چل نکلی۔ بے خبر ماموتی کر نکاح کے بغیر لڑکی کو رخصت کر دیا گیا۔ بظاہر مولوی صاحب پر تنقید ہو رہی تھی کہ وہ بتاتی ہوئی، اس طرح نکاح پڑھائے بغیر ہال کیوں چھوڑ گئے وہاں جو جو جوں کی شادیاں فسخ نہ ہو گئی ہوں؟ نکاح نہ ٹوٹ گئے ہوں؟ نئے سماج میں بالخصوص اقلیتوں میں مذہبی پیشواؤں کا دباؤ تو ہوتا ہے۔۔۔۔ عارفہ نے سنا، رنجیدہ اور غمگین ہوئی۔ شیراز کے ساتھ اس کے مقدس رشتے پر کیچڑ اچھالا جا رہا تھا۔ جس نے شوہر چھوڑ دیا ہو دے میں تھا مگر اپنی گمنامی حرکت کی وجہ سے پاس پڑوس بلکہ دور تک کئی دفتر تک سوالات ہو گیا تھا کہ اول نکاح نہیں ہوا نکاح نہیں ہوا، اس لئے گناہ ہو رہا ہے۔ اس کا عذاب سب پر ہوگا۔ مولوی صاحب اچھے تھے۔ ان کی خاموشی الگ تغییر پیدا کر رہی تھی۔ بڑے بڑے آزاد خیال لوگوں کو

قل لسٹ اپ لگ گیا تھا۔ ابھی یہ کھسر پھسر جاری تھی کہ نیا طوفان اٹھا جس کی زد میں عارفہ اور شیراز رہے تھے اس کی دیوار پر دشنام اور بدنما نعرے لکھے گئے۔ کھوج پر دو نو عمر لڑکے پکڑے گئے مگر اس مہم کے پیچھے جو خفیہ ہاتھ تھا، میر قمر زمان اسے بے نقاب کرنے کے بجائے اگنور کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا اس نا روا حرکت کی روک تھام یا تفتیش زیادہ کی گئی تو الٹا پریشانی بڑھے گی۔ شیراز نے آدمی تھے۔ چپ سادھی اور دولہا دلہن کو شہر سے دور دراز علاقے پرائی رہائش میں روانہ کر دیا۔ دوسرا کوئی چارہ نہ تھا۔ اپنے لوگوں کی قربت میں ایسا تو ہوگا۔ یوں یہ گرد بھی اترنے سے پہلے ہی بیٹھ گئی۔

عارفہ اور شیراز کی ایک دوسرے کے لئے فریفتگی بے مثال تھی۔ اس سے گزر رہی تھی کہ خدا نے انہیں چاند سی بیٹی شمسہ دی۔ دکھائی نہیں دیتے پر وقت کو پر لگے ہوتے ہیں پھر بھی چاند کے پہلو میں بادلوں کے دوش پر اوپر اور اوپر اڑتا چلا جاتا ہے۔

شمسہ اسکول سے کالج اور یونیورسٹی گئی تو نانا بھولے بن سا تھے۔ نانی سمارٹ اور اچھے خاندانوں کے خوبصورت اور خوش اطوار سمارٹ لڑکوں کو ڈھونڈنے لگیں۔ یہ تو انہیں بہت بعد میں پتہ چلا کہ شمسہ دل نے چپکے ہی چپکے اپنے ہم سبق تبریز کو اپنا اسیر بنا بھی لیا ہے۔

کچھ طے نہ تھا۔ کوئی سا پروگرام نہیں بنا تھا۔ اندر ہی اندر کہا جا رہا تھا گریجویشن کے بعد شمسہ اور تبریز کی شادی کر دی جائے گی۔ در اصل جو ہوتا ہے وہ ہو جاتا ہے۔ یہ کسی نے سوچا بھی نہ تھا۔ اچانک دل کے حملے میں محترمہ ہوتا تو شیراز سب کو روتا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بزرگوں کی کمر ہی ٹوٹ گئی۔ ماں بیٹی کے لئے دکھ درد اور سوگواری تھی۔ رنج و غم اور اندیشے بہت تھے۔ عارفہ کو شمسہ اور شمسہ کو ماں کا سہارا تھا۔

وہ ایک بے بارش، کہر آلود اور سرد دن تھا۔ بے سُوا کیلا پن تھا۔ عارفہ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ فون بجا۔ خلل پڑا۔ بادل نخواستہ عارفہ نے موبائل آن کیا۔ ملنا۔ سنا۔ پولیس تھی۔ کوئی پاکستان سے امیگریشن لے کر آیا ہے اور پولیس اسے ملوانے کے لئے لانا چاہتی ہے۔ عارفہ کا دل اچھل کر بے طرح دھڑکا اور گلے میں آ اٹکا۔ اس نے اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے انہیں کی پولیس عام کار میں اور غیر کپڑوں میں آئے۔ ان کا ہمراہی شکل سے ہی پنجاب پولیس کا آدمی لگتا تھا۔ رسمی تعارف کے بعد عارفہ کو اطمینان دلاتے ہوئے انگریز اور اس کا ساتھی سکھ آفیسر یہ کہہ کر رخصت ہو گئے کہ عارفہ مہمان کے ساتھ محفوظ ہے۔ جو چاہے مدد کے لئے دوبارہ بلا سکتا ہے۔

پہچانا؟ نو وارد نے پوچھا۔

نہیں۔ مختصر سا جواب دیتے ہوئے بھی عارفہ کسمسائی۔ بھلا وہ اجنبی کو کیسے پہچان سکتی تھی۔ عجب احمقانہ سوال تھا۔

حمزہ!!

اس سے پہلے عارفہ کوئی ردِعمل ظاہر کرتی۔ آنے والے نے نہایت تہذیب سے معافی چاہتے ہوئے کہا کہ تمہاری شادی پر جو ہوا، اس کی جتنی بھی ملامت و مذمت کی جائے، کم ہے۔ وہ نوجوانی کی نادانی تھی۔ مجھے معاف کردو۔

عارفہ کو ایک بات یاد آگئی۔ اچھا تو کینہ دشمن معافی کا نیا ہتھیار لے کر آیا ہے۔ میرے شہر میں، میرے گھر میں، میرے سامنے بیٹھنے کی اسے جرأت کیسے اور کیوں کر ہوئی؟ پلوں کے نیچے سے اتنا پانی بہہ چکا تھا اس کو پتا بیکار تھا۔ اس نے لمبے وقفے کے بعد پولیس کے بیان کے پیشِ نظر کہ پاکستان سے فرسٹیشن آئی ہے۔ اپنا غصہ پی اور حواس جمع کر کے پوچھا۔ وہ تم تھے تو یہاں کیوں ہے؟ جواب پریشان کررہا ہے۔ میری بچی کو بیاہ کر دیا——

اس کے لئے بھی معافی چاہوں گا۔ ایک ناواقف امر کے سپرد اتنی چھوٹی سی ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ شمسہ کے زندہ ہونے کا یقین و احساس دلاتا رہے تاکہ تم مایوس ہو کر یاسیت میں نہ چلی جاؤ۔ وہ کند ذہن پہلے ہی دن بڑی سے اڑ گیا۔ شاید کچھ گھر کا ہوا بھی ہے—— پلیز میرا اعتبار کرو ہمارا اندیشہ یہ تھا کہ تمہیں پریشان کیا جائے بلکہ بعض امور کی مکمل معلومات جمع ہونے تک یہ چلہ کرنا پڑا۔ عارفہ کا ایک رنگ آتا ایک جاتا تھا۔ ابھی اسے شمسہ کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ وہ پوری طرح اپنے حواس قابو میں رکھتے ہوئے منتظر تھی کہ اگر یہ مردار شمسہ کی کوئی خبر لے کر آیا ہے تو بتاتا کیوں نہیں؟

میں یہ خوشخبری لے کر آیا ہوں کہ تمہاری بچی شمسہ زندہ سلامت ہے۔ وہ بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔ ذہین و فطین ہے۔

عارفہ ہمہ تن خاموش بت سی بیٹھی تھی اور بڑے غور سے سن رہی تھی۔

یہ سچ ہے تمہاری بچی شمسہ اور میرا بیٹا تبریز دونوں صحیح سلامت ہیں۔۔ پاکستان میں ہیں—— ان کی شادی ہو چکی ہے۔

عارفہ جانتی تھی یہ دنیا ہے۔ ہماری دنیا ہے۔ آس پاس دنیا ہی دنیا ہے۔ ہم یہ سب دیکھ رہے ہیں۔ بے دست و پا نہیں پھر بھی ہمارا کوئی عمل دخل نہیں۔ ایک تماشا گاہ ہے۔ ایک وسیع و عریض میدان ہے۔ سیاست کی بازی گری ہے۔ عارفہ خودگی کی سی حالت میں سوچنے سے زیادہ سن رہی تھی اور یقین کرنا چاہتی تھی کہ اس کی بچی شمسہ خیر و عافیت سے رہی ہے۔

آنے والا داستان کہہ رہا تھا۔

اس نے اپنا تعارف بھی کرایا۔ وہ ان دنوں ایک فورن سیکیورٹی ایجنسی میں اعلیٰ عہدہ رکھتا ہے۔ پاکستان میں القاعدہ کے لئے کام کرنے والے جب پاکستان میں گرفتار کر لئے جاتے ہیں تو ان قیدیوں کو گوانتانامو بے پہنچایا کرتا ہے۔ وہ بڑے اطمینان اور فخر سے اپنا سیکرٹ مشن بتا رہا تھا۔ اسے بھروسہ ہوگا کہ اس کا راز، راز رہے گا۔ اس مرتبہ وہ قیدیوں کو امریکیوں کے حوالے کر کے یہاں آیا ہے۔ بڑا مقصد تمہیں خوشخبری پہنچانی تھی۔ اس نے مزید بتایا وہ اردو انگریزی کے علاوہ پشتو جانتا تھا اس لئے آمد و رفت کے دوران کسی نہ کسی طرح معلوم کر لیا کہ تبریز افغانستان میں ہے۔ وہ شمسہ کو اپنی بہن مہر جبین کے پاس چھوڑ کر افغانستان چلا گیا۔ اس کا تعلق لال مسجد سے تھا۔ انتہائی مشکل کام تھا مگر اسے بالآخر افغانستان سے نکال ہی لیا۔ ابھی وہ دو ہیں پاکستان میں رہیں گے لیکن اطمینان رکھو میں بہت جلد دونوں کو یہاں لے آؤں گا تمہارے پاس۔

بت بنی عارفہ خواب کی سی حالت میں ساری حکایتیں، حقیقتیں سنتی رہی۔ اس کے اندر کا اس کی روح کا ایک ایک زخم رس رہا تھا، چیخ رہا تھا۔ آنکھیں نم ہو کر خشک ہو چکی تھیں۔ ایک پل جزرمے کراہت محسوس ہوتی تو دوسری پل جذبات خالی پن کا جامہ پہن لیتے۔ اس سے اگلے لمحے میں بجلی سی گری محسوس ہوتی۔ وہ جرمِ اس کرائے کے ٹٹو پر برس پڑنا چاہتی تھی۔ یہ ہے جس جانور صفت نے اپنے بیٹے کو امریکیوں کے حوالے نہ کرایا۔

عارفہ کے دل میں بچی شمسہ کی محبت ہی درد بھری کروٹیں لے رہی تھی۔ بچی سے جدائی اور مفارقت میں کتنی اذیت ہوتی ہے۔ کوئی پوچھتا بھی تو وہ بیان کرنے سے معذور تھی۔ کس کس طرح پر امراحزوں، اندوہوں پر عارفہ کی رگ رگ سے خونِ دل نچڑ رہا ہے؟ جان کنی کا عالم کیا اس سے بھی زیادہ تکلیف دے سکا؟

عارفہ گم سم تھی۔ رنج و الم درد و غم کی تصویر بنی جھلملا رہی تھی۔ بیچ بیچ میں لگا بھی کوئی اس کے ساتھ سرگوشیاں کر رہا ہے۔ اسے سنا رہا ہے وہ ان دونوں کو لے کر جلد ہی آئے گا۔

دونوں کو

شمسہ اور تبریز کو

شمسہ کو

شمسہ کو!!!

وہ بچی کی آمد کا اعتبار کرتے کرتے بے اعتباری کی سیج پر پہنچ جاتی۔ اس کے خیالات منتشر تھے۔ وہ ایک بے روح تماشا دور بے سکون جسم لئے بیٹھی تھی۔ اپنے دشمن کے جملوں کے نیزے کی ضربیں یاد کرتی خاموش سسکیاں لے رہی تھی۔ ماضی میں کھب کھب جاتی، ابھرتی تنفر کے دوزخ اور کبھی دوگز دے کے تیج ریلوں میں پوری قوت سے کنارے تلاش کرتی علاووں میں کھو رہی تھی۔

پھر

وہ چلا گیا،

آنے کے لئے!

اور

جب آیا

تھی

ثمرہ وتبریز کو بھرا ملا۔

عارفہ اتنے دنوں بعد بھی اس صورت حال کو سمجھ ہی نہ پائی تھی۔
سمجھ ہی نہ سکی تھی۔۔۔ بے حد محظوظ پہلے سے اتوں، کمرے، اپنے اردگرد کی سچائی
سے سمجھوتہ کرنے کے لئے شعوراً فکرمند تھی۔ اس کے کان پورے قد سے
کھڑے تھے۔ کیا ساتھ والا گھر، تیسرا ہمسایہ، چوتھا محلہ بلکہ پورے شہر کو خبر لی؟

ثمرہ آگئی ہے!!

کوئی صدا نہ اٹھی۔

کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔

کوئی طعنہ کوئی دشنام؟

اس کی حیرانی نہیں جاتی تھی۔

جاتا۔۔۔ آتا۔۔۔ ایک ہی تصویر کے دو رخ۔۔۔ پھر بھی اتنا فرق

ثمرہ بنی آگئی۔ اس کے ساتھ تبریز بھی آیا۔ سب یہ معلوم ہے
مگر عارفہ کو پتہ نہیں چل رہا تھا کہ خوش بھی ہے؟

وہ بڑی ہی عجیب و غریب ساعت تھی۔ بہت گھبرا دینے تھا۔
جانے کیسے اس نے حمزہ سے کہا اس کی بیٹی کو چھوڑ کر اپنے بیٹے کے ساتھ فوراً اس
کے گھر سے نکل جائے۔

وہ بڑی عجیب و غریب گھڑی تھی۔

عارفہ کی آواز کا اثر تھا، چہرے کے تاثر میں غضب کی تمازت
تھی یا قہر تھا، کیا تھا؟

حمزہ نے فوراً تعمیل کی

عارفہ نے

اپنی بیٹی

اپنی ثمرہ

اپنی مہر

اپنی سکی

اپنی سوتی

اپنی پیاری ثمرہ کو

"صدیوں"

تک گلے لگائے رکھا۔

عارفہ

صوفے میں دھنسی بیٹھی تھی

نہیں وہ رقص کر رہی تھی

وہ خاموش تھی

نہیں وہ گا رہی تھی

شیراز

شیراز آؤ

مجھے بتاؤ

مجھے بتاؤ

میں ہوں

نہیں ہوں

دیکھو میرے دل کی دھڑکنیں سو کیوں نہیں جاتیں۔

شادی مرگ کیوں نہیں ہو پا رہی۔

نہیں نہیں۔

اب میں جینا چاہتی ہوں۔ میری بچی آگئی ہے میری جنت
میرے پاس ہے

لمحہ لمحہ سرکتا رہا

وقت

دنوں میں ڈھلتا رہا۔

چند دنوں بعد

تبریز آیا، ساتھ حمزہ بھی تھا۔

اس سے پہلے کہ عارفہ پر وحشت طاری ہوتی، تبریز نے نہایت
ملامت سے نرم آواز میں کہا وہ ثمرہ کے لئے اسم لیں پر آیا ہے۔

پھر،

وہ عارفہ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اپنا سر عارفہ کی گود میں رکھ دیا۔
نظریں ثمرہ پر تھیں۔

وقت نہیں تھما۔ چلا گیا چلا گیا۔

جانے کب ثمرہ کافی کا کرب کے لئے لے آئی

وہاں

عارفہ کے گھر میں

دو مرد، دو عورتیں ہاتھوں میں کافی کے پیالے لئے چار آنکھوں سے
ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

یکایک سب کی آنکھیں چار ہوئیں نظروں میں بجلی بھری تھی۔ جل
تھل بھی تھا۔

حمزہ اٹھا

حمزہ نے ثمرہ کے سر کو ملاتی طور پر چھو کر تبریز کا کندھا تھپتھپایا

اور

ڈرامائی انداز میں،

زمین پر ایک گھٹنا ٹیک کر عارفہ کی طرف ہاتھ بڑھایا
مجھ سے شادی کرو گی؟

اُبکائی کے بعد

انل ٹھکّر (دہلی بھارت)

چلتے چلتے وہ ٹھٹک گئی۔
اس کے سینڈل کی ٹک ٹک ایسے رک گئی گویا کسی کی حرکت قلب رک گئی ہو۔

اس کی نظریں سامنے آویزاں تختی پر ٹک گئیں۔ جس پر لکھا تھا۔ Security اسے یقین ہو گیا اب وہ پکڑی جائے گی۔ تلاشی ہوگی۔ طرح طرح کے سوالات ہوں گے۔۔۔۔ اس کے پیچھے ٹھہرے اس کے والد نے اسے آگے بڑھنے کے لیے کہا۔ اس نے تختی سے نظریں ہٹائیں اور بوجھل قدموں سے آگے بڑھی۔ اس نے اپنے کندھے پر لٹکتے ہوئے پرس کو سکریننگ مشین کے Rotating Belt پر رکھا اور خود سکیورٹی افسر کے روبرو آ کر ٹھہر گئی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کی ہوائیوں کو دیکھ کر افسر نے آلہ اس کے جسم پر نیچے سے اوپر اور آگے پیچھے دو مرتبہ گھمایا۔ آلہ خاموش رہا کوئی سگنل نہیں ملا تو افسر کو اطمینان ہو گیا۔ اس نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے سکریننگ مشین کی دوسری طرف سے اپنا پرس لیا اور آگے بڑھ گئی۔

ہوائی جہاز میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنی جیب ٹٹولی اور مطمئن ہو گئی۔

کینیڈی ہوائی اڈے سے جہاز نے اڑان بھری۔ نیویارک کی فلک بوس عمارتوں کی روشنی پیچھے چھوٹ گئی۔ جہاز شب کی تاریکی میں اٹلانٹک سمندر پر پرواز کرتے ہوئے اپنی منزل کی جانب گامزن تھا۔ کچھ مسافر ٹی وی پر فلم دیکھ رہے تھے۔ کوئی کانوں پر ہیڈفون لگا کر اپنی پسند کے گانے یا موسیقی سننے میں مشغول تھا۔ کچھ اپنے ہم سفر کے ساتھ محو گفتگو تھے۔ اس نے پھر ایک بار جیب ٹٹولی اور آنکھیں موند کر اپنی ’’ما‘‘ کے ساتھ گذارے وقتوں کو پھر سے جینے میں محو ہو گئی۔

ماں بتایا کرتی۔ دادا جی کے انتقال کے بعد بھی ما۔ امریکہ آنے کو تیار نہیں تھیں۔ ہم نے بارہا انھیں سمجھایا۔ التجا کی۔ ہاتھ جوڑے مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔ انھیں اپنی مٹی، اپنے وطن اور ماحول سے اتنا لگاؤ تھا کہ وہاں تن تنہا رہنے کے لیے تیار تھیں مگر ہمارے پاس آنے کو راضی نہیں تھیں۔ جیسے ہی انھیں تمہارے پیدا ہونے کی خبر ملی تو دوڑی چلی آئیں۔۔۔۔

اس کی آنکھیں نم ہوئیں۔ اشک پلکوں پر جھلملائیں اس سے قبل آنکھوں سے نکلیں انھیں اپنے اندر جذب کرلیا۔ ہونٹوں کی خاموشی تو تھم گئی تو ہو گئی لیکن ذہن یادوں کے قافلے کے ہم راہ چلتا رہا۔

اسے اپنی ماں کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا۔ تمہیں دیکھنے امریکہ تو آ گئیں مگر ہر پل انھیں بھارت، ممبئی اور اپنے ہم سایوں کی یاد ستاتی رہتی۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ تم سے اور تمہاری قلقاریوں سے ایسی جڑیں کہ پھر چاہتے ہوئے بھی تمہاری چاہ کے کھونٹے کو تڑا کر واپس نہ جا سکیں۔

ماں نے سچ کہا تھا۔ جب سے ہوش سنبھالا اُسے اپنے آپ کو ما۔ کی گود یا بانہوں میں پایا۔ انہوں نے ماں کی طرح اسے پالا، دادی کی طرح تربیت دی اور پوتی کی بڑھتی عمر کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے اس کی سکھی سہیلی بن گئیں۔ وہ اسکول جاتی تو ما۔ جگنو کے مانند اس کے لوٹنے کا انتظار کرتیں۔ اسکول میں پڑھتے وقت اس کا من بھی اُڑ کر گھر کے دریچے پر آ بیٹھتا۔ رات میں سونے کے وقت وہ ما۔ کے پہلو میں ایسے لپٹتی جیسے چوزہ ماں کے پروں میں سمٹ گیا ہو۔ پھر لحاف میں ان کی محفل جمتی۔ وہ اپنے دوستوں اور ٹیچر کے بارے میں بتاتی۔ ما۔ اپنے زمانے کی سناتے ہوئے تہذیب، اخلاق اور مذہبی روایت کی چاشنی اس کے کانوں میں یوں گھولتیں جیسے بچے کو ماں کہانی سناتے ہوئے اس کے منہ میں نوالہ دیتی ہے۔

ان دنوں مشرقی ممالک سے بہتر مستقبل کی جستجو میں امریکہ میں آباد لوگوں کے دلوں میں مغربی تہذیب سے خوف سا پیدا ہونے لگا تھا۔ انھیں ڈر تھا یہاں کا ماحول ان کی تہذیب، زبان اور مذہبی عقیدوں کو کھوکھلا کر رہا ہے۔ وہ اپنی آنے والی نسلوں کے مستقبل کو خطرے میں محسوس کرنے لگے تھے۔ اس خطرے کے خوف سے وہ ڈری ہوئی بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کے طرح ایک جٹ ہونے لگے۔ دیوالی، عید، دُرگا پوجا اور بیساکھی جیسے تہوار اپنی قوم کے لوگوں کے ہم راہ منانا شروع کیا۔ قومی تنظیمیں قائم ہونے لگیں۔ کہیں گجراتی سماج کہیں تامل سنگھ۔ مہاراشٹر منڈل تو کہیں انجمن اسلام اور بنگلا بندھو کے پرچم تلے لوگ اپنی خوشی و غم بانٹنے لگے۔ مندر تعمیر ہونے لگے۔ اذانوں سے دعوت عبادت آنے لگی اور گردواروں سے گروبانی کے سُر گونجنے لگے۔ گھروں میں بچوں کے ساتھ مادری زبان میں ہی بات کرنے کا چلن شروع ہو گیا۔ اپنے ملک سے اپنی زبان کے اخبار اور رسائل منگائے جانے لگے۔ اس طرح امریکہ میں جگہ جگہ بھارت، پاکستان اور بنگلادیش کی تہذیبیں سانس لینے لگیں۔ اس مہم سے ما۔ بھی اچھوتی نہ رہ سکیں۔ انہوں نے اپنی پوتی کو گجراتی پڑھنے لکھنے کی مشق شروع کروا دی۔ گھر میں صرف اور صرف گجراتی میں بات کرنے کا فرمان جاری کر دیا۔ روزانہ پوجا پاٹھ لازمی قرار دیا گیا۔ خود ہر روز قریب کے مندر میں آرتی کے وقت حاضری دینے لگیں۔ چھٹی کے دن پورے کنبے کے ساتھ مندر جاتیں۔ اس طرح کچھ برسوں میں ہوتے ہوتے اپنی پوتی کو اپنی زبان، تہذیب اور مذہبی عقیدوں سے صرف آشنا ہی نہیں کرایا ان سے قربت بھی پیدا کر دی۔ ان اعمال سے پوتی کا شعور اپنی قدیم روایتوں، مذہبی عقیدوں اور زبان سے گہرا ہو گیا۔ وقت کے ساتھ اپنے اَن دیکھے مادر وطن کے دیدار کی چاہ اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ ایک مرتبہ ضد پر آ کر چھٹیوں میں وطن جانے کے لیے والدین کو راضی کرا کے بے

میری بے چینیوں کا انتظار کرنے لگی۔ ماں کے ساتھ ہر وہ مقام دیکھنے کا پروگرام بنالیا جس کے قصے ماں سے سناتی رہی تھیں۔ تبھی اچانک ایک روز اسے محسوس کیا جیسے گھر میں سب کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ اس نے جاننا چاہا مگر سوائے نم آنکھوں اور خاموشی کے کچھ ہاتھ نہ لگا۔ البتہ اتنا جان گئی کہ جس روز ماں چاچی کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جا کر لوٹیں تو ان کے ہم راہ اُداسی بھی گھر میں داخل ہوگئی اور جلد ہی دنوں میں کونے کونے میں پھیل گئی۔

آخر کار ایک رات ماں کے پہلو میں لیٹے لیٹے انھیں اپنی بانہوں میں لپیٹ کر چہرہ اپنی جانب کیا تو ماں سہم گئیں۔ وہ چاق و چوبند ہو گئیں۔ انہوں نے آنے والے پل کے لیے خود کو مستعد کیا۔ تبھی پوتی نے پھر پھراتی آواز میں سوال کیا ——

ماں ——!!

ماں کانپ گئیں۔ بے بسی مختصر سی آواز بن کر منہ سے پھوٹی ——

جی ——؟

ایک بات پوچھوں؟

ماں نے اسے سینے سے بھینچ لیا۔ پوتی کی آواز خار میں الجھے دامن کی طرح اس کے گلے میں پھنس گئی۔ پھر نادانستہ سوال ماں کے کانوں میں گرم سیسہ گھول گیا۔

ماں کیا ہوا ہے آپ کو؟

ضعیف جسم لرز گیا۔ کیا جواب دے؟ سچ بولے یا جھوٹ؟ جھوٹ تو نہیں بولیں مگر سچ سے بھی آنکھیں چراتے ہوئے الٹے سوال کیا ——

کیا ہوا ہے؟!

چاچی آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے؟

ہاں۔

کیا ہوا ہے آپ کو؟

ماں کشمکش میں پڑ گئیں۔ پھر سوچا آج نہیں تو کل یہ جان جائے گی۔ پھر چھپانے سے کیا فائدہ! وہ بچی کو صدمے سے بچانے کے لیے بھگوان سے دعا مانگنے لگیں ——

پوتی نے عجلت سے اپنی بات دوہرائی۔

آپ کو میری قسم ماں ——

بیٹی —— مجھے —— مجھے کینسر ہوا ہے ——

وہ گھبرا کر یکلخت بیدار ہوگئی۔ اس کا سانس تیز چل رہا تھا۔ اس کا ہاتھ جیب پر تھا۔ ہوائی جہاز میں زیادہ تر مسافر سو رہے تھے۔

جب سانس دھیما پڑا، گھبراہٹ کم ہوئی تو اسے پہلو بدلا۔ آنکھیں موندیں اور فکر و اندیشہ میں گھری یادوں کو سمیٹتے ہوئے رات گزار دی۔

لمبی اڑان کے بعد دوسرے دن نصف شب کو جہاز نے بمبئی کی دھرتی کو چھوا۔ اس نے ماں سے سن رکھا تھا کہ بمبئی کبھی سوتی نہیں، صرف سستا لیتی ہے۔ سستا رہی بمبئی کی سوئی سڑکوں سے گزرتے ہوئے وہ لوگ اس کی خالہ کے گھر کی جانب روانہ ہوئے۔

دن بھر گاڑیوں کی آوا جاہی اور انسانوں کی ٹھوکریں کھا کر سڑک کی گرد رات کی نمی سے بوجھل ہو کر زمین پر اتر رہی تھی۔ اس کی آمد نے ماحول کو گرد آلود کر رکھا تھا۔ سڑکوں کی تیز روشنی بجھی بجھی سی بیمار نظر آ رہی تھی۔ کبھی کوئی گاڑی فراٹے سے قریب سے گزر جاتی تو کبھی کوئی آٹو گھر گھراتی آواز کے ساتھ نظر آ جاتا۔ کہیں اِکا دُکا لوگ سڑک گشتی کرتے دکھائی دیتے۔ باقی تو ہر جگہ بھارت کی جنگ کے بعد کا سا منظر نظر آ رہا تھا۔ کیا فٹ پاتھ کیا کھلے گاڑی اڈے اور چبوترے پر ہر طرف نیم مردہ لوگ فلک بوس عمارت میں بسنے کے ارمان میں کھوئے اور بہتر زندگی کے خواب دیکھتے ہوئے سو رہے تھے۔

اپنی خالہ کے گھر پہنچتے ہی اس نے امریکن سیکورٹی سے بچا کر لائی چیز جیب سے نکال کر اپنے سوٹ کیس کے کپڑوں میں چھپا دی۔

طویل فضائی سفر نے اسے نیند سے محروم رکھا۔ صبح مشرق کی سرخی نے جب زرد رنگ اختیار کرنا شروع کیا تو صبر توڑتے ہوئے اٹھی۔ کھڑکی پر آئی۔ دیکھا، بمبئی اپنی سستی جھٹک کر رواں دواں تھی۔ زندگی کی جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ فلک بوس عمارت سے یوں لگ رہا تھا جیسے چیونٹیاں اپنے بل سے نکل کر رزق کی تلاش میں بھاگ دوڑ کر رہی ہیں۔ ہر کوئی عجلت میں وقت کو پکڑنے کی دھن میں بھاگا ہوا۔ ہر کوئی کمان سے نکلے تیر کے مانند نشانے کی جانب گامزن ——

وہ اس وقت دنگ رہ گئی جب اسے گھر میں ہر چھوٹے بڑے کو امریکنوں سے بھی بھونڈے تلفظ کے ساتھ انگریزی میں گفتگو کرتے سنا!! اپنی مادری زبان اور انگریزی کے ساتھ کا اتنا شدید دھوبی کے کتے جیسا نظر آیا۔ فضا میں مغربیت کا گھمبیر محسوس کیا۔ بھارت کی تہذیب کے چراغ کسی کی شخصیت میں روشن نظر نہیں آئے!! اس نے دیکھا، ڈگمگا رہی تہذیب، روایات اور مذہبی اطوار کا آخری سرمایہ کی بزرگ ساس کے کمزور ہاتھوں میں تھا۔ جس کی کلائیاں اور مانگ سونی تھی۔ سفید لباس میں ملبوس رہنے والی وہ بزرگ خاتون کو اپنی تہذیب اور روایات کو تھامے رکھنے میں کوشاں دیکھ کر وہ ان پر فریفتہ ہوگئی۔ اسے ان میں اپنی ماں کا عکس نظر آیا۔ وہی رنگ، نرم لہجہ، آواز میں وہی اُنسیت —— ان کو بھی اس تیرہ چودہ سال کی لڑکی کے طرزِ عمل نے موہ لیا۔ وہ اسے دیکھ کر سوچتی رہیں کہ امریکہ میں پیدا ہوئی اور وہیں پلی بڑی مگر صبح نہا دھو کر پوجا پاٹھ کیے بغیر ناشتہ تو درکنار پانی تک منہ میں نہیں لیتی۔ اسے بھلا کون وحشی کہے گا! مگر گھر کے نوجوان جب اسے ان کے ساتھ گجراتی میں ہی بات کرتے سنتے تو

اسے غیر ممالک سے درآمد جاہل مان کر زیرِ لب مسکرا دیے!!

سفر کی تھکان دور ہوتے ہی ایک دن وہ اپنے والدین کے ہمراہ ان مقامات کو دیکھنے کے لیے نکل پڑے جن کے ساتھ اس کی یادیں جڑی ہوئی تھیں۔ پہلے وہ گرانٹ روڈ سرکل پہنچے۔ گرانٹ روڈ ہوٹل کی بغل میں خستہ حال تین منزلہ عمارت دکھاتے ہوئے اس کے والد نے کہا۔ یہ وہ عمارت ہے جہاں ہم رہتے تھے۔ دو کمروں کا گھر۔ سات افراد۔ تین بھائی' دو بہنیں' ماں اور چاچی۔ نیچے چاچا جی کی دوائیوں کی دکان تھی۔

اس نے دیکھا' آج بھی ان ڈربہ نما کمروں میں کئی زندگیاں سانس لے رہی تھیں۔ کسی زمانے میں اس کا شمار اونچی عمارت میں کیا جاتا رہا ہوگا مگر آج آسمان کو چھونے کی مسابقت میں بہت ساری فلک بوس عمارتیں اطراف میں کھڑی ہیں۔

وہاں سے وہ حاجی علی کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے کی بھیڑ کو پریشان کن نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا اس بھیڑ میں پاپا کو لگر آپ روزانہ حاجی علی اور مہالکشمی کے درشن کے لیے کیسے جاتے تھے!!

والد نے مسکرا کر کہا۔ ان دنوں اتنی بھیڑ نہیں ہوتی تھی۔ اس زمانے میں اسکوٹر تھے نہ موٹر بائکس۔ بگھی کا چلن تھا۔ ٹرامیں چلا کرتی تھیں۔ کاریں کسی کے پاس ہی ہوتی جو ٹیکسی کہلاتے تھے۔ آج کل تو آسمان کے ستاروں کی طرح ہر طرف کروڑپتی جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ ان دنوں ٹیکسی بھی کہیں کہیں نظر میں آتے!!

حاجی علی پہنچ کر اس نے دیکھا۔ سڑک سے دور سمندر میں درگاہ مراقبہ میں بیٹھے کسی بزرگ ولی سی نظر آ رہی تھی۔ اس کے روبرو اونچی اونچی عمارتیں ہاتھ باندھے مریدوں کے مانند اک لب کشائی کے انتظار میں کھڑی محسوس ہوئیں۔ یہ دیکھ کر اس کی روح عقیدت سے سرشار ہو گئی۔ وہ آگے بڑھی۔ پگڈنڈی نما آدھا کلومیٹر لمبی چوڑی پتھریلی راہ پر وہ قدم بڑھاتی گئی تو اس کے تخیل پر حقیقت پرت در پرت کھلتی چلی گئی۔ اس نے دیکھا سمندر کا پانی بہاؤ کے زیرِ اثر تھا۔ راستے کے دونوں جانب پھیلے پانی میں سیاہ چٹانیں کوڑے کرکٹ سے اپنے ننگے بدن کو چھپانے کی ناکام کوشش میں تھیں۔ کنارے پانی میں بکھرا کوڑا کرکٹ بدبو پھیلا رہا تھا۔ جھلسا دینے والی دھوپ میں راستے کے کنارے دونوں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بھیک مانگنے والے اپنے اپنے انداز سے آنے جانے والوں کے گداز دلوں کو اپنی جانب متوجہ کرکے صدائیں دے رہے تھے۔ ان میں کوئی لولا لنگڑا تھا۔ کوئی اپاہج لیٹے لیٹے ہاتھ پھیلا رہا تھا تو کوئی پیپ آلودہ جسم کے پھوڑوں اور زخموں کی نمائش کرکے گڑگڑا رہا تھا۔

چلتے چلتے اس نے سوچا۔ یہ لاچار و بے بس مدد کر کس سے کیا مانگ رہے ہیں!! یہاں سے گزرنے والا انہیں کیا دے سکتا ہے؟! وہ خود سوالی ہے۔ وہ خود مرادیں مانگنے حاجی پیر کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہے۔

اسے یاد پڑا چودہ سال کی عمر میں ایک ساتھ اتنے بھیک منگے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اسے جہاں تک یاد پڑتا ہے اس سے پہلے تین لوگوں کو مختلف موقعوں اور مختلف مقامات پر بھیک مانگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے اس وقت حیرت ہوئی تھی کہ انسان اتنا بھی مجبور ہو سکتا ہے!! پہلی مرتبہ ایک شخص کو واشنگٹن ڈی سی کے میٹرو اسٹیشن میں داخل ہوتے وقت دیکھا تھا۔ اس کے پیروں میں اخبار بچھا ہوا تھا۔ وہ وائلن پر کوئی دھن بجا رہا تھا۔ اس کی بغل میں ایک تختی رکھی ہوئی تھی۔ جس پر لکھا ہوا تھا Please Help me ویسے ہی ایک مرتبہ لندن کے فٹ پاتھ پر ایک بیچارے آدمی کو سوٹ میں ملبوس خاموش کھڑا دیکھا تھا۔ جس نے ایک چھوٹا سا اشتہار پکڑ رکھا تھا۔ جس پر لکھا تھا۔ I am suffering from AIDS Help me. آخری بار ایک بوڑھے کو ماؤتھ آرگن بجا کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ جس کے سامنے گندا کپڑا بچھا ہوا تھا۔ جس پر چند سکے بکھرے پڑے تھے۔

درگاہ کی سیڑھیوں کے پاس انہوں نے جوتے اتارتے ہی فوراً احساس ہوا کہ انہیں انگاروں پر چل کر زیارت گاہ تک پہنچنا ہے۔ جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ تیز قدموں سے درگاہ پہنچے۔ ماتھا ٹیکا اور اس کی آتما کے لیے دعا مانگی۔

دن بھر دھوپ میں گھوم پھر کر اس کے بدن کا جوڑ جوڑ ٹوٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ گہری نیند سونا چاہتی تھی مگر نیند کے عدم تعاون کے سبب جیسے ہی تتلی کے مانند جھپکی اس کی پلکوں پر بیٹھتی کراہ کر چونک کر کھل جاتی۔ اس مضطربانہ حالات میں پاپا کی کہی باتیں اس کے ذہن میں طواف کرنے لگیں۔ پاپا کہتے تھے۔ ممبئی ملک کی رنگا رنگ تہذیب' زبانوں' عقیدوں اور روایتوں کا سمندر ہے مگر اس نے دیکھا یہ سمندر ممبئی کے بحرِ عرب کی طرح گدلا ہے یہاں کوئی تہذیب' زبان' روایت' ذہن کسی اپنے علاقے کی صحیح نمائندگی نہیں کرتا۔ ہر چیز پر مغربیت کا کھوکھلا پن چڑھا ہوا ہے۔ جو اصل کا منہ چڑھاتا نظر آتا ہے۔

کچھ روز خالہ کی سالی کی صحبت میں بسر کرکے حسبِ منصوبہ وہ کاشی کے لیے روانہ ہوئے۔ سامانِ سفر باندھتے وقت اس نے سوٹ کیس سے وہ چیز نکال کر جیب میں رکھ لی۔

کاشی پہنچ کر اسے حیرت ہوئی اس نے شاعروں' ادیبوں کے دو نام سن رکھے تھے۔ ایک والدین کا عطا کیا ہوا اور دوسرا تخلص کا مگر اس شہر کے تو تین نام تھے۔ صدیوں پرانے عقیدوں کا توشہ باندھ کر زیارت کو آنے والے اسے کاشی کہتے تھے۔ موسیقی اور رقص کے فنکار اور سادھوؤں کے لیے یہ بنارس تھا اور سرکاری گلیاروں میں اسے وارانسی کے نام سے جانتے تھے۔

دوپہر ڈھلتے وہ کاشی پہنچے۔ غروبِ آفتاب کے بعد ہوٹل سے تر و تازہ ہو کر شام کی آرتی میں شریک ہونے کے ارادے سے بھیڑ سے لبریز ہوئی

سکڑی گلیوں سے ہوتے ہوئے بازار سے گزرنے لگے۔ روشنی سے جگمگاتے تنگ بازار کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی دکانوں میں گہما گہمی کا ماحول تھا۔ کہیں لوگ ٹکڑوں میں ٹھنڈائی پیتے ہوئے مزے لے رہے تھے۔ کہیں بنارسی پان کی گلوری کا لطف اٹھایا جا رہا تھا۔ تو ایک طرف مٹھائی کی مانگ ہو رہی تھی۔ دوسری جانب ریشمی ساڑیاں فروخت ہو رہی تھیں۔ جن کی دکان میں پوجا کا سامان پرساد کے پیکٹ، بھگوان کی تصاویر ور گنگا جل کی چھوٹی بڑی لٹیا بک رہی تھیں۔ ہر دکان پر ملے جلے کی بولی سنائی دے رہی تھی۔ اس کے لیے اس قسم کی خرید و فروخت نئی چیز تھی۔ وہ بڑے اشتیاق سے بازار کا نظارہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔

اچانک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اسے چھوتا ہوا گزر گیا۔ اس نے دیکھا وہ بازار عبور کر کے گنگا کے گھاٹ کی سرحد میں داخل ہو چکی ہے۔ سامنے گنگا میا گمبھیر روانی میں بہہ رہی ہے۔ گھاٹ پر قدم رکھتے ہی ماحول بدلا ہوا نظر آیا۔ دونوں جانب حدِ نظر تک روشنی میں نہائے گھاٹ پھیلے ہوئے تھے اور جنگی کود میں پرانی عمارتوں اور مندروں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ ادھر ابر چلا تھا۔ بادِ نسیم موسم کو خوشگوار بنا رہی تھی۔ لوگ پھولوں سے بھرے دونے میں دیا جلا کر گنگا کی لہروں پر چھوڑ رہے تھے۔ ہزاروں جگمگاتے دونے لہروں پر ہچکولے کھاتے ہوئے کسی کارواں کی طرح گنگا ساگر کی سمت بہے چلے جا رہے تھے۔ ان ٹمٹماتے دیوں سے جھلکتی روشنی گنگا کے سینے پر رنگوں کی بہار بن رہی تھی۔ تبھی کاشی وشوناتھ مندر کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ شنکھ پھونکے جانے لگے۔ آرتی کے بول فضا میں طواف کرنے لگے۔ پل دو پل میں ہر چھوٹے بڑے مندر میں آرتی کی گونج اٹھی اور سماں باندھ دیا۔ ماحول گھنٹیوں کے سروں اور شنکھوں کی ناد سے سرشار ہو گیا۔ جگہ جگہ دھونی رمائے بیٹھے سادھو بھی اپنی چلم کو دور کنار کر کے آرتی میں رم گئے۔ ہر کوئی عقیدت کے دریا میں ڈبکی لگا کر شرابور ہونے لگا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ جنت میں آ گئی ہے۔ اسے یقین ہو گیا یہی اسکا مادرِ وطن ہے۔ بابا کی آنکھوں سے دیکھا بھارت۔ رِشی منیوں، گیتا رامائن کا بھارت۔ میرا بھارت! مہان بھارت!!

آرتی پوری ہوئی۔ جے جیکارے کے نعرے بلند ہوئے۔ لوگوں نے آبِ گنگا کا آچمن لیا۔ جل ہتھیلی میں لے کر سر پر چھینٹے ڈالے۔ اس نے بھی آچمن لیا۔ کئی گھونٹ بھر کر اوک میں لے لے کر گنگا جل پیا۔ سر پر جل چھڑکا اور جے گنگا میا کا نعرہ لگایا۔

دوسرے روز صبح پوجا کے لئے گھاٹ پر روانہ ہوتے سمے اس نے تکیے کے نیچے رکھی وہ چیز نکالی۔ جیب میں رکھنے سے پہلے ایک نظر اسے دیکھا۔ ٹھنڈا سانس چھوڑا اور اپنے والدین کے پاس آ گئی۔ اس کی فرمائش پر ہوٹل کے منیجر نے گنگا کے گھاٹ جانے کے لیے دو سائیکل رکشا کا انتظام کیا تھا۔ ایک پر وہ سوار ہوئی۔ دوسرے پر اس کے والدین بیٹھے۔ اسکا رکشا آگے چلا۔ والدین باتیں کرتے ہوئے پیچھے رکشا کے تعاقب میں رہے۔

راستے پر لوگوں کی آوجاہی نہ کے برابر تھی۔ کہیں کوئی بھیگے کپڑوں میں گنگا اسنان کر کے گھر کی جانب لوٹ رہا تھا تو کوئی پنڈا پوجا کی اشیا اٹھائے تیز قدموں سے کسی گھاٹ کی طرف بڑھتا ہوا جا رہا تھا۔ فضا میں ہلکی سی نمی تھی۔ اس نے جیب سے وہ چیز نکالی۔ اسکی چاہا اس پڑیا کو کھول کر دیکھے مگر حوصلہ نہیں ہوا۔ پڑیا سے بچھڑنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔

بڑے جتن سے اس نے پڑیا کو سنبھالا تھا۔ سب کی آنکھوں سے بچا کر وہ اسے یہاں تک لے آئی تھی۔ وہ جانتی تھی اس کی صحبت میں رہنے کا یہ آخری پڑاؤ ہے۔ آنے والی جدائی کے غم کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچنے کی خوشی بھی تھی۔ کتنی چوری چھپے اس نے اسے حاصل کیا تھا۔ بابا کے انتقال کے دوسرے روز اس کے والد اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ بابا کی استھی لانے کے لیے برقی شمشان جا رہے تھے تو یہ بھی ان کے ساتھ ہو لی۔ پچھلی رات گھر میں طے ہوا تھا کہ والد کے چھوٹے بھائی بھارت جا کر بابک کی کو دوری ندی میں استھی کا وسرجن کر کے آئیں گے۔ یہ فیصلہ اسے ناگوار گزرا تھا۔ کیوں کہ بابا نے کہا تھا کہ کاشی میں جن کی استھی گنگا میں وسرجن کیے جاتے ہیں ان سے مکتی نصیب ہوتی ہے۔۔۔ پھر یہ دونوں بیٹے بابا کو مکتی سے محروم کیوں کر رہے ہیں!!

برقی شمشان میں بابا کی استھی حاصل کرنے کے بعد دونوں بھائی پنڈت کے ساتھ پوجا میں بیٹھے تھے تب اسنے دبے پاؤں شمشان کے نگران کے پاس جا کر تھوڑی سی استھی دینے کے لیے التماس کی۔ نگران نے اسے بچی سمجھ کر مٹھی بھر استھی کی پڑیا بنا کر اسے تھما دی۔

بابا کو مکتی دلانے کے مقصد سے وہ اپنے والدین کو گھومنے کے بہانے کاشی لے آئی تھی۔ وہ مکتی کے تصور میں کھوئی تھی کہ رکشا چلانے والے بوڑھے نے اسکی سوچ میں خلل ڈالتے ہوئے سوال کیا۔ بی بی صاحب آپ ولایت سے آئے ہیں؟

وہ چونکی۔ اس کے تخیل کا تسلسل تتر بتر ہو گیا۔ اس نے رکشا والے کی جانب دیکھا۔

بوڑھے نے سوال دہرایا۔ آپ ولایت سے آئے ہیں؟

ہیں؟۔۔۔۔۔ امریکہ سے۔۔۔۔۔ کیوں؟

لگی بڑی ہوٹل میں پردیس سے آئے لوگ عموماً رکشا میں بیٹھنا پسند کرتے ہیں۔ ولایت میں انہیں رکشا دیکھنے کو کہاں ملتا ہے

جی ہے بابا۔۔۔۔۔ میری بہت اِچھا تھی رکشا میں بیٹھنے کی۔ میں نے ہی کہا تھا ہم رکشا میں بیٹھیں گے۔

اچھا کیا بٹی۔ اس سے غریب کا پیٹ پلتا ہے۔

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ شدید بو نے اس کے نتھنوں پر حملہ بول دیا۔ وہ بڑبڑا اٹھی۔ لمحہ بھر میں بو نے دماغ میں پھیل کر اسے تلملا دیا۔ اس نے مضطربانہ لہجے میں پوچھا۔

یہ کیسی ہے؟!

اس پار کی۔

بوڑھے رکشا والے نے اشارہ کر کے جواب دیا۔ اس نے دیکھا' رکشا ایک پل پر سے گزر رہا تھا۔ پل کے نیچے پار کی گندگی سڑک کے متوازی بہہ رہی گنگا میں مل رہی تھی۔

یہ گندگی تو گنگا میں گر رہی ہے!۔۔۔۔ اس نے حیرت سے کہا۔

ہاں' یہ ایک ہی نالا نہیں ہے' بابو صاحب۔ شہر میں سینکڑوں نالے ہیں جو گنگا کو میلا کرتے ہیں۔

سرکار کچھ نہیں کہتی؟!

سرکار کہتی ہے' گنگا میں نہانے سے لوگوں کے پاپ دھل جاتے ہیں' ویسے یہ گندگی کو بھی گنگا پوتر کر دیتی ہے۔

رکشا والے کی بات سن کر اسے ناگہانی قلبی تصادم محسوس کیا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ سڑک پر تھوڑی چڑھائی تھی۔ رکشا والا بھی دم سادھے زور لگانے میں مصروف ہو گیا۔ گندگی کے بارے میں سوچتے ہوئے اس نے ایک گلی میں نظر ڈالی۔ گلی نیچے گھاٹ تک اتر گئی تھی۔ گلی میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ دھواں کچھ عجیب نمونے کی بو لئے ہوئے تھا۔ اس نے پہلے کبھی ایسی بو سونگھی نہیں تھی۔ اسے گھاٹ پر شعلے اٹھتے نظر آئے۔ اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے پوچھا

یہ گھاٹ پر کیا جل رہا ہے؟

یہ منی کرنیکا گھاٹ ہے۔ یہاں مُردے جلائے جاتے ہیں۔

کیوں یہاں شمشان نہیں ہے؟

اگر ہوتا تو بھی وہاں کوئی نہ جاتا۔

کیوں؟؟

کہتے ہیں' یہاں جلانے سے مرنے والے کو سورگ ملتا ہے۔ لوگ تو سورگ کی آس میں مرنے کے لئے برسوں کاشی میں باہر والے پڑے رہتے ہیں۔

پھر تو بہت لوگوں کو یہاں جلایا جاتا ہوگا؟!

دنیا میں لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں' مرتے رہتے ہیں' دن ہو یا رات۔ ویسے ہی یہاں چتا کی آگ کبھی ٹھنڈی نہیں پڑتی۔ مُردے جلتے ہی رہتے ہیں۔ مُردا آدھا جلا نہیں کہ ڈوم اسے گنگا میں دھکیل دیتے ہیں۔ اس کی آدھ جلی لکڑی دوسرے مُردے کے کام میں لا کر پیسے وصول کر لیتے ہیں۔ اس طرح کئی ڈوم لکھپتی بن گئے ہیں۔۔۔۔

اور وہ ادھ جلی لاش۔۔۔۔؟!

وہ گنگا میں بہنے لگتی ہے۔۔۔۔ سورگ جانے کے لیے۔۔۔۔

اس کا کلیجہ دہل گیا۔

رکشا والا اپنی دھن میں ڈوم اور ڈومنوں کے قصے سناتا رہا۔

مُردوں کو گنگا میں بہا دینے کی بات سن کر لاشعوری طور پر وہ ان قصوں سے بے نیاز ہو گئی۔ اس کی سوچ انجانی سمتوں میں بھٹکنے لگی۔ اس کے ذہن میں سوچ کے بگولے اٹھنے لگے۔ ذہن جیسے گرد و غبار سے آلودہ ہو گیا۔ اسے دم گھٹتا لگا۔ اسے متلی سی آنے لگی۔ دفعتاً اسے یاد آیا' کل شام ہوٹل بھر بھر کر اس نے گنگا جل پیا تھا۔ جیسے سمندر کی گہرائی سے ٹل کھاتی ہوئی لہر اٹھتی ہے' ویسے اس کے پیٹ میں اینٹھن اٹھی۔ پیچ و تاب اس کے بس میں نہ رہا۔ ایک زوردار ابکائی کے ساتھ اس نے قے کی۔ جب جی ہلکا ہوا' طبیعت سنبھلی تو اپنے آپ سے طیش میں آ کر کہا۔

نہیں۔ اب اس گندی راہ سے سورگ نہیں جائیں گی!

اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پڑیا جیب میں رکھ لی۔

☆

۔جیرا پٹی مٹھی میں گم۔

پھوٹ رہا ہے اور میرا جی چاہ رہا ہے کہ شوبھا نس نس کر اس کے نیچے نہاتی چلی جائے اور ہمارا بیٹا اس کے نہائے نہائے لڑھک لڑھک کر باہر آ جائے۔

ڈاکٹر اور شوبھا مشورے کے کمرے سے باہر آ کے میرے پاس آ کھڑے ہوئے ہیں۔

شوبھا کا رنگ اتنا زرد کیوں ہے؟

"میں نے آپ کی بیوی کو سب سمجھا دیا ہے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔"

میں بہت گھبرا گیا ہوں اور میری بیوی میری پشت پر سر ٹیک کر کھڑی ہو گئی ہے۔

"آپ کی بیوی بچے سے نہیں۔ ان کی بچے دانی میں ایک ٹیومر سا بن گیا ہے۔ معمولی آپریشن سے ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے شوبھا کی آنکھوں میں جھانکا ہے۔ اس کی نظر کی تھمی تھمی کشادگی دور دور تک خالی ہے مگر۔۔۔۔ میں نے محسوس کیا ہے۔ اس خالی پن کے پرے چمکیلی دھند ہے' جس میں لگاتار حرکت ہو رہی ہے اور ہمارا بچہ۔۔۔۔ اسے دیکھنے کے لیے میں نے اپنا منہ تصویر کی طرف پھیر لیا ہے۔۔۔۔ اپنے ننھے منے ہاتھوں اور گھٹنوں کو رگڑ رگڑ کر کبھی روتے' کبھی ہنستے بے تحاشا چلا آ رہا ہے اور اس کے آنے کے خیال سے شوبھا کی آنکھوں کی خالی خالی کشادگی۔۔۔۔

میں نے پھر شوبھا کی طرف منہ پھیر لیا ہے۔۔۔۔ پُر ہوتی جا رہی ہے۔

میں نے ڈاکٹر کی موجودگی کی پروا کیے بغیر شوبھا کو گلے لگا لیا ہے۔

ڈاکٹر کے لونج سے باہر آ کے ہم گاڑی میں آ بیٹھے ہیں۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے میں پھر اس سے بغلگیر ہو گیا ہوں اور مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ شوبھا کو میرے فوارے میں نہا نہا کر راحت محسوس ہو رہی ہے اور اس کی راحت محسوس کر کر کے میرے بے کل جذبوں کی تہوں میں سے ڈھیروں بالک شکلیں ابھر رہی ہیں اور ان کی کلکاریوں اور گنگناہٹوں سے میری ساعتیں سر بہ سر کھل گئی ہیں اور۔۔۔۔ اور مجھے قطعاً پروا نہیں کہ میرا گاڑی چلانے کا کانشس کھو چکا ہے۔

قربانی

وقار بن الٰہی (اسلام آباد)

یہ بات نہیں تھی کہ شیخ صاحب پہلی بار قربانی دے رہے تھے قربانی کا جانور تو وہ پہلے بھی باقاعدگی سے خریدتے اور گوشت تقسیم کرتے آ رہے تھے۔ پہلے بھی وہ نماز باقاعدہ پڑھتے یا نہیں، روزہ رکھتے یا دوسروں کو دکھانے کے لئے دن میں پانچ ایک سو مرتبہ اپنے لب صاف کرتے اور کوشش کرتے کہ لبوں پر پپڑی جمی رہے لیکن قربانی کا جانور وہ ضرور خریدتے تھے۔ یہاں تک کہ بچوں کے محلے میں دوسروں کے جانوروں کو دیکھ کر واویلا کرنے سے پہلے پہلے وہ منڈی جاتے اور جانور دیکھ بھال کر خرید لاتے۔ پچھلی بار اس کام میں اُن کی کون سی رگ پھڑک جاتی یا پھڑک کے چلی جاتی کہ اُن پر کوئی دلیل، بحث، کج بحثی اثر نہیں کرتی تھی۔ کسی یار دوست کہتے بھی کہ بھلے مانس! جانور کا حشر کرنے کی بجائے بہتر ہے یہی پیسے کسی فلاحی ادارے کو دے دو یا یہ کہ قربانی تو اُن پر جائز اور واجب ہے جو حج کرنے گئے ہوں اور تم۔۔۔ لیکن اُن پر کسی بات کا اثر نہ ہوتا۔ کسی ایک آدھ کو ہی جواب دے پاتے کہ اللہ کو تو قربانی کا خون پہنچتا ہے، گوشت سے اُسے کیا لینا دینا۔ وہ عید سے چند روز پہلے ہی منڈی میں جا کر اپنی پسند کے جانور کی خریداری کے فرض سے سبکدوش ہو جاتے۔ قیمت نے انہیں کبھی پریشان نہیں کیا تھا کہ اللہ کا دیا سب کچھ تھا اور وہ با آسانی بڑی سے بڑی قیمت ادا کر سکتے تھے۔ جانور کو گھر لانے کے بعد گھر کے فرد اس کے گرد ہو جاتے اور اس کی دیکھ بھال اُن کے سپرد ہو جاتی۔ جانور کے جسم پر جگہ جگہ حنا لگائی جاتی، گلے اور پاؤں میں رنگ برنگے سوتی یا ریشمی کپڑے پہنائے جاتے اور چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں باندھی جاتیں۔ دن میں کم از کم دو بار تو اُسے نہلایا جاتا۔ کھانے کے لئے سبزہ تو تھا ہی لیکن شیخ جی کا سے لیمنوں کی ملاوٹ ضرور کرتے اور بچے گھر میں جو پکتا بکرے کو اس میں ضرور شریک کرتے۔۔۔ شیخ جی قربانی کے مفہوم کو با خوبی سمجھتے اور کوشش کرتے تھے کہ جانور کو گھر میں دو چار دن رکھیں، اُسے عزیز جانیں اور اس کے ساتھ پیار کریں۔ قربانی کے دن اُن کی اور جانور کی چیخ دیکھنے کے قابل ہوتی۔ نماز ادا کرنا بھی بس ایک بہانہ ہی ہو جاتا کہ جماعت کے ساتھ کھڑے ہونے کے باوجود لگتا وہ گھر میں جانور کے ارد گرد ہی چکر کاٹ رہے ہیں۔ جماعت کے ختم ہوتے ہی وہ گھر کی طرف لپکتے اور آتے ہی قصاب کے لئے ضروری سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیتے۔ قصاب نے بھی کبھی انہیں دھوکا نہیں دیا تھا، وعدے کے مطابق وقت پر آتا، بڑے پیار سے جانور کے گلے پر چھری پھیرتا اور ایسے پیار، توجہ اور اطمینان سے بوٹیاں بناتا کہ شیخ جی بھی عش عش کر اٹھتے۔

لیکن یہ ساری باتیں اُس زمانے کی تھیں جب پٹرول اور بجلی ناپید یا مہنگی نہیں ہوئی تھی نہ ہی ہر کسی کو کھلی چھٹی مل گئی تھی کہ وہ جب جہاں جیسا چاہیں قیمتوں میں اضافہ کر کے عوام کی خدمت بجا لائیں، آخر عوام کی کھال اتارنا بھی تو اُن کی خدمت ہی تھا، وہ اس خدمت کو تسلیم کریں یا نہ کریں۔ جانوروں کی قیمتیں تو آسمان سے باتیں کر ہی رہی تھیں۔ عجب بات یہ تھی کہ ہر سال خریدار شکایت کرتے تھے کہ قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں لیکن قیمتوں کے لئے یہ کیسے آسمان تھے کہ سال بہ سال اونچے ہی ہوتے جا رہے تھے۔ قصاب اگر ناپید نہیں ہوئے تھے تو اُن کے نرخوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔۔۔ آہستہ آہستہ جانوروں کے گھروں میں لانے اور انہیں باندھنے اور اُن کی دیکھ بھال کرنے جیسے مسائل اُٹھتے ہوئے قدم روک لیتے تھے۔ اب لوگوں نے اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے مفروضے گھڑ لئے تھے کہ کوشش کی جاتی کہ قربانی کا سلسلہ ٹل جائے نہیں تو عید سے ایک دن پہلے یا عین عید کے روز جانور کی خریداری کی جاتی اور یوں جانور کے مالکوں کو نفسیاتی مار مارنے سے بھی پیچھے نہ ہٹتے۔ خریداروں کا عام طور پر خیال تھا کہ مالک ایک تو خریدار کا انتظار کرتے کرتے تنگ آ چکے ہوتے ہیں، دوسرے انہیں اپنے ریوڑ کی دیکھ بھال کرتے بھی کئی دن گذر چکے ہوتے ہیں اور تیسرے انہیں بھی اپنے بال بچوں میں جا کر عید منانا ہوتی ہے، اس لئے عید سے ایک دن پہلے یا عین عید کے دن خریداری میں جانور سستے داموں مل جاتا ہے۔ لیکن شیخ جی کا مسئلہ یہ تھا کہ گھر میں اب جگہ نہ ہی تھی۔ کبھی کھلے گھر میں وہ جانور لاتے تو تھے، گھر میں باندھا بھی تھا، اُس کے چارے کا بھی انتظام ہو گیا تھا لیکن تازہ تازہ بیاہ کر آئی ہوئی بہو نے رومال جیسے مستقل طور پر ناک پر باندھ لیا تھا کہ جانور کی بو چونکہ سارے گھر میں پھیلی ہوئی تھی، اُس کا سر مارے درد کے پھٹا جا رہا تھا۔ اب وہ اُسے یہ تو باور نہیں کرا سکتے تھے کہ اس بو کو برداشت کرنا عین عبادت اور ثواب کا کام ہے کہ یہ بو تو بہر حال بو ہی ہوتی ہے۔

اس بار یہ پہلی عید تھی کہ شیخ جی عید سے دو روز پہلے پڑوس کے گاؤں میں جمعہ والی منڈی میں جا کر جانور پسند کر آئے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ شاید وہی ایک ایسے ہیں جو اس منڈی میں جا رہے ہیں لیکن وہاں جا کر اُن کی سوچ حیرت میں بدل گئی کہ جانوروں سے زیادہ گاڑیاں وہاں پارک تھیں۔ اور وہ جو دل ہی دل میں سوچ سوچ کر ہلکان ہوئے جا رہے تھے کہ دوسرے دیکھیں یا سنیں گے تو کیا سوچیں گے، اُن کے سانس بحال ہوئے اور وہ بھی خریداروں کے ٹولے میں شامل ہو گئے۔ ظاہر ہے جہاں اتنے زیادہ دور سے نئی گاڑی میں آنے والے گاہک موجود ہوں تو وہاں مول تول کیا ہوگا لیکن اتنا کم ضرور ہوا کہ تھوڑی سی بک بک جھک جھک کے بعد سودا پٹ جاتا تھا۔ شیخ جی نے بھی ایک جانور پہلے دل میں پھر آنکھوں میں پھر ہاتھوں سے ٹٹولا اور سودا طے ہو گیا۔ اطمینان ہی نہیں خوشی اُس وقت ہوئی جب بیوپاری نے خود ہی پیشکش کی کہ جانور اُس کے گھر سے ملحق باڑے میں چھوڑ جائیں اور عید کے روز صبح سویرے آ کر ذبح

کرولیں۔ یعنی ایک قصائی کی جھنجھٹ سے جان چھوٹ گئی۔

عید کے روز نماز کے بعد ملنے جلنے والے دوست یار عید مل رہے تھے اور شیخ جی سب سے آنکھ بچاتے یا چراتے ایک پہلو سے نکلے اور سیدھے گاؤں جا کر دم لیا۔ ڈر یہ تھا کہیں اُن سے پہلے دوسرے لوگ پہنچ نہ جائیں اور وہ اپنی باری کا انتظار کرتے رہ جائیں بلکہ اس ڈر نے تو انھیں ٹھیک سے نماز بھی ادا نہیں کرنے دی تھی۔ گاؤں پہنچے تو انھیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ سب سے پہلے پہنچے تھے اور قصاب کا دور دور تک کوئی نشان نہ تھا۔ وہ گاؤں کی مسجد میں نماز پڑھنے میں ابھی تک مصروف تھا۔

قصاب نماز سے فارغ ہو کر آیا تو دوسرے جانوروں کے ساتھ اُن کا جانور بھی باڑے سے لایا گیا۔ شیخ جی نے نشان دیکھ کر دعا مانگی اور قصاب کو اشارہ کر دیا کہ وہ بسم اللہ کرے۔ پہلے جب قربانی گھر میں کی جاتی تھی تو وہ عام طور پر منہ پھیر لیا کرتے تھے کہ جانور یا کسی ذی روح کے گلے پر چھری پھرتے اور اس کا خون بہتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن گھر میں آنے والا قصاب اُن کا پرانا واقف کار تھا اور بے شکل سے ہی قصاب ہی قصاب لگتا تھا۔ وہ بھی باقاعدہ کر دیکھتے رہے۔ قصاب نے ایک ہی جلے میں بکرے کو اٹھایا اور زمین پر پٹخ کر اس کی کمر پر گھٹنا جما دیا لیکن اُسے اندازہ تھا کہ جانور طاقتور ہے۔ اُس نے ساتھی کو بھی بلا لیا، جس نے فوراً بکرے کی ٹانگیں قابو کر لیں۔ قصاب نے تکبیر پڑھتے ہوئے چھری لہرائی اور بکرے کی گردن پر چلا دی۔ یوں کہ نرخرہ، شہ رگ کے ساتھ دوسری رگیں کاٹ دیں۔ سنا تازہ سرخ خون کی ندی بہہ نکلی، جس میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ بکرے نے ٹانگیں چلائیں، تڑپا، فریاد کی، کٹے ہوئے نرخرے میں سے سانس لینے اور ساتھیوں کو پکارنے کی کوشش کی اور

تھوڑی ہی دیر میں دو چار جھٹکے اور جھرجھریاں لینے کے بعد ٹھنڈا ہو گیا۔ قصاب اتنی دیر میں تین چار دوسرے بکروں کی گردنوں پر چھری چلا چکا تھا۔ سارے ہی ایک قطار میں پڑے تڑپ رہے تھے۔

وہ دوسرے جانوروں کی طرف متوجہ ہوا تو دو نوجوان چھریاں تیز کرتے آگے بڑھے اور بکروں کو اٹھوا کر اُن کے گرد ہو گئے۔ ایک نے بکرے کی پچھلی ٹانگیں پھیلائیں، انھیں پاؤں کے انگوٹھوں سے پھیلائے رکھا تا کہ نرم جگہ سے کھال کاٹنی شروع کی اور کاٹتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ پچھلے دونوں پاؤں کے کھروں تک کھال کاٹ چکا۔ اب اُس نے پاؤں کو مروڑا، چھری کا ایک وار کیا اور ہڈی کو توڑ کر اُن میں کھال پھنسا کر بکرے کو لٹکا اٹھایا۔ شہتیر کی طرح چھلی لکڑی پہلے سے منتظر تھی۔ اُس نے بکرے کو اُسی شہتیر سے بندھی کیل کے ساتھ لٹکایا اور چھری کے بجائے کھال اتارنے لگا۔ پیٹ پر ایک آدھ جگہ اُس کا ہاتھ اٹکا تو اُس نے چھری سے کھال کاٹ دی لیکن پروا نہیں کی کہ کھال یوں زخم کھانے سے بیکار ہو جائے گی۔ سری پہلے ہی وہ کاٹ چکا تھا۔ جھولتے ہوئے جانور کو اُس نے تھاما اور کھال جو دستیوں سے نیچے تک اتر چکی تھی اس میں پاؤں پھنسا کر ایک بار ہی جھٹکا دیا، کھال علیحدہ ہو گئی۔ اس سارے عمل میں اُسے پانچ نہیں تو سات منٹ ہی لگے ہوں گے لیکن اُسکا اُستاد یہ چاہے جا رہا تھا کہ اُسکے ہاتھ تیز کیوں نہیں چل رہے۔

اب اُس کا کام آسان ہو گیا تھا۔ پہلے اُس نے جانور کا پیٹ چاک کیا اور معدہ اور انتڑیاں نکال کر ایک طرف پھینک دیں، پھر دل اور کلیجہ پھیپھڑا کاٹ کر اوپر بیٹھے اور انتظار کرتے اُستاد کی طرف اچھال دیا۔ یعنی اُسکے ہاتھ چھری سے چلنے لگے اور دو ہی منٹ میں بکرا چھ نہیں تو آٹھ ٹکڑوں میں اُستاد کے سامنے پڑا تھا۔ شیخ جی نے دیکھا پندرہ بیس منٹ گزر جانے کے باوجود گوشت میں سے دھواں تو اٹھ ہی رہا تھا، بعض حصوں کی بوٹیاں پھڑپھڑا رہی تھیں۔ اُستاد نے چھری نہیں ٹوکا پکڑا، اُسے ایک بار دو تیز کیا اور شیخ جی سے پوچھا۔

"بوٹی کیسی بناؤں؟" شیخ جی یہ ساری کارروائی بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے اور بکرے کی جو گت بن رہی تھی اُس کے بھی گواہ تھے لیکن اب جیسے انہوں نے ہی لے لئے تھے۔ اب جو قصاب اُن سے مخاطب ہوا تو اُن کا جی تو چاہا کہ اُس کی خبر لیں لیکن پھر یہ سوچ کر سب کچھ پی گئے کہ قصاب اگر برا مان گیا اور اُس نے اُن پر ہی چھری کی تان لی تو ——— جواب میں وہ صرف اتنا ہی کہہ سکے۔

"نہ چھوٹی نہ بڑی۔" قصاب نے جیسے اخلاقاً اُن سے پوچھ لیا تھا کیونکہ اس نے اُن کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور بڑے بڑے ٹکڑوں کو ٹوکے سے یوں کاٹتا چلا گیا جیسے وہ اس کام سے جلد سے جلد جان چھڑوانا چاہتا ہو۔ بوٹیاں تو خیر کیا بننا تھیں، گوشت بس کٹ گیا تھا۔ ٹکڑوں میں کوئی تناسب بھی نہیں تھا۔ کچھ ٹکڑے بڑے بلکہ بہت بڑے ہو گئے اور چھوٹے ذرا سے چھوٹے ہو گئے کہ تمیز کرنا مشکل تھا، بوٹی بکرے کی ہے یا مرغی کی۔ قصاب نے سارا گوشت اکٹھا کیا شیخ جی کی طرف دیکھا اور بولا۔

"لیجئے آپ کا کام تو ہو گیا۔" شیخ جی گوشت سنبھالتے اور ڈھو ڈھو لے جا رہے تھے۔ جب سارا گوشت گھر لے گئے تھیلوں میں ڈال چکے تو اُن کی بے زاری انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ گھر جا کر گھر میں بیٹھی نیک بخت کو کیا بتائیں گے اور گوشت عزیز و اقارب میں بانٹتے ہوئے کس منہ سے اُن کا سامنا کریں گے۔ تھیلوں کو ایک طرف رکھ کر انہوں نے بٹوہ جیب سے نکالا اور قصاب سے پوچھا۔

"کتنی مزدوری ہوئی بھائی؟" قصاب نے اُن کی طرف دیکھا نہیں، وہ ایک اور بکرے کو کاٹنے کا کام تقریباً مکمل کر چکا تھا۔

"آپ ایک ہزار دے دیں۔" شیخ جی کا تو دل جیسے دھڑکنا رک گیا۔ چونکے اور چونک کر بولے

"کیا کہا ایک ہزار بھائی پچھلے برس تو اُجرت چار سو تھی۔" قصاب نے قدرے غصے سے اُن کی طرف دیکھا۔

"پچھلے برس گیس اور بجلی کے ریٹ بھی تو وہ نہ تھے جو آج ہیں۔ اِسے چھوڑیئے یہ دیکھئے میں نے کتنا جلدی آپ کو فارغ کیا ہے میں جلدی نہ کرتا تو آپ سارا دن یہیں بیٹھے رہتے۔" شیخ صاحب نے سوچا مزید بات کا کوئی فائدہ نہیں بد مزگی میں خواہ مخواہ اضافہ ہی ہوگا چپ چاپ جیب سے ہزار کا نوٹ نکالا اور قصاب کی طرف بڑھا دیا۔ لیکن اُن کا منہ کڑوا ہو رہا تھا اور اس کڑواہٹ میں ہزار کا نوٹ بھی شامل ہو گیا تھا۔

"لو بھئی ہزار ہی لو لیکن دیکھو تو۔۔۔ تم نے گوشت کا کیا حشر کیا ہے لگتا ہے کسی اناڑی نے چھری نہیں ٹوکا چلایا ہے خود بھی بیکار اور انتہائی بیہودگی ہے۔" قصاب کے پاس اِتنا وقت کہاں تھا کہ وہ اُن کی بات سنتا یا اُن سے بحث کرتا اُس نے چپ چاپ ہزار روپے کا نوٹ جیب میں ڈالا اور دوسرے بکرے کے بڑے ٹکڑے جو اُس کے سامنے آ چکے تھے اُن کا تیا پانچہ کرنے میں مصروف ہو گیا لیکن شیخ جی کی بات اُسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ ٹوکا چلاتے ہوئے اُس نے جواب دیا۔

"ٹوکا تو میں نے چلایا ہی ہے آپ جانیں چھری سے کام لیتا تو دن بھر میں دو چار بکرے ہی کاٹ سکتا تھا لیکن عید کا دن روز روز تھوڑی آتا ہے۔" شیخ جی نے اُسے ہو نہہ کہہ دیا۔

"عید اگر سال بھر میں ایک ہی بار آتی ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ جانوروں کی ایسی تیسی کر دیں۔ دیکھو تمہارے شاگرد نے کھال کو بھی نہیں بخشا اُسے زخمی کر دیا ہے۔" قصاب پھر بھی مصروف رہا۔

"یہ بات نہیں شیخ جی بس ذرا ہاتھ تیز چلتا ہے۔" شیخ جی اب چلنے ہی والے تھے۔

"کیا ہاتھ تیز چلتا ہے خود دیکھئے ہو گوشت بوٹیاں کم اور چھیچھڑے زیادہ دکھائی دیتا ہے کوئی بوٹی سلامت تو ہے نہیں۔ کھال اُس لڑکے نے الگ زخمی کر دی ہے۔ اب کس کام کی رہی ہے۔" اب قصاب سے صبر نہ ہو سکا اُس نے ہاتھ روکا چبھتی ہوئی نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا اور سر جھٹکا کر بولا۔

"آپ کہتے ہیں کوئی بوٹی سلامت نہیں حضور کوئی سا ٹکڑا اُٹھایئے میں بتا سکتا ہوں وہ جانور کا کیا رِان کا ہے کہ پایا ہے۔ پھر یہ تو پھر ایک ہی جانور کا گوشت ہے ایک ہی جگہ میں جب ٹکڑوں نہیں تو پھر یوں انسانوں کے چیتھڑے اُڑتے ہیں تو اُن کی پہچان ہی نہیں ہو پاتی۔ بوٹیاں دیواروں چھتوں سے چپکی یا سڑکوں اور نالوں میں بہتی دکھائی دیتی ہیں۔ بیشتر سر ہی ملتا ہے وہ بھی قابلِ شناخت نہیں ہوتا اُس پر آپ الزام دیتے ہیں کر سیدھے سے بکرے کا سر دیکھئے کتنا صاف ستھرا دکھائی دے رہا ہے بس ذرا خون میں ڈوبا ہوا ہے۔" شیخ جی رُک نہ سکے چپ چاپ تھیلے اُٹھائے اور گاڑی کو ہو لئے قصاب ابھی تک بڑبڑائے جا رہا تھا۔

تنقید کا نیا منظر نامہ اور وزیر آغا

☆

☆ وزیر آغا کو دیکھ کر انسان کا تصور بدلا ہوا نظر آتا ہے معنی و مفہوم کا تصور بدلا ہوا نظر آتا ہے اور ادب کی نوعیت و ماہیت اور اظہاری ذرائع کا تصور بدلا ہوا نظر آتا ہے۔

☆ وزیر آغا خوبصورتی اور نئے پن کے متلاشی ہیں۔

☆ انہوں نے فن کو حسن کی میزان پر پرکھا اور حسن کو وجدان کے عمل پر تولا ہے۔

☆ انہوں نے محوری تناظر میں جڑوں کی تلاش کی ہے۔

☆ ثقافتی اور تہذیبی جڑوں کی تلاش میں وزیر آغا نے خود کو اجاگر کیا ہے۔

☆ سوچ کے نئے نئے زاویے ابھارے ہیں۔

☆ مابعد الطبیعات کو اساسی حیثیت تفویض کی ہے۔

☆ اجتماعی شعور اور اجتماعی لاشعور کے درمیان رابطہ یگانگت قائم کیا ہے۔

☆ وزیر آغا نے اردو تنقید کو ایک فعال تعبیری رجحان عطا کیا ہے۔

☆ وزیر آغا کشادہ انداز نظر کے مالک اور عہد حاضر کے محافظ اقدار ہیں۔

۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے تنقیدی نظریات پر مبنی کتاب "تنقید کا نیا منظر نامہ اور وزیر آغا" میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے نہایت واضح اور دو ٹوک انداز گفتگو اپناتے ہوئے تنقید کے بہت سے نئے گوشے اور نئی جہتوں کو نمایاں کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر صاحب۔

"اس کتاب میں تنقید کے کئی بت ٹوٹتے نظر آتے ہیں، آگہی کی کئی پرتیں کھلتی نظر آتی ہیں، جدید سائنسی نظریۂ حیات پر مبنی ولولہ انگیز موثر اور منضبط انداز نظر کے سیاق و سباق ملتے ہیں، روشن خیالی اور صحت مند افکار کی مستحکم روایات کی ابتدا ملتی ہے اور نئے انقلاب آفریں نظریے کی کئی راہوں کے نقوش ملتے ہیں۔"

دل و دماغ کو روشنی، تازگی اور حرارت عطا کرنے والی یہ اہم کتاب ایک سو بتیس صفحات پر محیط ہے جس کی دستیابی فقط ایک صد ہندوستانی روپے کے عوض، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، وکیل گلی، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی، بھارت سے با آسانی دستیاب ہو سکتی ہے۔

☆☆

☆

فائدہ

نند کشور وکرم (دہلی بھارت)

ہری دوار سے دہلی کے لئے بسیں ساری رات چلتی تھیں اس لئے دیپک نے سوچا کہ کیوں رات ہر دوار میں رک کر وقت ضائع کیا جائے بجائے صبح کے بجائے رات کو ہی دہلی کے لئے روانہ ہو جانا بہتر سمجھا۔ اور پھر اس کے پاس وقت ہی کون سے تھا۔ پرسوں اس نے نیویارک کی فلائیٹ پکڑنی تھی۔ وہاں بھی اس کے کئی کام لگے ہوئے تھے۔ اُسے تو کام سے کان کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ لیکن یہاں آنا بھی بہت ضروری تھا کیونکہ اس کے پاپا نے مرتے وقت نمک آلود آنکھوں اور بھرے ہوئے دل سے کہا تھا۔ "بیٹا کچھ بھی ہو جائے میرے پھول ہردوار کی ہر کی پوڑی پر ہی پرواہنا۔" پاپا کی یہ آخری خواہش تھی۔ وہ ساری زندگی جام نگر کے پاس ایک چھوٹے سے گاؤں بھٹیا میں رہے رہے تھے۔ اس نے ان سے کئی بار امریکہ آنے کے لئے اصرار کیا مگر ہر بار انہوں نے ٹال مٹول کر دی کیونکہ وہ اپنے گاؤں کی مٹی کی خوشبو اور ہرے بھرے کھیتوں کے سکون آمیز ماحول کے ایسے عادی ہو چکے تھے کہ انہیں باہر کہیں اور جانے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ ہاں اس کے بار بار اصرار پر اس کی ماتا جی ایک بار ضرور امریکہ گئی تھیں اور چند مہینے بسر کر کے واپس چلی آئی تھیں کیونکہ ان کا وہاں ذرا بھی جی نہیں لگا تھا کیونکہ وہ دونوں میاں بیوی صبح ہوتے ہی کام پر نکل جاتے اور بچے اسکول اور وہ سارا دن گھر میں بند پڑی رہتیں۔ گاؤں میں تو وہ پاس پڑوس کے چلی جاتی تھیں۔ مگر یہاں ایسا کوئی رواج نہ تھا اور پھر اس کے پڑوس میں کوئی ہندوستانی بھی نہیں تھا۔ انگریز تھے جو ویسے ہی ہندوستانیوں کے ساتھ سوائے بزنس کے کسی قسم کے سوشل تعلقات بہت کم ہی رکھتے ہیں۔ اس گھٹن بھرے ماحول سے وہ جلدی ہی اُوب گئیں اور بیٹے کے اصرار کے باوجود وہاں مزید نہ رکیں اور گاؤں واپس چلی گئیں۔

پاپا اس کے بار بار اصرار پر بھی ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے اُس کی دعوت کو ٹالتے رہے لیکن جب اُن کی بیوی کا انتقال ہو گیا اور وہ یک و تنہا رہ گئے اور گھر کاٹنے لگا تو بالآخر انہوں نے امریکہ جانے کا پروگرام بنا ہی لیا۔ انہوں نے سوچا چلو اسی بہانے اپنے پوتے اور پوتی کو دیکھ لوں گا کیونکہ دیپک تو دس برس سے ہندوستان آیا ہی نہیں تھا۔

نیویارک آ کر اس کے پاپا نے اپنے پوتے پوتی کے ساتھ کچھ دن تو دیکھا کاٹے مگر پھر انہیں گھر کی یاد ستانے لگی۔ وہ بار بار اپنے بیٹے سے کہتے بیٹا میرا ٹکٹ کنفرم (confirm) کرا دو میں گھر واپس جانا چاہتا ہوں مگر وہ کوئی نہ کوئی بہانا کر کے انہیں روک لیتا۔ آخر جب انہوں نے بہت اصرار کیا تو اس نے اُن کی ٹکٹ ایک ہفتے بعد کی کنفرم کرا دی مگر شومئ قسمت کہ جانے سے دو دن پہلے اُن کی طبیعت خراب ہو گئی اور انہیں ہسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ ہسپتال جاتے ہی انہیں ایسا احساس ہونے لگا کہ اب وہ زندہ نہیں بچیں گے اور انہیں اپنے گاؤں واپس جانا نصیب نہیں ہو گا اور جس بات کا انہیں دھڑکا لگا رہتا تھا اس کے آثار نظر آنے لگے۔ معلوم نہیں انہیں کیوں وہم تھا کہ اگر وہ گاؤں سے امریکہ گئے تو واپس گاؤں نہیں آ سکیں گے اور وہاں اُن کی موت ہو جائے گی۔ وہ موت سے ڈرتے نہیں تھے مگر انہیں یہ وہم تھا کہ وہاں موت ہو جانے پر لاش کو کئی کئی دن تک سرد خانے میں پڑی خوار ہونا پڑتا ہے کیونکہ وہاں نمبر پا لینے والوں کو ہی نذرِ آتش کرنے کا رواج ہے۔ باقی دن تو کسی کے پاس لاش کو نذرِ آتش کرنے کا بھی وقت نہیں۔ اور ہسپتال میں آتے ہی انہیں پورا یقین ہو گیا کہ اب وہ واپس نہیں جا پائیں گے اس لئے انہوں نے ایک دن اُسے اپنے پاس بٹھا کر نمک آلود آنکھوں اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ بیٹا! ایک بات کہوں"۔

"کہیا پاپا"۔ وہ اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا۔

"دیکھو بیٹا اب مجھے اپنے بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ اس لئے تم سے ایک درخواست ہے کہ میرے پھول ہری دوار میں جا کر جل پرواہ کرنا کیونکہ صدیوں سے ہمارے بزرگ وہیں جا کر اپنے اجداد کے پھول گنگا میں پرواہ کرتے رہے ہیں۔"

"پاپا! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ اور پھر آپ کی عمر ہی کتنی ہے۔"

"نہیں بیٹا جھوٹی تسلی مت دو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے۔"

"اور سچ مچ ہوا بھی یہی۔ اس گفتگو کے تین دن بعد اُن کا ہسپتال میں انتقال ہو گیا۔ اتفاق سے دوسرے دن سنڈے تھا اس لئے بقول اُن کے انہیں زیادہ خوار نہیں ہونا پڑا۔ دوسرے دن ہی ان کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ اور پھر اُن کی آخری خواہش کا احترام کرتے ہوئے دیپک سب ضروری اور غیر ضروری کام چھوڑ چھاڑ کر ہندوستان آ گیا۔ جہاں اُس نے اپنے آبائی گاؤں میں پورے رسم و رواج سے ان کا کریا کرم کیا۔ اور پھر وہ ان کے "پھول" (باقیات) سپردِ آب کرنے کے لئے ہری دوار چلا آیا۔

اس کا خیال تھا کہ رات کو بس میں کم لوگ سفر کرتے ہوں گے اس لئے سیٹ آرام سے مل جائے گی۔ مگر ایسا نہ تھا۔ بس تو معمول کی طرح بھری ہوئی تھی۔ پنجاب اور دہلی کے ہی نہیں راجستھان، گجرات اور نہ جانے کہاں کہاں کے یاتری سفر کر رہے تھے۔ بہرحال اسے بڑا کسی وقت کے ایک سیٹ مل گئی اور اس نے سکھ کی سانس لی۔

بس چلنے کے چند منٹ بعد ڈرائیور نے اندر کی بتیاں گل کر دیں اور چند ہی منٹ میں کچھ لوگ اونگھنے لگے اور کچھ آپس میں ادھر ادھر سے باتیں

کرنے میں مصروف ہو گئے اور جب بس زنڈی پہنچی تو چند سواریاں اُتر گئیں اور کچھ نئی سواریاں بس میں سوار ہو گئیں۔ بس پھر حسبِ معمول دہلی کی جانب روانہ ہو گئی۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ اُسے نیند آ جائے مگر اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ماضی کی یادوں کے سایوں نے اسے بُری طرح گھیر رکھا تھا۔ اور تصورات میں وہ نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا کہ اچانک بڑے زور سے ٹائر چیخنے کی آواز ہوئی۔ ڈرائیور اور کنڈکٹر نے جلدی سے اُتر کر صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہا مگر گاڑی کو چار پانچ لمبے چوڑے ڈاکوؤں نے گھیر رکھا تھا جن کے چہرے کپڑے سے ڈھانپے ہوئے تھے اور صرف آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ انہوں نے ڈرائیور کو بس مین سڑک سے دائیں جانب کسی گاؤں کی طرف مڑنے والی ایک چھوٹی سی تنگ سڑک کی طرف موڑنے کے لئے کہا تا کہ وہ کسی روڈ پر کسی خطرے کا شکار نہ ہو جائیں۔ بس کے ذیلی سڑک پر ایک فرلانگ کی دوری پر لے جانے کے بعد روک دیا گیا اور چاروں پانچوں مشٹنڈے ڈاکو بس میں گھس آئے اور ان میں سے ایک نے اپنا پستول ڈرائیور کی کنپٹی پر لگا دیا کہ اگر وہ ذرا بھی ہلے جلے تو اُسے گولی سے اُڑا دیا جائے، اور باقی ڈاکوؤں نے سب مسافروں کو فوراً ساری نقدی اور زیور وغیرہ چپ چاپ انھیں سونپنے کا حکم دیا۔ کچھ مسافروں نے تھوڑے سے احتجاج کے بعد روپے پیسے جو بھی پاس تھے اُن کے حوالے کر دیے مگر کچھ عورتیں تو زور زور سے رونے لگیں اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر زیور اور روپیہ نہ لینے کے لئے التجا کرنے لگیں۔ کچھ مردوں نے بھی رو رو کر اُن سے رحم کی بھیک مانگی مگر اُن ڈاکوؤں کے دل میں رتی بھر بھی ترس نہ تھا انہوں نے سب سے زبردستی روپے پیسے اور زیورات چھین لیے۔

جب وہ لٹیرے دیپک کے پاس پہنچے تو اُس نے بغیر کسی احتجاج کے جو ڈھائی تین ہزار روپے اس کے پاس تھے اُن کے حوالے کر دیے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ان لوگوں سے بحث مباحثہ بیکار ہے اور پھر جان کا خطرہ بھی۔ کیونکہ وہ اس طرح کے ایک واقعہ کا نیویارک میں بھی شکار ہو چکا تھا جسے وہاں مگنگ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

جب وہ نیویارک میں نیا نیا آیا تھا اور اُن دنوں وہاں مگنگ کے واقعات اکثر ہوتے رہتے تھے۔ اس کے ساتھیوں نے سمجھا رکھا تھا کہ اپنے پاس اتنی رقم رکھا کرو کہ وہ تمہیں کچھ نہ کہیں۔ کیونکہ مگنگ کرنے والے زیادہ تر بے کار اور اوباش کالے ہوتے ہیں اور خالی جیب یا پانچ دس ڈالر نکلنے پر تو وہ اپنے شکار کی پٹائی بھی کر دیتے ہیں کہ سالے تمہارے پاس اتنے کم پیسے کیوں ہیں۔ اس لئے وہ اپنی جیب میں لگ بھگ پچاس ساٹھ ڈالر رکھتا تھا۔ اور پھر ہوا بھی یہی کہ ایک دن جب وہ نو دس بجے کام سے لوٹ رہا تھا تو ایک سنسان اسٹریٹ میں اُسے چند کالوں نے گھیر لیا اور پرس ان کے حوالے کرنے کو کہا۔ اُس نے وقت کی نزاکت کو پہچانتے ہوئے چپ چاپ پرس اُن کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے پرس میں پڑے ساٹھ ستر ڈالر نکال لئے اور پرس دے کر اُسے گھر جانے کے لئے چھوڑ دیا۔

بس کے مسافروں سے سارا مال متاع اکٹھا کرنے کے بعد وہ ڈاکو بس میں ہی بیٹھ کر نوٹ گننے لگے پھر زیورات اور دیگر سامان کی قیمت آنکنے لگے۔ جب وہ حساب کتاب کر چکے تو وہ شخص جو غالباً اُن کا سردار تھا اور جس نے ڈرائیور کی کنپٹی پر پستول تانا ہوا تھا اُن میں سے ایک کو مخاطب کر کے کہا۔

"ارے جگو!"

"جی حضور"

"حساب کر لیا"

"جی حضور" اس نے بڑی انکساری سے کہا

"تو کتنے ہے؟" سردار نے پوچھا

"کوئی ڈیڑھ لاکھ کا مال ہو گا سردار"

"بس! کیا صرف ڈیڑھ لاکھ" سردار کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"جی حضور"

سردار ایک مدت سوچ میں پڑ گیا جیسے یہ بس لوٹ کر کوئی بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔ پھر وہ اُس سے جو غالباً اُس کا نائب تھا، مخاطب کرتے ہوئے بہت ہی مایوسانہ لہجے میں کہا "تو ایسا کرو ان سب مسافروں کی رقم واپس کر دو اور بس کو جانے دو"

"کیوں سردار"

"کہ سالا دو لاکھ تو ہمیں پولیس کو ہی دینے پڑیں گے پھر فائدہ؟"

اور اس کے بعد مسافروں کو روپے پیسے اور زیورات وغیرہ لوٹا کر پانچوں رات کے اندھیرے میں گم ہو گئے۔

☆

اشارہ

اُس پر بھی میرے دل کو کہاں اختیار تھا
وہ دن جو تیرے غم کے لیے سازگار تھا
ہونے دیا نہ مجھ کو کسی کا تمام عمر
غم تیرا تجھ سے بڑھ کے سلیقہ شعار تھا

جنید آزر کو جو چیز اپنے ہم عصر جدید شعراء سے ممیز و ممتاز کرتی ہے وہ ان کی شاعری میں بامقصد معنویت کا عنصر اور حب الوطنی کا جذبہ ہے۔

محسن بھوپالی

قیمت: 150 روپے   دستیاب: بلا بیل کشتر، اسلام آباد

رابطہ مصنف: junaidazar@yahoo.com

نقش بر سنگ

ڈاکٹر فیروز عالم (امریکہ)

ایک طویل اور تھکا دینے والے دن اور طویل رات کا بھی زیادہ حصہ مریضوں کی آؤ بھگت کے درمیان گزار کر میں کچھ ہی دیر پہلے اپنے کمرے میں آیا تھا اور بستر پر گرتے ہی ایسی گہری نیند میں مدہوش ہو چکا تھا کہ جب وارڈ بوائے نے دروازہ پیٹ پیٹ کر مجھے جگانے کی کوشش کی تو کچھ دیر تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ میں کہاں ہوں۔ وقت اور جگہ کا احساس میرے ذہن میں گڈمڈ ہو چکا تھا دماغ گھوم رہا تھا اور چکر سے آ رہے تھے۔ اتنی گہری نیند سے یوں اچانک اٹھائے جانے پر میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور اسی کے ساتھ سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میں ان دنوں نوجوان تھا۔ مجھے ڈاکٹری کی سند لئے ایک ہی سال ہوا تھا اور میں اس چھوٹے سے شہر کے سرکاری ہسپتال میں ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ "صاب جلدی چلو ایک بہت خراب کیس آیا ہے۔ شاید اب تک مر ہی چکا ہو"

میں نے جلدی جلدی جوتوں میں پیر گھسیڑے، سرہانے رکھا اسٹیتھسکوپ اٹھایا اور بھاگتے ہوئے وارڈ کی طرف روانہ ہوا۔ اس شہر میں جلنے کے واقعات عام تھے۔ کھانا پکانے کے لئے چولہے اور لکڑیاں استعمال ہوتی تھیں جن پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ دکھائی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ خاتون خانہ کو چولہے پر جھک جھک کر پھکنی کے ذریعہ آگ کو دہکانے کی بھی ضرورت پڑتی تھی ایسے میں ہوا کے جھونکے یا ڈھیلے ڈھالے کپڑوں کی وجہ سے ان عورتوں کا آگ کی لپیٹ میں آجانا عام تھا۔ لیکن جب میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ جلنے والا ایک نوعمر لڑکا ہے۔ محلے والے اسے چارپائی پر ڈال کر ہسپتال لے آئے تھے اور اب ہمارے عملے نے اسے جنرل سائز کی ٹیبل پر لٹا دیا تھا۔ میں نے اسکا جائزہ لیا۔ اسکا نام اطہر تھا اور اس نے ابھی کچھ دنوں پہلے سولہویں سالگرہ منائی تھی۔ اس وقت وہ انتہائی سنگین حالت میں تھا۔ ہاتھ پیر اس بری طرح جلے تھے کہ میں اسکا بلڈ پریشر بھی نہیں لے سکا تھا۔ چہرہ جھلس گیا تھا اور سر کے بال اور بھنووں کے جلنے کی چراند پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہونٹ جل کر دانتوں سے چپک گئے تھے اور اس کے ساتھ پورا جسم جس میں سینہ پیٹ اور رانیں شامل تھیں بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ وہ بہت بری طرح جلا تھا اور نیم بیہوشی کے عالم میں تھا مگر بہت ہی کمزور آواز میں کبھی کبھی پانی کی پکار لگاتا تھا۔ قصبے کے اس چھوٹے ہسپتال میں میں جو کچھ بھی کر سکتا تھا کر رہا تھا۔ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ ہم اسے ضلع کے ہسپتال میں بھیج سکتے راستہ دور تھا اور مجھے تو یہ یقین تھا کہ وہ راستے ہی میں دم توڑ دیگا۔

باہر بہت لوگ تھے اور سب ٹولیوں میں بٹ کر حادثے پر تبصرہ کر رہے تھے۔ اس کی ماں کی حالت قابل رحم تھی۔ باپ بظاہر صبر کا دامن تھامے ہوئے تھے مگر اترا تمتمایا ہوا چہرا اندرونی جذبات کی غمازی کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے بس تسبیح کے دانے گھما رہے تھے اور بار بار ان کے منہ سے صرف یہی نکلتا تھا "مالک جو تیری مرضی"

تھوڑی دیر کے لئے میں جب کنسلٹنگ روم میں آیا تو تیزی سے ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ تقریباً اسکی ماں ہی کی عمر کی تھی۔ میں سمجھا کہ شاید اسکی خالہ ہو مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی حالت تو اسکی ماں سے بھی زیادہ خراب ہے۔ اسکے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ بمشکل بول پا رہی تھی۔ اس نے میرے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر مجھ سے کہا "ڈاکٹر صاحب اسے بچا لیں۔ اسے ضرور بچالیں اگر یہ مر گیا تو میں خود اپنا سامنا کیسے کروں گی۔ میرا ضمیر مجھے زندہ نہیں رہنے دیگا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی خودکشی کر لوں گی"

"تم کون ہو اور یہ کیا کہہ رہی ہو" مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ تیزی سے منہ پھیر کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

صبح تک ہم نے بڑی جد و جہد کی مگر اللہ کو مریض کی زندگی منظور نہ تھی شاید اسکے مقدر میں یہی لکھا تھا کہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اسکی زندگی کی شمع گل ہو جائے۔ میں بہت دل برداشتہ واپس اپنے کمرے میں آیا۔ مجھے اس واقعہ کے بارے میں تجسس تھا وہ عورت بھی میرے ذہن میں گردش کر رہی تھی۔ ویسے بھی اس کیس میں اب پولیس بھی شامل ہو چکی تھی اس لئے کچھ دن بعد واقعات کی کڑیاں ملتی چلی گئیں۔

چھوٹا سا محلہ تھا جیسے عام سے محلے ہر شہر میں ہوتے ہیں۔ سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اطہر کا گھر ایک بند گلی میں تھا دونوں جانب پرانی وضع کے مکان تھے۔ اونچی ڈیوڑھیوں کے بیچ جن کے سامنے آنگن تھے اور لکڑی کے کواڑوں پر چقیں اور ٹاٹ کے پردے پڑے رہتے تھے۔ اطہر کے والد سبزی منڈی میں آڑھتی کا کاروبار کرتے تھے اور اطہر انکی واحد اولاد تھی۔ ایک تو مختصر کنبہ اور پھر بہتر کاروبار اس لئے وہ محلے میں متمول سمجھے جاتے تھے۔ اطہر بچپن میں بڑا گورا چٹا اور گول مٹول ہوتا تھا اور اپنی شوخ اور دل لبھانے والی حرکتوں سے سب کو بہت پیارا تھا۔ اسی گلی میں کچھ مکان چھوڑ کر اسلام الدین اپنی بیوی رضیہ کے ساتھ رہتے تھے۔ رضیہ ایک خوش شکل اور خوش مزاج عورت تھی جو اطہر کی والدہ سے چند ہی سال چھوٹی تھی اور انکی ان سے بڑی دوستی تھی۔ گلی میں رہنے والے تمام گھرانے ایک کنبے کی طرح تھے اور سب کا ایک دوسرے کے یہاں بے تکلف آنا جانا تھا۔ بچے بھی سب ہی گھروں میں کبھی کھیل کے بہانے اور کبھی پڑھائی کے بہانے آیا جایا کرتے تھے۔ اطہر یوں تو سب ہی کا لاڈلا تھا مگر اسکا دل اسلام الدین کے یہاں سب سے زیادہ لگتا تھا وہ یہاں گھنٹوں کھیلا کرتا تھا اور جب تک کہ اس کی امی اسے زبردستی گھر نہ بلواتی تھیں وہ یہاں سے ٹلتا نہیں تھا۔ اسے رضیہ کی

باتیں بہت اچھی لگتی تھیں رضیہ تھیں بھی ایک انتہائی دلچسپ شخصیت۔ کہ اپنے بچے تو تھے نہیں اس لئے انہیں گلی کے بچوں سے بڑا پیار تھا۔ وہ بچوں میں بڑی اور بچوں میں بچی بن جاتی تھیں۔ بچوں کے دل کو لبھانے والی ان میں بہت سی باتیں تھیں کبھی وہ ان کے ساتھ لوڈو اور دوسرے گیم کھیل رہی ہیں تو کبھی آنکھوں پر دوپٹہ باندھ کر چور بن کر بچوں کو پکڑ رہی ہیں۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں نہ جانے کہاں سے ڈھیروں کہانیاں یاد تھیں اور وہ اظہر کی فرمائش پر ہر دفعہ ایک نئی کہانی سنانا شروع کر دیتی تھیں۔ اظہر انہیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھا رہتا اور وہ کہانی سناتی جاتیں۔ کہانی کوئی بھی ہو مگر ہر کہانی میں ایک شہزادی کسی خوبرو شہزادے کا انتظار کر رہی ہوتی جو آ کر اسے دیو کے پنجے سے چھڑا کر سفید گھوڑے پر بٹھا کر اپنی راجدھانی لے جاتا۔ اظہر کہانیوں میں کھو جاتا اور خیالوں ہی خیالوں میں خود کو وہ شہزادہ سمجھنے لگتا جو ایک دن ضرور شہزادی کو آزاد کرائیگا۔

شاید یہ انکی تیسری سالگرہ تھی۔ ماں باپ کی اکلوتی اولاد اور پھر خوشحال گھرانا۔ بہت دھوم دھام سے تقریب منائی گئی۔ اظہر جسے سب پیار سے اَجّو میاں کہتے تھے دولہا بنے ہوئے تھے

زربفت کی زرنگار شیروانی اور اسی کپڑے کی ٹوپی، گلے میں گلاب کے سرخ پھولوں کا ہار۔ کسی نے پوچھا "ارے بھئی اَجّو میاں تم تو سچ مچ کے دولہا لگ رہے ہو یہ بتاؤ شادی کس سے کرو گے؟" سامنے ہی رضیہ بیگم سبز ساڑی اور سرخ قمیض اور کرن لگے سبز دوپٹے میں کھڑی تھیں دو موٹی موٹی چوٹیاں کندھوں سے ڈھلک کر سامنے پڑی تھیں۔ انکی کالی کالی آنکھیں کاجل سے اور کجراری ہو گئی تھیں۔ اَجّو میاں نے اپنا ننھا سا ہاتھ اٹھایا اور انگلی انکی طرف کر کے کہا "ان سے!!" محفل میں ایک قہقہہ سا پڑا۔ رضیہ جھینپ کر کہنے لگیں

"لو بولو بھلا۔ میں انکی ماں کے برابر!! میاں جب پوچھوں گی جب بڑے ہو جاؤ گے اور مجھ بڑھیا پر اس وقت نظر بھی نہیں ڈالا کرو گے" بات ہنسی میں اڑ گئی۔

شاید کوئی وقت قبولیت کا ہوتا ہے۔ اپنی اس معصوم سی حرکت کو اظہر بھول بھی گیا تھا مگر ایک بات ضرور تھی کے اس کے دل میں رضیہ جنہیں وہ رضو آپا کہتا تھا کے لئے ایک ایسا لگاؤ تھا کہ وہ خود بھی اسے صحیح طور پر سمجھ نہیں سکا تھا۔ اسکا اسکول میں دل نہیں لگتا اور وہ اس بات کا بے صبری سے انتظار کرتا کہ کب چھٹی ہو اور وہ گھر لوٹ کر رضیہ کے یہاں جائے۔ رضیہ بھی اسکے لئے انکی پسند کی ہوئی گاڑھی ملائی کی چائے تیار کرتیں جسے وہ بہت مزے لے لے کر پیتا۔ وہ اپنے گھر سے کہیں زیادہ رضیہ کے یہاں وقت گزارتا تھا۔ یوں سمجھو کہ اسکا اپنے گھر میں تو دل ہی نہیں لگتا تھا کہ اگر رضیہ سامنے نہیں ہوتی تو اسے عجیب سناٹا اور خالی خالی سا لگتا۔ انکی ماں کبھی کبھی ہنس کر رضیہ کو چھیڑتیں کہ بھئی تم نے تو میرا اچھا ہی مجھ سے چھین لیا ہے۔ بھیا کیا جادو کر دیا ہے کہ اسکا تو اپنے گھر میں دل ہی نہیں لگتا۔ رضیہ اس پر ہنس دیتیں۔ آخر کو تو اظہر بچہ ہی تھا اس نے ابھی ابھی پانچویں جماعت شروع کی تھی۔ اور انکی معصوم حرکتوں میں بظاہر کوئی بات تشویش کی نہیں تھی۔

اظہر کو دو ماؤں کا پیار حاصل تھا۔ اس کی ہر خواہش پوری کی جاتی۔ اس کے لاڈ بھی جیسے انکی شکل دیکھ کر جیتے تھے۔ وہ اس بات کا عادی ہوتا جا رہا تھا کہ وہ جو چیز بھی چاہتا ہے وہ اسے فوراً ہی مہیا کر دی جاتی ہے۔ اب وہ ہائی اسکول میں آ چکا تھا۔ اس لئے ماں باپ نے اسکے مزید نخرے اٹھانے شروع کر دیئے تھے۔ جیسے کپڑے وہ پہنتا تھا ملے تو کیا تمام اسکول میں ایسے قیمتی کپڑے کوئی نہیں پہنتا تھا۔ اتنی کم عمری میں اماں ابا نے موٹر سائیکل دلا دی تھی جسے وہ تیز آواز کے ساتھ محلے میں اڑائے اڑائے پھرتا۔ کچھ دوست احباب بھی تھے مگر ایک چیز جس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا وہ اسکا رضیہ سے لگاؤ تھا جسے وہ کوئی نام نہیں دے پاتا تھا۔ وہ اپنے دوستوں سے کہیں زیادہ رضیہ کے گھر میں وقت گزارتا تھا۔ کبھی کبھی تو اسکے پاس رضیہ سے باتیں کرنے کو کچھ بھی نہیں ہوتا پھر بھی وہ چپ چاپ صرف انکی شکل ہی ایک ٹک دیکھا رہتا اور اسی سے اسے ایک اطمینان اور سکون سا حاصل ہو جاتا۔ رضیہ یا انکی ماں کو اس میں کوئی تشویش کا پہلو نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اسی محلے میں پلا بڑھا تھا سب کی گودیوں میں کھیلا تھا اسلئے بڑے ہونے کے باوجود اس سے کسی قسم کے پردے کا بھی کوئی سوال نہیں اٹھا تھا۔ پھر اظہر اپنے کردار اور چال چلن کے لحاظ سے ایک نہایت شریف لڑکا تھا۔ اور لڑکوں کی طرح وہ لڑکیوں کے اسکول کے باہر کھڑے ہو کر اٹھکیلیاں نہیں کیا کرتا تھا نہ ہی محلے کے دوسرے لڑکوں کی طرح اس نے چھپ چھپ کر سگریٹ پینا شروع کی تھی۔ وہ سنیما اور فلمیں دیکھنے کا بھی شوقین نہیں تھا۔ بس اسے تو رضیہ سے ایک معصوم لگاؤ تھا اور وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت ان کیساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ کیوں؟؟ فی الحال اسکا جواب اسکے پاس بھی نہیں تھا۔

مگر جب وہ عمر کے اس دور میں داخل ہوا جب جسم میں قدرتی تبدیلیاں آتی ہیں۔ آواز میں مردانگی کی جھلک نمایاں ہوتی ہے اور ہونٹوں کے اوپر بالکل مہین سی سیاہ روئیں نمودار ہوتا ہے تو اس لگاؤ نے اسے ایک عجیب بےکلی میں مبتلا کر دیا۔ اب وہ خود سے الجھنے لگا تھا۔ وہ کچھ نہیں پا رہا تھا کہ ایسا کیوں ہوا اور وہ اس لگاؤ کو کیا نام دے۔ اب جذبات کا دوسرا رنگ تھا احساسات میں ایک نئی امنگ تھی اور اب رضیہ کو دیکھ کر اسکے جسم میں ایک سنسنی سی، ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا تھا۔ وہ راتوں کو سوتے سوتے چونک کر اٹھ جاتا۔ دل رضیہ کو تلاش کرتا۔ اسے اس لمحہ رضیہ کی کمی محسوس ہوتی۔ یہ کمی ایک دوسرا انداز لئے ہوتی۔ اب وہ کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا۔ اسے رضیہ سے محبت ہو گئی تھی۔ محبت!! محبت تو شاید اسے اس دن ہی سے تھی جب اس نے رضیہ کو اپنی معصوم نظروں سے پہلے پہل دیکھا تھا۔ جب اس نے رضیہ کے آنگن میں ڈگمگا ڈگمگا کر چلنا شروع کیا تھا

پھر جب اس نے نوزرخی کے جوڑے میں ملبوس اپنی ٹھوڑی سی انگلی اٹھا کر کہا تھا کہ میں رضیہ سے شادی کروں گا۔ پھر یہ کہ جب خالق کائنات نے انکی مٹی گوندھی تھی تو شاید اسی دن اس میں رضیہ کی محبت بھی گوندھ دی تھی اور لوح محفوظ پر لکھ دیا گیا تھا کہ اس کے دل میں صرف اور صرف ایک ہی محبت جگہ پائے گی اور وہ ہوگی رضیہ کی محبت۔ وہ خود کو لاکھ سمجھاتا، اپنے آپ سے شرمندہ بھی ہوتا اور خود پر لعنت ملامت بھی کرتا مگر اسکو اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا تھا وہ سوتے سے چونک پڑتا اور جاگتے میں کھو جاتا۔ بس دل ایک ہی بات کی خواہش کرتا اور وہ تھی رضیہ کو پانے کی اور اسے کسی اور کی شرکت کے بغیر ہمیشہ کے لئے اپنا بنانے کی خواہش ۔ کبھی کبھی تو وہ اس کیفیت میں دیوانگی کی اس حد کو پہنچ جاتا کہ وہ اسلام الدین کو قتل کرنے تک کے منصوبے بنانے لگتا۔

ایک شام جب وہ حسب دستور رضیہ کی ہاتھ کی بنی ملائی دار چائے پی رہا تھا رضیہ نے محسوس کیا کہ وہ ہمیشہ کی طرح چونچال اور خوش نہیں لگ رہا۔ عام طور پر وہ اسے اپنے اسکول کے واقعات بڑی تفصیل اور جوش سے سنایا کرتا تھا مگر آج وہ چپ چپ تھا کچھ کھویا ہوا سا تھا پریشانی اسکے چہرے سے عیاں تھی۔ رضیہ نے اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے تم چپ چپ کیوں ہو؟؟ اظہر کو ایسا لگا جیسے رضیہ نے اسکا چور پکڑ لیا ہو۔ اسکا دل اس قدر زور سے دھڑکا اور اسکے ہاتھ اتنی شدت سے کانپنے لگے کہ چائے کی پیالی اور طشتری کے ٹکرانے کی آواز صحن میں گونج اٹھی۔ وہ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کو بالکل تیار نہ تھا وہ کچھ نہ بولا اور چائے کو جلدی سے ایک ہی گھونٹ میں حلق میں انڈیل کر کھڑا ہو گیا اور بھاگ کر اپنے گھر میں آ کر پہنچا۔

پوری رات تکیے میں کروٹیں بدلتے گذری عجیب کیفیت تھی۔ اس الجھن کا کوئی حل بھی نہیں تھا۔ اسے کوئی یہ سمجھانے والا نہیں تھا کہ یہ تو ''پپی لو'' (PUPPY LOVE) ہے اور وقت کے ساتھ یہ طوفان اتر جائیگا۔ ہمارے معاشرے میں اس بات کی روایت نہیں کہ نوجوانوں کی نفسیاتی رہنمائی کی جائے اور انکے دل و دماغ میں پلنے والی الجھنوں کو سلجھانے میں انکی مدد کی جائے۔ وہ زندگی میں ہر چیز حاصل کرنے کا عادی تھا پھر اس وقت اس کے جذبات ایسے تھے کہ رضیہ کے بغیر اسے تمام کائنات بے رونق اور بے معنی نظر آرہی تھی۔ اسے اپنی ہر سانس رضیہ کے بغیر نامکمل اور ادھوری محسوس ہوتی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ رضیہ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ رضیہ کے بغیر زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی اور اسے اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانا ہی ہوگا۔

دوسرے دن وہ ایک خاص خود اعتمادی کے ساتھ رضیہ کے یہاں گیا۔ رضیہ نے محسوس کیا کہ وہ خلاف عادت بہت سنجیدہ ہے۔ رضیہ نے بڑی کوشش کی کہ ہلکا پھلکا ماحول طاری ہو جائے مگر اظہر کے ذہن پر تو ایک ہی بات سوار تھی۔ آخر اس نے کہا جو بیاں کیا بات ہے تم کچھ پریشان ہو؟ کچھ کہنا چاہتے ہو؟؟ بس اظہر کے ضبط کا بندھ ٹوٹ گیا اس نے بغیر کسی تمہید یا ہچکچاہٹ کے رضیہ سے کہا رضو آپا میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ رضیہ گڑبڑا گئی وہ کچھ سمجھی نہیں۔ اظہر نے پھر کہا رضو آپا میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ شاید کوئی اور ہوتا تو رضیہ اسکے منہ پر اس زور کا طمانچہ مارتی کہ اسے ہمیشہ یاد رہتا۔ وہ ایک باعزت شادی شدہ عورت تھی۔ اس نے اظہر کو ہمیشہ اپنے سگے بیٹے ہی کی طرح چاہا تھا۔ اظہر اسکے ہاتھوں میں پلا بڑھا تھا اس لئے اس نے معاملے کو سلجھانے کی کوشش کی۔ اس نے سمجھا کر بات ٹالنی اور اسے سمجھانا چاہا مگر اظہر نے اس سے سنجیدگی سے کہا رضو آپا مجھ سے شادی کروگی؟؟ اب رضیہ نے اس سے ذرا سختی سے کہا اظہر یہ مذاق اچھا نہیں۔ بس چپ بھی کرو ورنہ میں تمہارے تھپڑ رسید کروں گی۔ اظہر نے کچھ نہیں کہا اور اٹھ کر چلا آیا۔ اس کے بعد اظہر رضیہ کے یہاں نہیں گیا ادھر رضیہ نے سمجھا کے اظہر کے سر سے عشق کا بھوت اتر گیا ہے۔

اسی زمانے میں اظہر کی سولھویں سالگرہ بڑی دھوم دھام سے ہوئی اظہر کے گھر میں مونچھ نکلنے پر ایک خاص تقریب ہوتی تھی۔ یہ تقریب سولھویں سالگرہ کے دن ہی ہوتی تھی۔ اس میں بھی سب شریک تھے ماحول خوشیوں سے بھرا تھا اور اظہر کی ماں اپنے بچے کی بلائیں لیتے نہیں تھکتی تھیں۔ رضیہ بھی تھی وہ چہکتی رہی تھی اور اظہر چپ چپ۔

دوسرے دن اظہر رضیہ کے گھر پھر گیا رضیہ نے خوشگوار انداز سے اس کا استقبال کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں وہ سمجھی اظہر سب کچھ بھول گیا ہے مگر اظہر نے اپنی گمبھیر آواز میں اس سے پھر وہی کہا کہ مجھ سے شادی کروگی۔ اب یہ رضیہ کی برداشت سے باہر تھا اس نے سختی سے کہا اظہر ہوش میں آؤ میں یہ بکواس نہیں سن سکتی۔ تم اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ اور پھر کبھی میرے گھر نہ آنا۔ اظہر اس کے بعد رضیہ کے گھر تو نہیں گیا مگر اس دن سے اظہر کا یہ معمول ہو گیا کہ جب اسلام الدین کام پر چلے جاتے تو وہ رضیہ کی گلی میں کھلنے والی کھڑکی میں سلاخیں پکڑ کر کھڑا ہو جاتا اور رضیہ سے کہتا مجھ سے شادی کروگی۔ وہ اسے بہت سمجھاتی ہر طرح سے اسے سمجھاتی کہ انکی عمروں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ ایک شادی شدہ عورت ہے اور یہ کہ اس نے اظہر کو اپنے بیٹے کی طرح پالا ہے مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس کی ایک ہی ضد تھی کہ مجھ سے شادی کرو ورنہ میں جان دے دوں گا رضیہ سے شادی کرنے کے خیال نے جیسے اظہر کو ایک آسیب کی طرح جکڑ لیا تھا وہ ہر چیز سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ اسکے ماں باپ پریشان تھے کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ سب سے بڑھ کر انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ اب وہ رضیہ کے یہاں بھی نہیں جاتا۔ رضیہ کے لئے تو یہ بات بہت شرمناک تھی اس لئے اس نے کسی کو بھی یہ بات نہیں بتائی تھی۔ کئی دن گذر گئے تھے مگر اظہر کے اس معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا کہ وہ سب کی نظروں سے بچ کر کھڑکی پر کھڑے ہو کر رضیہ سے کہتا مجھ سے شادی کرلو۔ اب اس نے ایک جملے کا، ایک دھمکی کا اور اضافہ کر دیا تھا۔ مجھ سے شادی کرلو ورنہ میں مٹی کا تیل چھڑک کر تمہارے سامنے خود کو جلا کر مار ڈالوں گا۔

باقی: ڈرامہ قصہ کہانی میں۔

جبری مشقت

گلزار جاوید (راولپنڈی)

میاں صاحب کی حویلی کے دستور نرالے اور جینے کے اپنے طریقے ہیں۔ خدا کا دیا بہت کچھ ہونے کے باوجود دولت کی ریل پیل دکھائی نہیں دیتی' سادگی اور قناعت کی چادر نے آکاس بیل کی مانند پوری حویلی کو گرفت میں لیا ہوا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہ گاؤں شہر سے دور پسماندہ علاقہ تصور کیا جاتا تھا۔ پکی سڑک اور بجلی کے ساتھ دینار اور ریال کی آمد نے ہر طرف خوشحالی کی لہر بہر کر دی ہے۔ گاؤں کے باسیوں کے چہروں پر پہلے کی نسبت آسودگی کے آثار نمایاں نظر آنے لگے ہیں۔ بزرگوں کو البتہ گلہ ہے کہ اس خوشحالی نے ان کا سکون چھین لیا ہے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شرکت کا جو احساس پہلے پایا جاتا تھا وہ اب ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ گاؤں کے بڑے بزرگوں کے لئے اب تو ایک ہی جائے پناہ میاں صاحب کی حویلی ہے جہاں اب بھی بزرگوں کی روایات کی پاسداری کے ساتھ محبت و مروّت پائی جاتی ہے۔

میاں صاحب بھی کوئی ساٹھ کے پیٹے میں ہوں گے۔ نظر البتہ پچاس کے آتے اور بیخ چالیس کے ہیں۔ بیگم البتہ تیس سے اوپر کی نہیں ہیں مگر بناؤ سنگھار پر توجہ دینے کے باعث پہلی نظر میں دیکھنے والے کو چالیس کی لگتی ہیں جن سے میاں صاحب نے کوئی دس سال پہلے خاموشی اور سادگی سے نکاح کیا تھا جس کی خبر ملتے ہی میاں صاحب کی پہلی بیوی تینوں بچوں کو لے کر شہر والی کوٹھی میں منتقل ہو گئی ہیں۔

میاں صاحب قسمت کے بڑے دھنی اور طبیعت کے بہت ہی سخی واقع ہوئے ہیں۔ بتاتھ ہی بالائے دولت جائیداد اور مربعوں کے علاوہ ایک عدد جدید فارم کے واحد مالک کے طور پر بے فکری کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جائیداد اور مربعے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کے باعث حصہ میں آئے فارم اور شہری جائیداد غریب غرباء کو قرض دینے کے صلے میں سود در سود کی دین ہیں۔ میاں صاحب مزاجاً غریب پرور اور خدا ترس انسان ہیں۔ فتّے کے والد نے قریب بیس سال پہلے زمین گروی رکھ کر قرضہ حاصل کیا تھا اور ان بیس سالوں میں باقاعدگی سے فصل کی فصل سود ادا کرتا رہا۔ اصل رقم کی ادائیگی کی نوبت سے پہلے ہی پچھلے سال ٹی بی کے باعث اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس کے تینوں بیٹے اپنی چاروں بہنوں کے ہمراہ میاں صاحب کی خدمت میں پیش ہو کر درخواست گزار ہوئے "چونکہ ہم کھیتی باڑی نہیں کرتے اپنی اپنی ملازمتوں پر جاتے ہیں اگر آپ ہماری زمین کا کوئی تصفیہ کر دیں تو ہم سدا آپ اور آپ کے بچوں کو دعائیں دیں گے۔" میاں صاحب نے بلاتردّد فتّے کے بیٹوں کی بات مان لی اور بیس سال پہلے فتّے کے باپ نے جو زمین میاں صاحب کے پاس پندرہ ہزار میں گروی رکھی تھی میاں صاحب نے وہ زمین اسی قیمت میں خرید کر معاملہ بے باق کر دیا۔

دوسری شادی میاں صاحب نے خوشی سے نہیں مجبوری کے سبب کی تھی۔ ایک سبب تو میاں صاحب کی دریا دلی تھی جس کے باعث ہر وقت ان کے ڈیرے پر یار دوستوں کا میلہ لگا رہتا۔ بردبار رکھ رکھاؤ دوستوں کی بات تو الگ مگر لونڈوں لاروں سے گھر بھرا کسی بھی گھریلو عورت کو پسند نہیں ہوتا۔ دوسری شادی کا ایک اور سبب میاں صاحب کی بیگم کا حد سے بڑھا ہوا گنوار پن بھی تھا۔ میاں صاحب بالوں میں خضاب اور منہ میں بتیسی تو دوسری شادی کے وقت لگانے لگے تھے۔ اس سے پہلے بھی انہیں بننے سنورنے کا خاصا شوق تھا۔ اپنے بناؤ سنگھار کے ساتھ دوستوں کی سج دھج کا خیال بھی بہت توجہ سے رکھا کرتے۔

دوسری شادی سے پہلے میاں صاحب کی حویلی میں رونق اور چہل پہل کے باعث زندگی نظر آیا کرتی تھی۔ حویلی کا نچلا حصہ مردان خانہ اور اوپری حصہ زنان خانہ کے طور پر استعمال ہوا کرتا تھا۔ میاں صاحب کئی کئی دن اوپری منزل میں قدم بھی نہ رکھتے۔ دن بھر تھانے کچہری پٹوار خانوں کے چکر سے فراغت کے بعد شام کو گھوڑوں' کتوں' بٹیروں سے شغل کے بعد شطرنج کی بازی جما کرتی جو رات گئے تک جاری رہتی جس کے سبب ان کے دوستوں میں سے کوئی نہ کوئی رات کو حویلی میں ہی قیام کر لیتا۔۔۔ ناچ گانے کے میاں صاحب اتنے رسیا نہیں تھے جتنا انہیں ہونا چاہئے تھا یا جتنا ان کی حیثیت کا تقاضا تھا۔ زندگی بھر' میاں صاحب کسی طوائف کے کوٹھے پر نہیں گئے۔ خاص موقعوں پر البتہ حویلی میں مجرے کا اہتمام ضرور کیا جاتا۔ دونوں بیٹوں کی پیدائش کے موقعہ پر مشتری بائی انبالہ والی نے ساری رات میاں صاحب کی حویلی کو رونق بخشی تھی۔ خاندانی زمین کا مقدمہ جیتنے کی خوشی میں میاں صاحب نے اس سے بھی بڑا جشن منایا تھا اور لاہور سے خاص طور پر تین نوخیز طوائفیں منگوائی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک' میاں صاحب کے دل کو اس قدر بھائی کہ لگاتار تین سال کسی نہ کسی بہانے اسے بلا کر مجرا کرایا جاتا اور چوتھے سال میاں صاحب کی حویلی کو باقاعدہ آباد کرنے والی یہی نوخیز طوائف تھی۔

اصولوں کے میاں صاحب بڑے پکے ہیں۔ نکاح کرنے بھی بائی کے کوٹھے پر نہ گئے بولے "ہم خاندانی لوگ ہیں ہمارے بزرگوں نے

زندگی بھر کسی طوائف کے کوٹھے پر قدم نہیں رکھا تھا کیونکہ اس روایت کو توڑ سکتے ہیں۔ شہر کے ایک متمول دوست کے گھر نکاح کرنے کے بعد میاں صاحب گاؤں آنے کی بجائے کراچی چلے گئے اور ان کی واپسی پر گاؤں میں یہ مشہور ہوا کہ میاں صاحب کراچی کے بہت بڑے گھر کی بیٹی بیاہ کر لائے ہیں۔

نو عمر، نوخیز اور خوبصورت بیوی کے آنے کے بعد حویلی آباد ہونے کے بجائے سونی اور ویران نظر آنے لگی۔ میاں صاحب کے دوستوں اور لنگوٹیوں کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ میاں صاحب کا بستر نچلے حصہ سے اوپر پہنچا دیا گیا۔ دوسری شادی میاں صاحب نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کی تھی مگر انہیں اپنے بزرگوں کی عزت کا بڑا پاس تھا۔ وہ ہر قیمت پر یہ راز چھپائے رکھنا چاہتے تھے کہ ان کی بیگم ان کے نکاح میں آنے سے پیشتر، ذات کی طوائف اور سر عام مجرا کرنے والی بازاری عورت تھی جس کے ٹھمکوں پر ہر کس و ناکس کو آہیں بھرنے اور جملے چست کرنے کا اتنا ہی اختیار تھا جتنا میاں صاحب کو۔۔۔۔ چھوٹی بیگم کی آمد کے ساتھ حویلی کے طور طریقے قطعی طور پر بدل گئے۔ اب میاں صاحب دن ڈھلے اوپر آ جاتے بلکہ دن میں کئی بار بہانے بہانے سے اوپر کے چکر لگایا کرتے جس کے سبب ان کا سانس اکھڑنے لگتا اور وہ چارپائی پر بیٹھ کر سانس درست کرنے کے ساتھ ساتھ ندیدی آنکھوں سے پشت کی جانب بیگم کے سراپے کو تکنے لگتے۔ اب میاں صاحب کی دلچسپی کا حویلی کے نچلے حصہ میں کوئی سامان نہ تھا۔ معمول کی مصروفیات منشی، پٹواری، گرداور اور تھانے دار، قرض دار وغیرہ کے علاوہ گھوڑوں، کتوں، کبوتروں اور بٹیروں میں پہلی کی سی دلچسپی نہ رہی تھی۔ دوسری شادی سے پہلے زنان خانے میں خادماؤں کے طور پر کئی عورتیں کام کیا کرتی تھیں جو سب کی سب بڑی بیگم کے دکھ سکھ کی شریک تھیں۔ بڑی بیگم بھی ہر طرح سے ان کی ضرورتوں کا خیال رکھا کرتیں۔ اب راز افشا ہونے کے ڈر سے فقط ایک نو عمر لڑکا گھریلو ملازم کے طور پر کام کرتا جو زیادہ عرصہ ٹک نہ پاتا۔ شادی کے دس سالوں میں کم و بیش میاں صاحب کو اتنے ہی ملازم دور دراز علاقوں سے منگانا پڑے تھے۔ میاں صاحب کے پاس گھریلو ملازم نہ ٹکنے کا سبب کام کی زیادتی تھی۔ صبح منہ اندھیرے حقہ بھرنے سے لے کر رات گئے میاں صاحب کا بستر لگانے اور مالش کرنے تک ملازم کے جسم کے ساتھ روح بھی تھک جاتی اور وہ تنگ آ کر خاموشی سے بھاگ جاتا۔

کچھ عرصہ سے فتح محمد ٹک گیا تھا جو پہلے ملازموں کی نسبت پر اعتماد، بردبار اور ارادے کا مضبوط نظر آتا تھا۔ نیا نیا فتح محمد جب میاں صاحب کی حویلی آیا تو مشکل سے پندرہ سال کا ذرا سہما ایک نو عمر بچہ تھا۔ دو سال کے عرصہ میں قد کے ساتھ داڑھی مونچھ بھی نکل آئی تھی۔ سینہ چوڑا اور گردن موٹی ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں چمک اور لہجے میں ٹھہراؤ آ چکا تھا۔ پہلے کی نسبت کام میں چستی پھرتی دکھانے لگا تھا۔ صبح منہ اندھیرے اٹھتے ہی بیگم صاحبہ کے نہانے کا پانی چولہے پر رکھنے سے اس کے معمولات کا آغاز ہوتا۔ جب سے بیگم صاحبہ نے نماز پڑھنا شروع کی تھی تب سے ہر صبح نہانا ان کا معمول بن چکا تھا۔ ادھر فتح محمد نے چولہے پر بیگم صاحبہ کے نہانے کا پانی رکھا ادھر میاں صاحب نے حقہ کی صدا لگائی۔ اُپلے جتنی دیر میں انگیاری بنتے اتنی دیر میں فتح محمد حقہ کو نہلا دھلا کر تازہ دم کر دیتا۔ گڑ والے تمباکو کے ساتھ گڑ کی چھوٹی سی ڈلی رکھتے ہوئے کبھی کبھی گڑ کی جگہ تمباکو اپنے منہ میں ڈال بیٹھتا اور راکھ تھوکتا ہوا میاں صاحب کے کمرے کی جانب حقہ لے کر دوڑا جاتا۔ جس دن گڑ کی ڈلی منہ میں ڈال لیتا اس دن حقہ بھرنے کے بعد ایک دو لمبے لمبے کش ضرور لیتا۔ میاں صاحب کے پلنگ کے نزدیک حقہ رکھ کر بیگم صاحبہ کے نہانے کا پانی دیکھتا جو ابل رہا ہوتا۔ پانی غسل خانہ میں رکھنے کے بعد چائے کی دیگچی چولہے پر چڑھا دیتا۔ اتنے میں بیگم صاحبہ صابن تولیہ کی آواز لگاتیں جو وہ پہلے سے غسل خانے میں رکھنا بھول جاتا۔ میاں صاحب کو چائے کا پیالہ دینے کے بعد خود بھی چائے کے چند گرم گرم گھونٹ حلق میں انڈیل کر تھکن اتارنے کی سوچ رہا ہوتا کہ باورچی خانے میں بیگم صاحبہ آ دھمکتیں۔ اپنا چائے کا پیالہ لینے کے بعد اتنی چھوٹی عمر میں چائے پینے کے سبب اس پر برس پڑتیں اور دودھ پینے کی تاکید کرتیں۔ اتنے میں نیچے سے گوالے کی آواز آ جاتی جو دونوں بھینسوں کا دودھ لئے فتح محمد کے انتظار میں نیچے کھڑا ہوتا۔ دودھ کی بالٹیاں اوپر لا کر میاں صاحب کی ہدایت کے تحت انہیں کپڑ چھن کر کے اوٹانے کے لئے چولہے پر چڑھا دیتا اور میاں صاحب کے نہانے کا پانی لے کر غسل خانے کی طرف دوڑ لگاتا۔ میاں صاحب نہانے سے پہلے سر میں تیل ڈالنے کا کہتے اور دو چار ہاتھ مالش کے لگوانے کے ساتھ مسواک کئے جاتے اور خوشی محمد نائی کو گالیاں بھی دیے جاتے جو مقررہ وقت پر کبھی نہ پہنچتا۔ فتح محمد میاں صاحب کے غصہ کے پیش نظر خوشی محمد کو بلانے کے لئے نیچے کی طرف دوڑتا تو نیچے سے خوشی محمد کے کھانسنے کی آواز آ رہی ہوتی جو اس سے پہلے اس کے آنے کا الارم دے دیا کرتی۔

شیو بنوانے کے دوران میاں صاحب خوشی محمد کے دیر سے آنے کے ساتھ ساتھ استرا کند ہونے کے سبب خوب خبر لیا کرتے اور خوشی محمد گھگھیاتے ہوئے کانپتے ہاتھوں میاں صاحب کی شیو بناتا۔ بیگم صاحبہ فتح محمد کو سوئیاں لانے کے لئے کہتیں اور جب فتح محمد سوئیاں لانے کے لئے نیچے کی طرف دوڑنے لگتا تو اسے آواز دے کر کپڑے دھونے کا صابن

اور تیل لانے کا یاد دلاتیں۔ یہ چیزیں لے کر شیخ محمد واپس آتا تو بیگم صاحبہ پراٹھے پکانے کے بعد پنکھے کے سامنے بیٹھی پسینہ سکھا رہی ہوتیں اور شیخ محمد سے بسکٹ کا ڈبہ نہ لانے کا گلہ کرتیں۔ جب شیخ محمد بسکٹ کا ڈبہ لینے کے لئے چل پڑتا تو اسے آواز دے کر بسکٹ کے ڈبے کی جگہ مرغی کے تاپے سے انڈا لانے کا کہتیں۔ شیخ محمد دوڑتا ہوا مرغیوں کے تاپے سے انڈا لے کر آتا تو بیگم صاحبہ سے ڈانٹ کھا کر پھر اپنے لئے ایک اور انڈا لینے کے لئے دوڑتا۔ راستے میں میاں صاحب کو اخبار یاد آ جاتا۔ شیخ محمد نیچے سے واپس آ کر اخبار کے نہ آنے کی اطلاع دے کر میاں صاحب کے لئے ٹھنڈائی پیسنے لگتا۔ چار مغز، بادام، خشخاش، کالی مرچ کو مصالحے کی طرح سل پر رگڑنے کے بعد دیسی گھی کا بگھار لگاتا اور کٹورے میں ڈال کر میاں صاحب کو دینے کے لئے جانے لگتا کہ بیگم صاحبہ باورچی خانے میں آ جاتیں اور میاں صاحب کے معدے کی خرابی کے سبب اس میں سے آدھی ٹھنڈائی دوسرے کٹورے میں نکال کر شیخ محمد کو کھانے کے لئے دے دیتیں۔

بیگم صاحبہ کو ناشتہ دینے کے بعد شیخ محمد کو چند منٹ آرام نصیب ہوتا جس دوران وہ دودھ، مکھن، ٹھنڈائی، انڈہ اور پراٹھے سے جی بھر کے ناشتہ کرتا۔ میاں صاحب پھر حقہ ٹھنڈا ہونے کی صدا لگاتے۔ شیخ محمد اس بار حقہ سے چلم اتار لاتا اور پہلے سے بنی انگیاری تازہ تمباکو پر رکھ کر پھر اخبار والے کے لئے چکر لگاتا اور اخبار کی جگہ منشی کے آنے کی اطلاع دیتا۔ منشی کو دیکھتے ہی میاں صاحب نیچے چل پڑتے اور سیڑھیوں سے حقہ نیچے لانے کی صدا لگاتے۔ جب وہ حقہ نیچے لے کر جاتا تو دو ایک کش کے بعد میاں صاحب پھر سے حقہ ٹھنڈا ہونے کا گلہ کرتے ساتھ ہی منشی سے ناشتہ کی بابت پوچھتے۔ منشی ٹھنگیانے لگتا۔ میاں صاحب شیخ محمد کو منشی کے لئے ناشتہ اور اپنے لئے چائے لانے کا کہتے۔ منشی کو ناشتہ اور میاں صاحب کو چائے دینے کے بعد شیخ محمد اوپر آتا تو بیگم صاحبہ سو چکی ہوتیں۔ ناشتہ کے بعد انہیں باقاعدہ سونے کی عادت تھی۔ شیخ محمد جلدی جلدی ناشتہ کے برتن دھو کر فارغ ہوتا اور میلے کپڑے نکال کر بھگونے لگتا۔ نیچے سے "شیخ محمد، او شیخ محمد" کی آوازیں آنے لگتیں۔ گیلے کپڑے چھوڑ کر شیخ محمد نیچے بھاگتا۔ میاں صاحب دستی پگڑی اور شیروانی درست کرنے کا حکم دیتے اور شیخ محمد کے پیچھے پیچھے خود بھی چلے آتے اور شور مچانا شروع کر دیتے۔

میاں صاحب کے جانے کے بعد شیخ محمد کپڑے دھونے میں مصروف ہو جاتا۔ ابھی وہ کپڑے الگنی پر پھیلا رہا ہوتا کہ بیگم صاحبہ سو کر اٹھ جاتیں اور چائے پینے کی فرمائش کرتیں۔ بیگم صاحبہ کے حکم کے مطابق صرف اس وقت شیخ محمد کو ان کے ساتھ چائے پینے کی اجازت تھی۔ چائے کے بعد بیگم صاحبہ شیخ محمد کو پیسے دے کر گوشت سبزی لانے کا کہتیں۔ سودا لا کر شیخ محمد دوپہر کے لئے سالن تیار کرتا اور گھر کی صفائی بھی ساتھ ساتھ کئے جاتا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میاں صاحب قیلولہ کرتے۔ شیخ محمد نچلے حصہ کی صفائی کرنے چلا جاتا۔ سہ پہر کے بعد میاں صاحب کے ملنے جلنے والوں کی آمد شروع ہو جاتی۔ شیخ محمد میاں صاحب کو آواز دے کر لوگوں کے آنے کی اطلاع دیتا۔ میاں صاحب انہیں بٹھانے کا کہہ کر ڈاک لانے کی تاکید کرتے۔ شیخ محمد میاں صاحب کو ڈاک پیش کر کے حقہ تازہ کرنے لگتا اور چائے بنا کر حویلی کے دونوں حصوں میں بٹتا رہتا۔ اس بیچ اوپر نیچے کی آرجار کے ساتھ شام کے کھانے کی تیاری میں مصروف رہتا۔ گاؤں کی ضرورت مند عورتیں اگر بیگم صاحبہ سے ملنے آ جاتیں تو ان کے چائے پانی کا بندوبست کرتا کہ میاں صاحب نیچے سے آوازیں دینے لگتے۔ نیچے جاتا تو اوپر بیگم صاحبہ خفا ہو جاتیں اور بیگم صاحبہ کو راضی کرتا تو میاں صاحب دھاڑنے لگتے۔

رات کے کھانے کے بعد میاں صاحب چہل قدمی کو ضرور جاتے اور بیگم صاحبہ ٹی وی لگا کر بیٹھ جاتیں۔ ٹی وی پر پروگرام ان کی مرضی کا نہ ہوتا تو ناول پڑھنے میں مصروف ہو جاتیں۔ شیخ محمد جلدی جلدی رات کے کھانے کے برتن دھو کر میاں صاحب کا بستر لگاتا اور حقہ تازہ کر کے ان کے بستر کے ساتھ رکھ دیتا۔

واپسی پر میاں صاحب اخبار بینی کے بعد دیر تک مختلف کاغذات کا مطالعہ کرتے۔ بیگم صاحبہ میاں صاحب کے کمرے میں آتیں روزمرہ کے معاملات پر گفتگو کرتیں اور اپنے کمرے میں جا کر بستر ٹھیک کرنے لگتیں۔ شیخ محمد کو بیگم صاحبہ کا بستر لگانے یا اٹھانے کی اجازت نہ تھی۔ یہ کام شروع دن سے وہ خود کیا کرتیں۔ شیخ محمد سارا سامان سنگوا کر نیچے جانے کی سوچ رہا ہوتا کہ اکثر میاں صاحب چلم ٹھنڈی ہونے کے سبب شیخ محمد کو آواز دیتے۔ شیخ محمد میاں صاحب کی عادت کو جانتے ہوئے تازہ اپلوں کی انگیاری تیار رکھتا۔ آخری بار چلم لے کر جب شیخ محمد میاں صاحب کے کمرے میں جاتا تو میاں صاحب اس سے ہاتھ پیر دبانے کی فرمائش کرتے۔ میاں صاحب کے ہاتھ پیر دباتے دباتے جب اس کی روح ترخی ہو جاتی تو میاں صاحب اسے چلے جانے کا حکم دیتے۔

شیخ محمد میاں صاحب کے کمرے سے باہر نکل رہا ہوتا تو مارے تھکن کے اس کا انگ انگ چیخ رہا ہوتا۔ سر چکرا رہا ہوتا اور کمر چس چس کر رہی ہوتی۔ اسے اپنے آپ سے کراہت آ رہی ہوتی۔۔۔۔ وہ خود پر اور اس نوکری پر لعنت بھیج رہا ہوتا۔ اتنے میں گھپ اندھیرے کے اندر ایک سایہ نمودار ہوتا جس کے ساتھ شیخ محمد غائب ہو جاتا.......... دوسری صبح مسرور و مطمئن شیخ محمد پھر سے اپنے معمولات میں مگن نظر آتا۔

تجدیدِ ہنر

صدیق شاہد ([illegible])

تزویر کے ہاتھوں جو میں زنجیر ہوا ہوں — قرطاسِ پذیرائی پہ تحریر ہوا ہوں
رہ روکتی ہیں خونِ صداقت کی پکاریں — میں راہ رو جادۂ شمشیر ہوا ہوں!
وہ حسن کہ تکمیلِ تناسب کا تھا مظہر — دیکھا ہے تو اب صورتِ تصویر ہوا ہوں
کھلتے نہیں اوراق بیاضِ غمِ دل کے — کن لوگوں میں میں مائلِ تقریر ہوا ہوں
وہ بھول کے بھی آیا نہیں میرے گماں میں — جس جرم پہ میں لائقِ تعزیر ہوا ہوں
میں ایک دیا تھا کہ جو ڈرتا تھا ہوا سے — ہمت تھی کہ اب مرکزِ تنویر ہوا ہوں
تجدیدِ ہنر ہو جو قلم کاری ہو شاہدؔ — مر مر کے میں اسی خواب کی تعبیر ہوا ہوں

مراق مرزا (ممبئی بھارت)

جگنو کی ہر برات میں سورج تلاش کر — گر ہو سکے تو رات میں سورج تلاش کر
اڑنے کا شوق ہے تو نظر آسماں پہ رکھ — تو اپنی خواہشات میں سورج تلاش کر
اِس کے بنا چمک نہیں سکتا کوئی فلک — تاروں کی کائنات میں سورج تلاش کر
یہ روشنی کے پھولوں سے خالی نہیں جہاں — دنیائے بے ثبات میں سورج تلاش کر
گنجِ رواں تھی وقتِ گزشتہ کی ہر زمیں — اسلاف کی حیات میں سورج تلاش کر
پیغامِ روشنی کا ہی لایا تھا وہ مراقؔ — عیسیٰ کے معجزات میں سورج تلاش کر

عرش صہبائی (جموں کشمیر)

وہم کا جو شکار ہوتا ہے — کشتۂ انتشار ہوتا ہے
جو ظرافت شعار ہوتا ہے — غم کی اک جوئبار ہوتا ہے
مسکرا کر میں کاٹ لیتا ہوں — ورنہ ہر لمحہ بار ہوتا ہے
زندگی حادثوں کی ہے تقریب — وقت نامہ نگار ہوتا ہے
اپنے ماحول کا ہر اک فنکار — عمر بھر قرض دار ہوتا ہے
آج جس کا کوئی وقار نہیں — وہ بشر ذی وقار ہوتا ہے
لوگ کہتے ہیں زندگی جس کو — درد کا ریگ زار ہوتا ہے
ہر کلی پر خزاں کی زردی سی — یہ بھی رنگِ بہار ہوتا ہے
عرشؔ خود اپنے آپ سے ملنا — زندگی کا وقار ہوتا ہے

○

سہیل غازی پوری (کراچی)

پختہ دیوار و در کی خواہش ہے　　بے سہاروں کو گھر کی خواہش ہے
کوئی جگنو کو ہانک دے آ کر　　واسی چشمِ تر کی خواہش ہے
کوششیں بھی تو کچھ کریں دل سے　　ہاں جنھیں خوب تر کی خواہش ہے
ہیں بضد لوگ آئینہ نہ بنے　　اور بھی شیشہ گر کی خواہش ہے
تھک گیا بیٹھے بیٹھے سناٹا　　اب اسے شور و شر کی خواہش ہے
جس پہ چل کر ہمیں ملے منزل　　بس اسی رہگزر کی خواہش ہے
صاف وشفاف اک غزل ہو جائے　　جذبۂ معتبر کی خواہش ہے
جب پرندے نہیں کسی قابل　　کس لئے بال و پر کی خواہش ہے
مشکلوں میں رہے تو ساتھ سہیلؔ　　ایسے ہی ہم سفر کی خواہش ہے

بہرام طارق (اسلام آباد)

جب ستم کی دھوپ میں کالے شجر ہو جائیں گے　　ٹوٹ کر شاخوں سے پتے دربدر ہو جائیں گے
جو چلے ہیں سوئے منزل درد کی برسات میں　　دیکھنا راہِ وفا میں وہ امر ہو جائیں گے
ہجر کا موسم بھی آخر کچھ دنوں کی بات ہے　　رُت جو بدلے گی تو شاخوں پر ثمر ہو جائیں گے
یہ جو دو آنکھوں کے صحرا شام ہی سے خشک ہیں　　صبح دم تک دیکھنا اشکوں سے تر ہو جائیں گے
درد کے ساگر پہ جب مچلیں گی کرنیں چاند کی　　کشتیِ جاں کے تعاقب میں بھنور ہو جائیں گے
کیا خبر تھی پھول سے جذبے بھی طارقؔ ایک دن　　یوں دیارِ سنگ میں شیشے کے گھر ہو جائیں گے

افق دہلوی (دہلی)

چاند سب چاند نہیں رہتے ہیں　　ایک دن چاند سبھی گہنے ہیں
مجھ سے پوچھو مرا محبوب ہے کون　　میرے محبوب کے کیا کہنے ہیں
نہیں شاید مری تقدیر میں سکھ　　عمر بھر دکھ ہی مجھے سہنے ہیں
دل مرا درد سے بھر آیا ہے　　اشک خونیں تو ابھی بہنے ہیں
گلشنِ دل سے رہے دور خزاں　　زخم تا دیر ہرے رہنے ہیں
مہر زخموں پہ نہ مرے گا کوئی　　مہر زخموں کے جو بھی لینے ہیں
ہوئے حالات تو زمانہ ابتر　　جیتے جی لوگ کفن پہنے ہیں
گلستاں دستِ خزاں کا ہے شکار　　ٹہنیاں ہیں نہ کہیں گہنے ہیں
آسماں پر جو گھرے ہیں بادل　　نئے ملبوس افقؔ پہنے ہیں

○

ضمیر نوری (کراچی)

نہ یہ زمیں نہ کسی آسماں کا لگتا ہے — دھواں تو سارا مجھے آشیاں کا لگتا ہے
بدن میں درد کی خوشبو بسی ہوئی ہے جو — اسی سے رشتہ مرے جسم و جاں کا لگتا ہے
مرے وجود کی نس نس میں دھوپ ہے پیوست — یہ کارنامہ بھی وہم و گماں کا لگتا ہے
پہنچ گئے ہیں تجھے ڈھونڈتے وہاں پر ہم — جو راستہ کسی ابرِ رواں کا لگتا ہے
یہ غنچے بن کھلے مرجھا رہے ہیں شاخوں پر — بھری بہار میں موسم خزاں کا لگتا ہے
حصارِ ذات سے باہر نہ آسکا انساں — عجیب کھیل یہ سود و زیاں کا لگتا ہے
لٹا ہے جو سرِ منزل پہنچ کے اے لوگو — ضمیرؔ بھی تو اسی کارواں کا لگتا ہے

○

سیفیؔ سرونجی (سرونج بھارت)

دل کو کیسا زخم دیا ہے دل میں رہنے والوں نے — دشمن بن کر لوٹ لیا ہے اپنے گھر کے بالوں نے
کون بھلا فریاد کو سنتا کس کو اتنی فرصت تھی — دیواروں پر نام لکھا ہے لیکن مرنے والوں نے
گلشن گلشن چیخ اٹھا ہے جب جب بھی تم آئے ہو — پھول برستے اکثر دیکھے لاکھوں آنکھوں والوں نے
تیری خاطر پھرتا ہوں میں جنگل جنگل صدیوں سے — ہر دم تیرا نام لیا ہے ان پاؤں کے چھالوں نے
خون کے آنسو رویا سیفیؔ جب جب تیری یاد آئی — جینا ہی مشکل کر ڈالا ظالم دنیا والوں نے

○

کرامت بخاری (لاہور)

زندگی ہے حسن کے دربار میں — میں ہوں گویا مصر کے بازار میں
پھر مرا دل کھینچ لایا ہے مجھے — پا پیادہ کوچۂ دلدار میں
ایک روزن ہے ابھی امید کا — عمر کی گرتی ہوئی دیوار میں
دل سے جب آواز اٹھتی ہے کوئی — گونجتی ہے گنبدِ دوّار میں
مصلحت کوشی میں ہے مصروف عقل — عشق کامل جراتِ اظہار میں
چلتے چلتے آخرش گم ہو گیا — ایک سایہ سایۂ دیوار میں
آج تک اس کو بھلا پایا نہیں — جو کشش تھی آپ کے انکار میں

○

اطہرؔ عزیز (ممبئی بھارت)

بات تو کچھ بھی نہیں تھی جانے آخر کیا ہوا　　ایک شخص آیا نظر خود آپ سے لڑتا ہوا
اس طرح وہ پوچھتے ہیں مجھ سے لوگوں کا پتہ　　جیسے ہو یہ شہر پہلے سے مرا دیکھا ہوا
کنکروں کی سیج پر رقصاں ہیں کچھ سہمے نقوش　　جانے اس پتھر پہ کس کا نام تھا لکھا ہوا
گنگناتے تارے تو یاد آ گئی تیری ہنسی　　چاند پر اکثر ترے رخسار کا دھوکا ہوا
ذہن کی خندق سے آئے تھے بدن کی چھاؤں میں　　کیا خبر تھی جسم بھی پائیں گے ہم تپتا ہوا
کیوں نہ اطہرؔ فکر میں آئے نیا اک بانکپن　　آج کل ہے ذوق کا معیار جب بدلا ہوا

سجاد مرزا (گوجرانوالہ)

کس کی آواز نے لوگوں کو جگائے رکھا؟　　شب کی تنہائی میں اک شور مچائے رکھا!
بے رخی اس کی نہ بھولے ہیں نہ بھولیں گے کبھی　　یاد کا دیپ ہے سینے میں جلائے رکھا!
ایک بھی شخص سکوں یاب نہ ہونے پایا　　اس نے انصاف کا پرچم بھی اٹھائے رکھا
اپنی پہچان کا یہ مرحلہ بھی طے نہ ہوا　　ایک اک آس کو سینے میں دبائے رکھا
بھولے بسرے وہ مناظر ہیں نگاہوں میں ابھی　　جن کو اس عہد نے لوگوں سے چھپائے رکھا
اس کی باتیں ہی فسوں خیز کشش رکھتی تھیں　　جس نے دنیا کو تھا دیوانہ بنائے رکھا!
وہ لہو بن کے دھڑکتا ہے رگوں میں سجادؔ!　　میں نے اک پل نہ اسے دل سے بھلائے رکھا

ڈاکٹر عطا الحق فاروقی انجم امروہوی (لاہور)

موسم ہے خوش گوار، ذرا دیکھتے چلو　　چلنے لگی ہے بادِ صبا دیکھتے چلو
آئے ہو جب یہاں تو، عطا دیکھتے چلو　　کچھ شاعروں کی طرزِ ادا دیکھتے چلو
دلّی کو جا رہے تھے، کہ امروہہ آ گئے　　اس شہر کی بھی آب و ہوا دیکھتے چلو
انجم تم آ گئے ہو، ادیبوں کی شہر میں　　اپنی نظر سے شانِ خدا کی دیکھتے چلو
کس حال میں ہیں کیسے، گذرتی ہے زندگی　　جو اہلِ دل ہیں اُن کو، ذرا دیکھتے چلو
تم ہم سے کہہ رہے تھے، کہیں پر وفا نہیں　　آؤ ہمارے ساتھ، وفا دیکھتے چلو
وہ خود بھی جانتے ہیں، ہمیں اُن سے پیار ہے　　رہنے لگے ہیں ہم سے، خفا دیکھتے چلو
ہم کب سے کہہ رہے تھے، محبت تو جرم ہے　　اب سب ہی پا رہے ہیں، سزا دیکھتے چلو
دیکھے ہوئے تو ان کو، زمانہ گذر گیا　　اُن کا ہے گھر قریب، ذرا دیکھتے چلو
ممکن ہے تم کو خط کا، کبھی آئے بھی خیال　　لازم ہے ان کے گھر کا، پتا دیکھتے چلو
اُس نے کہا تھا ہم سے، وفا اب کریں گے ہم　　اُس بے وفا کی شرطِ وفا دیکھتے چلو
شکرِ خدا کہ ہم تو، تہجد گزار ہیں　　تم عاصیوں کی آہ و بکا دیکھتے چلو
انجم وہ دیکھتے ہیں، بڑے پیار سے ہمیں　　تم بھی تو اک بار، عطا دیکھتے چلو

صابر عظیم آبادی (کراچی)

لوگ بپھرے ہوئے ہیں کیوں شیشے	بھاؤ تو کم ہوئے ہیں پتھر کے
ہم مسافر ہیں اپنی محفل سے	مت اٹھاؤ ہمیں خدا کے لیے
اپنا معیار ڈھونڈتے ہیں لوگ	بیٹیوں کے کہاں لگے رشتے
ربط کی کھیر کیا پکائیں ہم	کب سے جوٹھے ہیں عشق کے ٹھٹھے
پوچھنے کوئی بھی نہیں آیا	اے خدا ہم ہیں منتظر تیرے
جاتی آنکھ سے حیا ٹپکی	ہم جہانِ طلب سے جب گزرے
آدمی بغض کتنا رکھتا ہے	کھل نہ پائے دلوں کے دروازے
بات کرتے ہیں اب زیادہ ہی	میری گلیوں کے کم سخن لڑکے
آدمی سانس لے کہاں صابر	جب مصائب کے ہوں گھنے سائے

○

حنیف ساجد (کمروان سرگودھا)

کون جانے کب چھٹے ماحول سے وہ تیرگی	خونِ دل سے جس کی خاطر کر رہا ہوں روشنی
کوئی تو ہوگا جہاں میں عدل ہو جس کا شعار	یہ نہیں کہ حرمتِ میزان کو بیچیں سبھی
زندگانی میں سبھی آسائشوں کے باوجود	شہرِ جہاں میں ہر نفس بے نام سی اک تشنگی
گر کہیں ہر امر کو امرِ خداوندی تو پھر	حق و باطل سب برابر خیر و شر یکساں سبھی
اصل میں تخفیف تیرہ شیوۂ اہلِ نظر	یہ نہیں کہ کون کیسے کر رہا ہے روشنی
رہ نہیں سکتا نظر میں پردۂ ظلمت حنیف	جلوہ گر ہو قصرِ دل میں گر چراغِ آگہی

○

شگفتہ نازلی (لاہور)

شجر شجر کا ترانہ طیور گائیں گے	اور اُن کے عکس بہتے پانیوں پہ پائیں گے
برہنہ شاخوں سے کوئی بھی نا اُمید نہ ہو	ہمیشہ کی طرح پھر برگ و بار آئیں گے
جنہوں نے ناتے فاصلے سے رابطہ کیا	مزاج پُرسی کو بھی وہ ضرور جائیں گے
جو آسماں پہ چمکتے ہیں، چاند تارے ہیں	بڑے خلوص سے دھرتی کو جگمگائیں گے
مٹے گی ساری ہی تاریکی بدگمانی کی	ہر ایک حرف میں ایسا اجالا پائیں گے
کچھ ایسے سانحے جن کا دیر سوچتے ہی رہے	غزل کے بعد بھلا اور کیا سنائیں گے

○

تخلیقِ عصر

تازہ تصانیف کا تعارف

عطیہ سکندر علی (سکھر)

دنیا مرے آگے

مدا افاضلی جدید اردو شاعری میں منفرد لہجے اور نئی زبان و بیان کے باعث بہت نمایاں اور معتبر مقام کے حامل ایسے شاعر ہیں جو نثر میں بھی ایک طرح سے شاعری کیا کرتے ہیں۔ برجستگی، برمحل اور برجستہ جملے اور اختصار بہت ان کی تحریر کے نمایاں اوصاف ہیں۔ مقصود سر دست جناب مدا افاضلی کی تازہ تصنیف ’’دنیا مرے آگے‘‘ سے آپ کو متعارف کرانا ہے اور مدا افاضلی صاحب کے ندرت بیان کے توسط سے یہ فریضہ انجام دینا ہے۔

’’بمبئی میں پیڈر روڈ میں صوفیہ کالج کے پاس ایک بلڈنگ ہے نام ہے پکپاولا۔ اس کے تیسرے فلور پر کئی کمروں کا ایک فلیٹ ہے اس فلیٹ میں ایک کمرا پچھلے کئی سال سے بند ہے۔ ہر روز صبح صرف صفائی اور ایک بڑی سی مسکراتے ہوئے نوجوان کی تصویر کے آگے اگربتی جلانے کے لیے تھوڑی دیر کو کھلتا ہے اور پھر بند ہو جاتا ہے۔ یہ کمرا آج سے کئی برس پہلے کی ایک رات کو جیسا تھا آج بھی ویسا ہی ہے۔ ڈبل بیڈ پر آڑے ترچھے تکیے، سمٹی سکڑی چادر، ڈریسنگ میز پر رکھا چشمہ، کھونٹی پر ٹنگے کوٹ، فرش پر پڑے جوتے، میز پر بکھری ریز گاری، انتظار کرتا نائٹ سوٹ، وقت کو ناپتے ناپتے نہ جانے کب کی بند گھڑی۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی جلدی لوٹنے کے لیے ابھی ابھی کمرے سے باہر گیا ہے، جانے والا اُس رات کے بعد اپنے کمرے کا راستہ بھول گیا ہے لیکن اُس کا کمرا اس کی تصویر اور بکھری ہوئی چیزوں کے ساتھ آج بھی اُس کے انتظار میں ہیں۔ اس کمرے میں رہنے والے کا نام وویک سنگھ تھا، اور موت کو زندہ رکھنے والے کا نام جگجیت سنگھ (مشہور غزل سنگر) ہے، جو وویک کے پتا ہیں۔ یہ کمرا انسان اور بھگوان کے درمیان متواتر لڑائی کی علامت ہے۔ بھگوان بنا کر مٹا رہا ہے اور انسان مٹے ہوئے کو مسکراتی تصویر میں، اگربتی جلا کر مسلسل سانسیں جگا رہا ہے۔ موت اور زندگی کی اس لڑائی کا نام تاریخ ہے۔ تاریخ دو طرح کی ہوتی ہے ایک وہ جو راجاؤں اور بادشاہوں کے ہار جیت کے قصے دہراتی ہے دوسری وہ جو اس آدمی کے دُکھ درد کا ساتھ نبھاتی ہے، جو ہر دور میں سیاست کا ایندھن بنایا جاتا ہے اور جان بوجھ کر بھلایا جاتا ہے۔

تاریخ میں محل بھی ہیں، حاکم بھی تخت بھی
گم نام جو ہوئے ہیں وہ لشکر تلاش کر

میں نے ایسے ہی ’گمنام‘ ناموں، کو نام اور چہرے دینے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اپنے ماضی کو حال میں جیا ہے اور پکپاولا کی تیسری منزل کے کمرے کی طرح عقیدت کی اگربتیاں جلا کر ’’تماشا مرے آگے‘‘ کو روشن کیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے وہاں ایک تصویر تھی اور میرے ساتھ بہت سے زندہ و تاباں چہرے اور ان کی یادوں کا غم شامل ہے۔‘‘

’’دنیا مرے آگے‘‘ ایک سو ساٹھ نفیس اور عمدہ صفحات، مجلد پر مشتمل ہے جس کی قیمت ایک سو پچاس روپے ہندوستانی اور دستیابی کا پتہ: معیار پبلی کیشنز، کے۔302، تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی، بھارت ہے۔

مابعد جدیدیت۔ اطلاقی جہات

’’زیرِ نظر کتاب میں ایسے مقالات کا انتخاب پیش کیا گیا ہے جن میں مقالہ نگاروں نے متن کو کھولنے کے لیے مابعد جدیدیت کی فکری رو کو بروئے کار لانے کی سعی کی ہے۔ مابعد جدیدیت ایک خود رو فکری نشاۃ الثانیہ ہے جس نے اپنے عصر کی ’’روح‘‘ کو پیش کیا ہے۔ مابعد جدیدیت حتمیت نہیں کرتی، حد بندیوں اور نظری سرحدوں کو مسترد کرنے کے ساتھ ساتھ ’قابلِ تغیر‘ جو ہر‘ کے بجائے تغیر پذیر صورت حال کا اقرار کرتی ہے۔ جدیدیت کی زماں کے تسلسل کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس کی جگہ وہ عدم تسلسل یعنی DISCONTINUITY کا پرچار کرتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ ہر شے کی تعمیر میں خرابی کی صورت دکھاتی اور معنی کے مسلسل التوا کو نشان زد کرتی ہے۔ اردو ناقدین نے جب اپنے مقالات میں مابعد جدیدیت کے مہیا کردہ اس منظر نامے کے حوالے سے متن کی تہہ میں جھانکنے کی کوشش کی ہے تو گویا مابعد جدیدیت کے تعقلات سے مدد لی ہے۔ ناصر عباس نیر قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے ان مقالات کو مرتب کر کے ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جس کی ضرورت جامعات میں ایک عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی‘‘۔۔۔۔ ڈاکٹر وزیر آغا

’’مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ تمام مطالعات نئی طرز کے ہیں۔ یہ اردو کے ادبی متون کی تعبیر و تجزیے (نتیجتاً تحسین) کا عمل بالکل نئی سطحوں پر کرتے ہیں۔ پس ساختیاتی مطالعات ہوں، مابعد نو آبادیاتی یا تانیثی مطالعات، یہ ادبی متون کے ان معنوی انسلاکات کو سامنے لاتے ہیں جو پہلے موضوعِ بحث نہ بنائے گئے تھے اور اس لیے نہیں بنائے گئے تھے کہ تب تنقیدی آلات مختلف تھے‘‘۔۔۔۔ ناصر عباس نیر

جناب ناصر عباس نیر اس قدر توانا اور پُرعزم دانش و بینش کے قلم کار ہیں کہ ان کی تحسین و پذیرائی میں صفحات نہیں مقالے اور کتابیں ضبطِ تحریر میں لائی جا سکتی ہیں مگر یہ کام ہم آپ کو سونپتے ہوئے چند معتبر احباب سے آپ کا تعارف ضروری سمجھتے ہیں جن کے رشحاتِ قلم کو چُن چُن کر اور چھانٹ پھٹک کر ناصر عباس نیر صاحب نے آپ کے روبرو پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر وزیر آغا، قاضی افضال حسین، ڈاکٹر ابو الکلام قاسمی، پروفیسر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور جناب ناصر عباس نیر۔ یہاں محترم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کا ذکر بھی لازمی ہے جن کی تحریک و تشویق پر زیرِ نظر کتاب نہ صرف تحریر کی گئی بلکہ انھیں کے ادارے مغربی پاکستان اردو اکادمی نے شائع بھی کی۔ جس طرح صحت مند زندگی کے لیے صحت مند خون اور صحت مند ماحول ضروری ہوا کرتا ہے اسی طرح صحت مند تخلیق کے لیے صحت افزا تنقید بھی از حد ضروری ہے۔ ’’مابعد جدیدیت۔ اطلاقی جہات‘‘ صحت مند دل اور دماغ کی تربیت اور

کشادگی کا بہترین وسیلہ ہے۔جس تک آپ کی رسائی فقط دوصد روپے کے عوض آسانی سے ممکن ہے۔مغربی پاکستانی اردو اکادمی کا پتہ مندرجہ ذیل ہے:سی۔76 ،جوڈیشل کالونی نمبر II ،رائے ونڈ روڈ،لاہور۔

نفسِ جبرئیل

اس حالِ پریشاں کو، اس بے سرو ساماں کو
جینے کا طریقہ دے، مرنے کا سلیقہ دے
میں ڈھونڈنے نکلوں تو کھو جاؤں تجھے پا کر
ایسی کوئی منزل دے ایسا کوئی جادہ دے

☆

کوئی خوشی قریب، نہ محفل قریب ہے
مرے قریب صرف غمِ دل قریب ہے
ساحل سمجھ رہا ہے کہ طوفان ابھی ہے دُور
طوفان کہہ رہا ہے کہ ساحل قریب ہے

☆

زمیں ایسی کوئی ہے آسماں ایسا بھی ہے کوئی
خوش آجائے مرے دل کو جہاں ایسا بھی ہے کوئی
ہے ایسا بھی کوئی جو مجھ کو اس سے بدگماں کردے
مجھے اپنا سمجھ لے خوش گماں ایسا بھی ہے کوئی

☆

رفعتِ ذات کے لئے صدقِ مقال چاہیے
صدقِ مقال کے لیے اکلِ حلال چاہیے
کہتے ہیں بوذری جسے میرے غریب شوق کو
ایسی ہی چیز چاہیے، ایسا ہی مال چاہیے

☆

دنیا نئی صدی کی ہے آمد سے گرم جوش
ہے غلغلہ زمیں پہ، فلک ہے مگر خموش
حیرت سے دیکھتا ہے کہ یہ ماجرا ہے کیا!
اہلِ زمیں کو بیٹھے بٹھائے ہوا ہے کیا

پانچ غزلوں کے دس اشعار صرف اشعار نہیں بلکہ ہزار ہا عنوان کا مفہوم و معنی سمیٹے ہوئے اُس سمندر کی مانند ہیں جو بظاہر خاموش مگر بین السطور جن کے بےیقینی، بےبصری اور بےسمتی کا ایک شور بپا ہے اگر اُس شور، بےچینی، بےیقینی اور بےسمتی سے اپنے آپ کو اور اپنے گردوپیش کو ہم رشتہ سمجھتے ہیں تو پروفیسر خیال آفاقی کی آواز میں آواز ملا کر اِن ناشیرِ نوحے میں بدل دیجئے ایسا نوحہ جو وقت کی ضرورت بھی ہے اور علاج بھی۔ یہ کام مشکل ہے نہ دشوار بس خود کو نفس کے روبرو کرکے جبرئیل سے ہمکلام ہو جایئے، نئے نئے معنی، مفہوم اور کشف خود بہ خود آشکار ہوتے جائیں گے۔''نفسِ جبرئیل'' مکتبہ الضمیر، نوید آرکیڈ، دستگیر سوسائٹی نمبر9 ایف۔بی۔ایریا، کراچی پر اہلِ نظر کی منتظر ہے۔

خاک کا رتبہ/ العاصفہ

وقت کی بےرحمی کو خدا، قسمت یا حالات سے منسوب کرنے سے قبل ایک لمحے کو ٹھہر کر ہمیں اپنی بابت بھی غور کرنا چاہیے۔کبھی کبھی نہیں بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم اپنی بہت قیمتی، معتبر اور انمول ہستیوں کو کچھ اس طرح فراموش کر دیتے ہیں جیسے ہم اشرف المخلوقات کا حصہ نہیں بلکہ کسی ایسے جنگل یا جزیرے کے باسی ہیں جہاں کا نصب العین فقط اور فقط اپنی جبلتوں کی آسودگی کے سوا کچھ نہیں۔پرانی نسل کو بری الذمہ قرار دینا تو کجا نئی نسل سے یہ دریافت کیا جائے کہ میاں آپ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں جواب میں مدمقابل آپ کو اگر یہ کہے کہ وہ پڑھا لکھا، روشن دماغ اہلِ قلم ہے تو آپ کا سینہ فخر سے پھولنا ہی چاہیے مگر جب آپ اسی پڑھے لکھے اور روشن دماغ اہلِ قلم سے دیگر معزز اور ثقہ اہلِ قلم کی طرح ڈاکٹر حسن منظر اور اُن کی شخصیت و فن کی بابت دریافت کرنا چاہیں گے تو آپ کو مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

ڈاکٹر حسن منظر کسی ایک فرد کا نہیں ایک جہانِ معنی کا نام ہے،جس میں ترجمہ،تحقیق، تنقید، تخلیق کے بےشمار چھوٹے بڑے جہاں آباد ہیں۔جی تو چاہتا ہے کہ ڈاکٹر حسن منظر کی ایک ایک تخلیق کی بابت تفصیلی تعارف و تجزیہ پیش کیا جائے مگر ہمارے روبرو اس وقت ڈاکٹر صاحب محترم کی دو تازہ تخلیق ''خاک کا رتبہ'' (افسانوی مجموعہ) ''العاصفہ'' (ناول) ہیں۔جن میں ڈاکٹر حسن منظر نے مشاہدے اور تجربے کے وہ تمام لمحات ہنرمندی سے مقید کرلئے ہیں جن کا ایک ایک پل اور ایک ایک لمحہ ڈاکٹر صاحب نے کبھی کرب کبھی راحت اور کبھی غور و فکر میں بتایا ہے۔

''ایک اور بات جو میں نے امریکہ اور یورپ میں دیکھی ہے اس پر بھی صادق آتی ہے۔یہ لوگ جس ملک میں بھی ہوں وہاں کے مقامی باشندوں کے مداح ہوتے ہیں، کم سے کم اُن سے آزادی سے ملنے کے بعد،اور وہاں کام کرنے والے غیر ملکی سفیر یا شندے انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتے۔مثلاً راوڈی کی بش۔بش کے گھر میں بائبل ہوگی نہ وہ چرچ جاتا ہے لیکن اس کا یہ رخ اس بات کا غماز نہیں کہ وہ لامذہب ہے یا اسے مسجد جانے والے پسند نہیں ہیں۔تمام برطانیہ والوں کی طرح اُسے اُن تمام ملکوں میں دلچسپی ہے جو پہلے برطانیہ کی مملکت تھے اور اٹلسوں میں روشنائی کے سرخ دھبوں کی طرح پورے کرۂ ارض پر جا بجا پھیلے ہوئے ہیں۔''

(اقتباس افسانہ: برطانوی قبریں)

''نہ میں عبدالرحمٰن سے جا کر ملا نہ اس دن کے بعد کبھی محمد بابخش کے گھر میں کوئی میٹنگ ہوئی۔اُس دن کی گفتگو سے میرا اُلجھن کہ ان لوگوں کو فلسطین میں دلچسپی نہیں ہے، ٹھوس حقیقت میں بدل گیا۔میں نے کبھی ایک ملک کے عرب سے دوسرے ملک کے عرب کی تعریف نہیں سنی۔فلسطین اُن سب کی نظروں میں موقع پرست، عیاش اور تباہ کار ہیں۔''

(ناول: العاصفہ سے اقتباس)

ڈاکٹر حسن منظر کا ویژن اور تخیل ماضی، حال اور مستقبل سے کچھ اس طرح گُتھا اور گُندھا ہوا ہے کہ اُس میں اردو کلاسیک کا لطف بھی ہے اور جدید

اردو ادب کا خاصا نقد بھی۔ کمی کچھ ہے تو وہ آپ کے التفات کی ہے جسے آپ تھوڑے سے تدبر اور تفکر سے دور کر سکتے ہیں اگر اُس کے بعد آپ کا اشتیاق ڈاکٹر حسن منظر صاحب کی تخلیقات کا طالب ہو تو ذیل کے پتہ پر رجوع کیجیے۔ شہرزاد: 155-B 'بلاک 5 'گلشن اقبال' کراچی۔

دھرتی تختہ

عشق تھی منزل ہماری خواب تھے کچھ راستے
وہم کی انگلی پکڑ کر ہم سدا چلتے رہے
عمر کا حاصل ہمیں ممتاز اتنا یاد ہے
زندگی بھر ہم کسی کے عشق میں جلتے رہے

بلا شبہ درج بالا اشعار ایک کہنہ مشق شاعر' ادیب' رفیق اور دمساز کے قلم کا شاہکار ہیں مگر اس وقت ہمارا موضوع اس عزیز ورفیق قلم کار کے شعر وسخن کو آپ سے متعارف کرانا نہیں بلکہ اُن کی اوّلین نثری تخلیق ''دھرتی تختہ'' سے روشناس کرانا ہے۔

''ایک زمانے میں سرسید' حالی' اکبر' آزاد' رشید اور حسن نظامی کی معطر ومرصع زبان کا چلن عام تھا۔ اب زمانہ بدل چکا ہے آج کل سیدھی سادی اور عام فہم زبان لکھنے کا چلن عام ہے۔ یہی امر ہمارے ممتاز صاحب کو اپنے ہم عصروں میں ممتاز تر کرتا ہے۔ ممتاز صاحب ہمیشہ سادہ' شستہ' سلیس زبان تحریر کیا کرتے ہیں۔ آپ اُن کی کوئی بھی نثری تحریر دیکھ لیجیے وہ نہ صرف آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی بلکہ دیر تک آپ کے محسوسات کو شگفتہ بھی رکھے گی''۔۔۔۔(محمود ہاشمی)

اگر آپ جناب محمود ہاشمی کے دعویٰ کی تصدیق کے شائق ہیں تو آپ کو اوّلین فہرست میں ممتاز احمد خان صاحب کی تازہ کتاب ''دھرتی تختہ'' کا مطالعہ کرنا چاہیے جس میں عمر خیام کا فکا یوفیس' شیخ عبدالعزیز بن باز' ڈاکٹر حسن ترابی کی زندگی کے نئے گوشے اور نئے زاویے ممتاز احمد خان کے قلم کی سادگی و پرکاری کے ساتھ آپ کے ذوق کو نفاست وثروت بخشنے کے لیے دستیاب ہیں۔ یہی نہیں ممتاز احمد خان کے قریبی احباب قلم بھی ممتاز احمد خان کی شوخ بیانی اور وسعت قلبی کے دائرے میں مقید ہیں۔ اس کے علاوہ موسیقی' فلسفہ' سماجی' سیاسی' مذہبی اور ملی حوالوں سے بھی کئی مفید اور معلوماتی مضامین جناب ممتاز احمد خان نے سپردِ قلم کر کے قارئین اردو کے لئے ایک اچھی اور صحت مند کتاب کا اضافہ کیا ہے۔ کتاب کا ظاہر و باطن مصنف کی شفاف قلبی نفاست اور اُس کی تحریر کی قوت کو عمدگی سے اُجاگر کر رہا ہے۔ نفیس عمدہ کاغذ اور اعلیٰ طباعت کی نمائندہ ''دھرتی تختہ'' ایک سو چھہتر صفحات پر محیط ہے جو پاکستان میں یاسر عرفات مکان نمبر 664/E گلی نمبر 27 سیکٹر II' خیابان سرسید راولپنڈی اور بیرون ملک کے اہل قلم براہ راست مصنف سے طلب کر سکتے ہیں۔ آپ کی سہولت کے لئے جناب ممتاز احمد خان کا پتہ اور فون نمبر درج کیا جا رہا ہے:

107, OLDKNOW RD, SMALL HEATH,
BIRMINGHAM B10 OJA,U.K
Ph: 0044-121-7733440

قرض سخن / باتیں سخنوروں کی

دو ہزار آٹھ سے اگر انیسو چونتیس برس منہا کر دیے جائیں تو چوہتر برس باقی بچتے ہیں جنھیں پون صدی سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے۔ چوہتر برس قبل غازی پور' یوپی ' بھارت میں آنکھ کھولنے والا ایک بچہ آج کراچی پاکستان میں بیٹھ کر دنیائے اردو میں شعر وسخن کی آبرو کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سہیل غازی پوری صاحب کینیڈا آدمی ہیں ان گنت شعری مجموعوں اور ایک گلستی سخن نوازی کے مجموعے کے بعد جناب سہیل غازی پوری کی دو تازہ تخلیقات منظر عام پر آئی ہیں۔ ''قرض سخن جناب سہیل غازی پوری کے غزلیہ کلام کا ایک سو بانوے صفحات پر مشتمل ایسا شعری مجموعہ ہے جس پر جناب سہیل غازی پوری بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اُن کے فخر وانبساط میں ہماری اور آپ کی شرکت کا تناسب کیا ہوتا ہے۔

جذبات سچ نہ ہوں تو تحریر کیوں کریں	اپنے حروف عصر کی تحقیر کیوں کریں
دل نے چاہا تو بہت ایسا مگر ہو نہ سکا	میرا انداز بیاں جز وتبر ہو نہ سکا
کر جاتے جاتے کئی بار گر پڑی مجھ پر	عجیب برق شکستہ دلی تھی پچھلے برس
لفظوں کی کسی طرح بھی تذلیل نہ کرنا	رنگ رُخِ معنی کبھی تبدیل نہ کرنا

جس قدر سادگی بلکہ سادہ دلی سے سہیل غازی پوری صاحب غزل کے آہنگ میں حالات حاضرہ وہاصرہ بیان فرما رہے ہیں اُسی قدر سادگی اور سچائی سے ''باتیں سخنوروں کی'' دوسرا حصہ میں احباب شاعر وشاعرات کی تخلیقات کی نسبت بھی منظوم خراج پیش کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر غلام مرتضیٰ راہی صاحب کے بارے فرماتے ہیں

راہی اک شاعر حسین گفتار
قریۂ شاعری میں آپہنچا
شعری مجموعہ' لا کلام'' کے ساتھ
منفرد لہجۂ بیاں لے کر
کچھ روایت کی چاشنی کے ساتھ
داخلی کیفیات کے ہمراہ
تجربات اور مشاہدات کے سنگ
تہہ بہ تہہ حرف میں سمیٹے ہوئے
اپنی تہذیب کے مسائل کو
فکر وفن کے نئے تقاضوں کو
زندگی کے کئی حوالوں کو
جگنوؤں کو' چمکتے تاروں کو
رنگ ونکہت کے ماہ پاروں کو (نامکمل)

جناب سہیل غازی پوری کی مذکورہ بالا کتب: شعری دائرہ' R-1055/9 'دستگیر سوسائٹی' فیڈرل بی ایریا' کراچی پر دستیاب ہیں۔

طائرِ قبلہ نما

* لنڈن کا پل کب گرتا ہے!

ستیہ پال آنند (امریکہ)

....

جنگ و جدل کے پے در پے طوفانوں سے ٹکر کھاتے
لنڈن کا پل ہلنے لگا ہے
پل کے پائے کھڑ کھڑ کرتے دیکھے ہے ہو؟
*چولیں ہلتی بھی دیکھیں؟
یوں لگتا ہے، جیسے اب صدیوں کی نہیں
دو چار برس کی بات ہے، یہ پل اب کسی بھی ساعت
دھڑ دھڑ کرتا گر جائے گا!

لوگ، وہ لاکھوں لوگ جو اس پل کی چھاتی پر
روزانہ اپنی کاروں میں کر و فر سے چلتے ہیں
گورے (شاید یورپ کے مشرق سے آئے)
کالے (شاید افریقہ کے مقبوضہ ملکوں سے آئے) بیچارے، بے بلک، مہاجر
"پاکی"، اک سفلی القاب جو پاک و ہند کے لوگوں سے منسوب ہوا ہے
اور پھر انگلستان کے اپنے اصلی باسی
جو صدیوں سے یہ کہتے آئے تھے ــــ
"سورج کبھی نہیں ڈوبے گا انگلستان کی سلطنت پر!"
لنڈن کا پل اس عظمت کا سلطانی شاہد، اک تاریخی مظہر
دیکھو، دیکھو، ڈول رہا ہے!

بیجنگ، دلی، اور کراچی پنجوں کے بل اچک اچک کر دیکھ رہے ہیں
فلسطین، کابل، بغداد بھی خوں سے تھڑے ہاتھ اٹھا کر نوحہ کناں ہیں
یورپ اور امریکا کے شاہی خانوں میں جیسے اک بھگدڑ سی مچی ہے
افریقہ تو ڈھول نقارے پیٹ پیٹ کر کب سے یہ کہتا آیا ہے
"گرنے والے کا سر تو پہلے سے ہی چکرا جاتا ہے!" ***
اور لاطینی امریکا بھی چشم براہ ہے اس پل کی ریزہ ریزی کا!

دیکھیں، اب اندازہ لگائیں
کوئی طائر قبلہ نما ہے، جو یہ بتائے
لنڈن کا پل کب گرتا ہے!

London Bridge is falling down, falling down. (T.S. Eliot)

*** سواحلی زبان کا ایک محاورہ

لاؤس میں آخری پہر

محمود شام (کراچی)

خوں آشنا صدیوں کے ملبے تلے
خامشی سے دبے
زندگی کو اندھیروں میں ڈھونڈا کیے

چہرہ چہرہ اداسی کے جنگل اُگے
آنکھوں آنکھوں پگوڈوں کی حیرانیاں
ماند پیشانیاں
خوف کی داستاں

دھیمے لہجوں میں ہیں گونجتی
راکٹوں، گولیوں، توپ خانوں، بموں، مارٹر کی فغاں

ہاتھ رکشے، کلب، ریڑھیاں، میکدے، بجلی گاڑی، سیاحوں
کی رنگین ٹھنڈی ہنسی
دنیا کتنی سرعت سے پہلو بدلتا ہوا
مارکیٹیں سنبھالے ہوئے بیٹیاں
شرقیت سے غربت کی سرگوشیاں

وقت دریا کنارے کھڑا سر جھکائے ہوئے
آگے بڑھتی ہر اک موج کی آہٹیں

اپنی تاریخ سے برسر جنگ جغرافیہ
موسیقی اداؤں سے بیدار ہوتا ہوا بستیاں

درد

انور سدید (لاہور)

درد چھپا تو یہ محسوس ہوا ہے مجھ کو
جیسا کہ شمعِ شبستان جلی
جس کی کرنیں مرے دردناک نگر میں آئیں
نور پھیلا نہ سکیں
روشنی لا نہ سکیں
قریۂ جاں کو حیطۂ غمِ دوراں کر کے
میری پلکوں پہ رکیں۔
کرب میں تحلیل ہوئیں
ان کی آغوش میں ہے۔
درد مرا ۔۔۔۔ ایک مجسم آنسو!

منافق

ڈاکٹر شباب للت (نئی دہلی، بھارت)

ہم نے دیکھا ہے ہمیشہ کہ وہی لوگ شباب
جن کی ہوتی ہیں وفاداریاں اپنی مشکوک
اپنے باطن کی خباثت کو چھپانے کیلئے
انگلیاں اپنی
اٹھاتے ہیں وفاداروں پر
دلِ اخلاص و وفا سے
یہی ہوتا ہے سلوک

کب تک ہم

سید مشکور حسین یاد
(لاہور)

کب تک ہم تلوار کی دھار پہ چلتے رہیں گے
کب تک ہم اپنا یہ خونِ ناحق
اپنے سر پر ملتے رہیں گے
کب تک ہم اِس بے ہودہ سی فضا میں
اپنی سانسیں روکے اپنے سینے پھلائے
بزعمِ خویش سنبھلتے رہیں گے
کوئی بتائے!
آخر کب تک ہم
"صبر کرو اور حوصلہ رکھو" جیسی
بے رحم و سفاک نصیحت پر
خوعمل رہیں گے
کوئی تو ہم کو آگے بڑھ کر للکارے
ہم جس کی للکار پہ
براہِ راست بلا تامل
ظلم و ستم پر ٹوٹ پڑیں
درد و الم کا خاتمہ کر دیں

○

رباعیات

عبدالعزیز خالد (لاہور)

(۱)

کرنے دے جو دنیا نظر انداز کرے
آزردہ نہ ہو رویّہ مردم سے
کر کام میں اپنے نہ کر کوتاہی
حقدار کو آخر اس کا حق مل کے رہے!

(۲)

ہو شخص نہ مشق سے کوئی حرف شناس
گو طفل تسلی دے اس کو خنّاس
گر ذوق سلیم اس کے نہ ہو شاملِ حال
بھرتا رہے قرطاس پہ بے شک قرطاس!

(۳)

خود کو خوش فہمیوں سے بہلاتے ہیں
بے برگ و نوائی میں بھی اتراتے ہیں
وہ زلّہ برداران بذل و نوال
جو نعمتوں کا بچا کھچا کھاتے ہیں!

(۴)

کھاؤ نہ فریب کششِ طول امل
دن رات رہو منتظرِ پیک اجل
بے منت و مزد کرو خدمت خلق
اس دار فنا کو سمجھو میدانِ عمل!

(۵)

ہم ہیں وہ بے برگ و نوا اہلِ نوا
جن کو ہے صیقلِ عطا پائے خدا
زادِ ہنر و توشۂ تخلیق کے ساتھ
منظور ہے قلّتِ متاعِ دنیا!

(۶)

فنکار عموماً ہوں سوداوی مزاج
گھٹی میں ہو ان کے احتجاج علاج
ہوں اپنی ہی اقدار و روایات ان کی
بھائیں نہ انہیں سماج کے رسم و رواج!

(۷)

گفتہ ہوں غزالوں کی غزلخوانی کا
لب ہائے نگاریں کی گل افشانی کا
غارت گرِ ایماں ہو وہی حسن جسے
احساس ہو اپنی حشر سامانی کا!

(۸)

آیات و کلیم میں بھی رواں میرا قلم
افسانہ و افسوں کے لیے بھی پُر
جتنا میں قدیم ہوں جدید اتنا ہی
نسبت ہے کنشت سے بھی مع ربط حرم!

دماغ

محمود الحسن (راولپنڈی)

ابتدائے آفرینش سے چلا آتا ہے یہ
نوعِ انساں کو نئے انداز سکھلاتا ہے یہ

ابتدا میں گو رہی سادہ روی اس کا شعار
کر دیا ہے اس کو صدیوں کے سفر نے پختہ کار

مختلف ادوار میں جیتا رہا مرتا رہا
ہر گھڑی طے ارتقا کی منزلیں کرتا رہا

جب کبھی پالا پڑا تاریکیٔ اوہام سے
روشنی پاتا رہا یہ نیّرِ الہام سے

خالقِ فطرت نے جاری کر دیا ایسا نظام
مل گیا ہر قوم کو اُس کی ہدایت کا پیام

یہ نہ ہو تو آنکھ اندھی، کان بہرے، جسم شل
کاسۂ سر میں یہ کیا ہے اے خدائے عز و جل

یہ نہ ہو تو کان وقفِ سوز ہو سکتے نہیں
لحنِ داودی سے لطف اندوز ہو سکتے نہیں

مطمئن ہو گر تو فردوسِ بریں کہیے اسے
سب سے افضل، سب حسینوں کا حسیں کہیے اسے

بال و پر میں قوتِ پرواز بھر دیتا ہے یہ
مشکلاتِ زندگی آسان کر دیتا ہے یہ

جسم و جاں کو متحد کرنا اسی کا کام ہے
یہ نہ ہو تو آدمی اِک بندۂ بے دام ہے

آدمی کے ذہن کو فکرِ رسا دیتا ہے یہ
آدمی کو اپنے خالق سے ملا دیتا ہے

سلطنت ہے جسم، ہم نے پایا اس کا سراغ
سلطنت میں مسندِ شاہی پہ بیٹھا ہے دماغ

سلطنت ایسی کہ اس کے جس قدر ارکان ہیں
سب کے سب اِس حکمراں کے تابع فرمان ہیں

یہ نہ ہو تو حرفِ بے معنی ہے حسنِ کائنات
یہ نہ ہو تو روزِ روشن تیرہ و تاریک رات

ابنِ آدم جب کمالِ ارتقا پر آ گیا
آخری پیغامِ حق جبریلؑ لے کر آ گیا

اُمتِ خیر الرسلؐ کو حکمتِ قرآن دی
اور فرمایا کہ اتممت علیکم نعمتی

کور ہے وہ آنکھ جس نے وہ نبیؐ دیکھا نہیں
ذہن ناقص ہے جو اس پیغام کو سمجھا نہیں

ارتقائے ذہنِ انسانی کا مقصد ہے یہی
عقل و دانش کی فراوانی کا مقصد ہے یہی

○

مسافرت

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ
(کیلی فورنیا یو ایس اے)

پھر اُٹھی نا ختم راستوں پہ گامزن
عمرِ بے انجام ہے از سرِ نو نغمہ زن
منزل سے اپنی بے خبر، آئے، جائے لوٹ کر
طے کرنا ہے کیسے، لیا کیسے ہے فیصلہ
کب، کس موڑ پہ رُکے، زندگی کا قافلہ
کب چلے، چلکر تھمے، سوچ میں ہوں مبتلا
ذہن ودل میں اُٹھا، دفعتاً اک خیال
مگر احساس میں ہوا، اجنبی سا ارتعاش
بے ہنگم سی اُٹھی پھر، درونِ دل سے یہ صدا
تیرے بس میں کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں تیرے ہاتھ
بہتا جا تشنہ تُو، وقت کی موجوں کے ساتھ
تُو نے از خود ہی لکھی، زندگانی کی کتاب

○

بنیاد

صبا اکرام (کراچی)

چلو، چل کے ڈھونڈیں
کوئی دردایسا
جوڑ پائے ہم کو، تمھیں
اورہم سب کو
بے سمت رستوں کی بے سمتیاں
ایک منزل کی جانب بڑھیں
خون سے خون باتیں کرے
اورسوکھی رگوں کی گپھاؤں میں کھوئے
ہڑپا کی
موئن جوداڑو کی
اُجڑی ہوئی رونقوں
کی سیر راکھ میں
ہاتھ ڈالیں تو صدیوں سے سانس میں دبا
کوئی بے رنگ سکہ ہی مل جائے چاندی کا
مٹی کا ٹوٹا ہوا کوئی برتن
کہ جس پر لکھے
ایک انجانی بھاشا میں
یا اجنبی نقش میں
درد آمیز قصوں کا اک سلسلہ ہو
ہمارے تمہارے لیے
کھوئے رشتوں کی پہچان کا
آسرا ہو!!

تُو

قیصر نجفی (کراچی)

مجھے اک بات کہنی ہے
جواب تک کہہ نہیں پایا
وہ دل میں ہو
تو دھڑکن ہے
مسرت ہے
طمانیت ہے
جیون ہے

بدن میں ہو
تو جاں ہے
اور لب پر ہو
تو نغمہ ہے
غزل ہے، گیت ہے، سُر کا جہاں ہے

چمن میں ہو
تو گُل ہے
اور گُل میں ہو
تو خوشبو ہے
اگر تجسیم ہو جائے
تو وہ تُو ہے
مجھے اک بات کہنی ہے
جواب تک کہہ نہیں پایا

نغمے کا روپ

غالب عرفان
(کراچی)

بن چاہے جب چاہت کا نغمہ گونجے
ایک آواز سراپا صورت بن جائے
ایک ندی اٹھلاتی گاتی بہتی ہوئی
ہوا کے ساتھ کوئی سرگوشی بن جائے
پھر شفاف فلک کی ایک نوا کا سفر
دل کی دھڑکن بن کر سُر کی طرح گائے
رس گھولے کانوں میں پیار کا گیت کوئی
تب اس وقت میں گم ہو کر
اُس نغمے کی
ایک طلسمی جست کے قابو میں آؤں
دشتِ تحیر کی دنیا میں جا پہنچوں
ایک خیالی عکس کا منظر دیکھوں
نغمے کے اک روپ کو میں زندہ دیکھوں

○

مردم شماری

فیصل عظیم (کناڈا)

آؤ خوش لوگوں کو ڈھونڈیں
لوگ، جو وحشت کے مارے
ہم دکھیاروں کو
کوئی نئی امید دلائیں
لوگ، کہ جن کے چہروں پر
سچی خوشیوں کی ایک چمک ہو
جو اب تک ہم دیکھ نہ پائے
وہ بھی اپنے گرد کہیں تو بستے ہوں گے
جو سانسوں کے قیدی بن کر
گھٹ گھٹ کر جینے کے بجائے
لمبی تان کے سوتے ہوں گے
ایسے لوگ بھی ہوتے ہوں گے
ایسے لوگ، کہ جن کی آنکھوں میں ٹھنڈک ہو
چہروں پر وحشت کے سائے نہ لہراتے ہوں
اپنے دل کی گہرائی سے
گیت خوشی کے جگاتے ہوں
جن کو صبح کے ہونے کا کچھ خوف نہیں ہو
ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں
ان اربوں لوگوں میں ہم کو
بس اپنا ہی آپ ملا ہے
وہ بھی آنکھیں بند کریں تب!

دوہے

بھگوان داس اعجاز (دلی بھارت)

ذرّے ذرّے کی یہاں جدا جدا پہچان
مولیٰ تیری شان پر ، کائنات قربان

روپ ترا پہچان لوں ، ایسی کہاں نگاہ
میں اک قطرہ اور تو ، ساگر ایک اتھاہ

جو تجھ کو پہچان لیں ، نین کہاں سے لائیں؟
میرے مالک ہم تجھے، کہاں ڈھونڈنے جائیں؟

ڈرے ڈرے ہیں موت سے، پکڑ نہ لے کوئی روگ
لگے چیونٹیاں مارنے ، ہاتھی قد کے لوگ

جیتا ہاتھی لاکھ کا، مرا سوا دے جائے
لاکھ ٹکے کا آدمی ، مگر چوپٹ کر جائے

پانو تلے چینٹی مری، گیا میں دھونے پاپ
لوٹا ہوں بیری دُوار سے گیا نہ جیّا تاپ

ناٹے قد سے ہو گیا، جنم جنم کا بیر
لیے کروانے چلی ، چینٹی اپنے پیر

کام جو ہاتھی نہ کرے چینٹی کر دکھلائے
چینٹی پھیلے ریت میں ، دانہ دانہ لائے

مردہ ہاتھی دیکھ کر، تان دھنش میں تیر
چینٹی مع شمشیر کے ، کھنچا رہی تصویر

حدیثِ دلبری

یونس صابر کی نذر

سُرورانبالوی (راولپنڈی)

ی — یہ گنجینۂ شرافت کا مرقع مہر و الفت کا
ستارہ جگمگاتا ہی رہے گا اس کی شہرت کا

و — وفا کا ایک پیکر ہے حدیثِ دلبری اس سے
گلستانِ تمنا میں اسی سے پھول بھی مہکے

ن — نہ دل میں کوئی کینہ ہے نہ لب پر کوئی شکوہ ہے
کہ یہ تو شہرِ نا پُرساں میں بھی خوشحال رہتا ہے

س — سُرور و کیف کی حامل ہمیشہ بات ہے اس کی
ستائش اور صلہ سے بے غرض اب ذات ہے اس کی

ص — صداقت کے دیئے اس نے جلائے تیرگی میں کیا
ہوائے تُند کر پائے گی اس کا بال کیا بیکا

ا — اگر چہ یہ بھی اپنے موڈ میں آزاد رہتا ہے
وطن کی سربلندی کا اسے غم یاد رہتا ہے

ب — بہت سی خوبیاں رکھیں خدا نے ذات میں اس کی
کہ انجیل محبت ہے عیاں ہر بات میں اس کی

ر — رہے گا شعر کی دنیا میں اس کا نام تابندہ
سُرور انبالوی! ایسے ہی انساں ہیں سدا زندہ

○

ایک خط

حامد لطیف (ممبئی بھارت)

بعد سلام صد احترام
میرے گلزار، میرے بھائی،
میرے محترم بھائی،
آ، کہ میں تجھ کو لگا کر
اپنے سینے سے،
تیری پیشانی پر رکھ دوں،
عقیدت کی حرارت سے دہکتے،
چند بوسے، ٹھنڈے، ٹھنڈے!
بتا یہ کیسا جذبہ ہے تیرا؟
کہ میں جسکی حرارت دیتی
ٹھنڈک سے پگھل کر، منجمد سا ہو گیا ہوں۔
سمجھ میں کچھ نہیں آتا،
کہ میں جاگا ہوں یا پھر سو گیا ہوں!
کہ اتنا خوبصورت یہ جریدہ،
کتنی خاموشی سے شائع کر دیا ہے۔
اور اس پر کرم بالائے کرم یہ بھی،
کہ تو نے ذکر کر کے ہم سب کو شامل،
جو زر سالانہ وصول ہے۔
دعا کے ساتھ اب ختم کرتا ہوں۔
بقول اقبال:
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں ''ہے''
ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں ''ہے''

نیند میں چلتی موت

علی محمد فرشی
(راولپنڈی)

میں نے دیکھی نہیں
خواب بُجھی ہوئی مخملیں انگلیاں
(جن کا لمس گداز ایک دن
وقت کے سرد گالوں سے بہتا ہوا
میرے ہونٹوں پہ آیا
تو صدیوں کی نمکینیاں
سنگ بستہ دلوں کے سمندر میں
ابھرے پہاڑوں کا اک سلسلہ بن چکی تھیں)

وہ کیا سلسلہ تھا
جو اک گورے گورنگ (ریشمی نارسا) تن گیا
جس پہ چلتے زمانے
خداوندِ اعلیٰ کے احکام رحمت اٹھائے ہوئے
رقص کرتے گزرتے
تو مٹی پہ نقش و نگارانِ غم مسکراتے
تجھے یاد آتے
تجھے یاد کرتے ہوئے
یوں گزرتے
کہ جیسے کسی بعید بھادو بھری چاندنی رات سے
چاند کا بانکپن
بادلوں کے لڑکپن کے گالے اڑاتے ہوئے
خوابِ لب ریز پریوں سے
چھپ چھپ کے گزرے!

یہ دکھنے دکھانے کی ساری مشیت
یہ چھپنے چھپانے کی ساری اذیت
کوئی جھیلتا ہے؟
جو تو نے اکیلے میں جھیلی
میں کتنے دنوں بعد آیا ترے پاؤں چھونے؟
حساب اس خجالت کا کرتے ہوئے
کتنے آنسو گرے؟
میں نہیں گن سکا!
بھیگتے، پھسلتے لفظ، اعداد جب بھی سمندر
بناتے
ترے نام کی ناؤ مجھ کو کنارے لگاتی
مگر یہ کنارہ کوئی کہکشاں تو نہیں تھا
کہ میں تیرے لا وقت ساحل پہ
خود اپنے پاؤں کے مٹتے نشاں دیکھ کر مسکراتا
وہ گنتی کا سکوی زینہ تھا
تحت الثریٰ تک رواں (ریختی) آب نائے
تھی
آنکھوں کی کاریز تھی
جو مرے دل کے پاتال تک مجھ کو لاتی
رلاتی!

رلاتی رہی بات بے بات
تیری محبت کی وہ داستاں
جس کو لکھنے کی کوشش میں لاکھوں ورق
میں نے کالے کیے
مگر ایک لحہ بھی میرے قلم پر
وہ خوش رنگ الہام بن کر نہ اترا
جسے تیرے ہونٹوں کی تصدیق ملتی!

بڑی سے بڑی بات کو
ایک بھیگی ہوئی مسکراہٹ میں کہنے کا تجھ کو سلیقہ تھا
اعداد و الفاظ کی بھیڑ میں
کس قدر میں اکیلا ہوں؟
تجھ کو خبر ہے!
بتا دے مجھے بھی کوئی اسم اسرار
(جس کی تمنا لیے سب پرندے گئے ساتویں سمت
لیکن کوئی آج تک مڑ کے آیا نہیں!)
پھول ہونٹوں کے
مردہ زمانے پہ رکھوں تو
خوش خو تری
گُل بدن بن کے جاگے
ترے سانس میں سانس لینے کی راحت
مری یاد کے باغ میں
ایک جادو زدہ نیم خوابیدہ
شہزادی زندگی کی طرح منتظر ہے

یہاں اپنے ہونے سے کس کو مفر ہے
کوئی نیند میں جاگنے کی اذیت نہیں جانتا
اپنی جنت کا منظر مرے گلیجے خواب پر کھول دے
کوئی شیریں تکلم مرے زہر میں گھول دے
فاصلہ نیند اور موت کے درمیاں
اپنی موجودگی سے بتا
کر عطا معجزاتی ہنر
میں تو ٹوٹوں کی گنتی میں مصروف
اندھے زمانے کے ہاتھوں کی
وہ میل ہوں
جس پہ مکھی بھی آکر نہیں بیٹھتی!

ڈرامہ

قصہ کہانی کا

نیلم احمد بشیر

سین (۱)

سٹیج پہ اندھیرا ہے۔ راوی پہ سپاٹ لائٹ ہے۔ جس نے ہاتھ میں کاغذ قلم تھام رکھا ہے۔

راوی: میں ایک کہانی کار ہوں۔ آپ پوچھیں گے کہانی کار کیا ہوتا ہے میں آپ کو بتاتی ہوں۔ بس وہی ۔۔۔۔ جو کہانیاں لکھتی ہے۔ آپ نے شاید نوٹ کیا ہو، میں نے لکھتی کہا ہے لکھتا نہیں۔ اور پھر آپ اس کی وجہ پوچھیں گے ۔۔۔۔ تو جناب میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ جو کہانی عورت لکھ سکتی ہے وہ مرد نہیں لکھ سکتا۔ اور یہی حقیقت بھی ہے ۔۔۔۔ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں آپ کو کہانیاں کہاں سے ملتی ہیں؟

(وہ ہنستی ہے)

سوال دلچسپ ہے مگر اسکا جواب اس سے بھی دلچسپ۔ بات یہ ہے کہ مجھے تو کہانیاں ہر جگہ، ہر وقت، ہر صورت کبھی گری پڑی، کبھی ٹکڑوں میں بٹی ہوئی، کبھی فضا میں تیرتی ہوئی اور کبھی دل کے قریب دھڑکتی ہوئی۔ مجھے تو انہیں ڈھونڈنے کی کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ وہ تو واقعہ کبوتروں کی طرح میرے آس پاس ہی اڑتی پھرتی ہیں ۔۔۔۔ پھڑ پھڑاتی، گھمن گھیریاں کھاتی آزاد اور خوبصورت کبوتریاں۔ میں دانہ ڈالتی ہوں تو وہ نیچے کینچے ہتھیلی پہ آ بیٹھتی ہیں۔ اور بس پھر ۔۔۔۔ یہیں سے کہانی شروع ہو جاتی ہے

ابھی دیکھیے، کل ہی کی بات ہے ۔۔۔۔ ایک بڑی عمر کی کہانی شام کے وقت سڑک پہ واک کرتی چلی جا رہی تھی۔ اندھیرا ادھر سے ادھر سے گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا ۔۔۔۔

سین (۲)

بڑی کہانی کو دیکھ کر مرد فقرے کس رہے ہیں

(۱) وے اس آنٹی کو دیکھو ۔۔۔۔ بڑی چھلاں مار رہی ہے

(۲) ہائے اے بھی ہائے

(۳) گاگا ہے ۔۔۔۔ ابھی تو میں جوان ہوں ۔۔۔۔

آ کر قریب سرگوشی کرتا ہے ۔۔۔۔ وہ اسے دھکا دیتی ہے

بڑی: وے پرے مر ۔۔۔۔ میں تیری ماں بلکہ نانی جتنی ہوں

ایک اور آواز: Hey Foxy Mama

بڑی (Facing Audiance): کوئی حال نہیں ۔۔۔۔ اس ملک میں کوئی عورت سڑک پہ چل ہی نہیں سکتی۔ ہاں مغربی ممالک میں، یعنی کافروں کے دیس میں بے شک عورت گھر سے باہر بے فکری سے گھوم پھر سکتی ہے

بڑی کہانی راستے میں لگے ایک بینچ پر بیٹھی ایک نوجوان لڑکی کو دیکھ کر رک جاتی ہے آگے جاتی ہے پھر پیچھے لوٹ جاتی ہے یہ لڑکی 24,25 سال کی ہے بال کٹے، فیشن ایبل، کچھ پڑھی لکھی وہ زار و قطار روئے چلی جا رہی ہے ۔۔۔۔ بڑی اسے دیکھ کر رک جاتی ہے ۔۔۔۔

بڑی: میں ایک بات پوچھوں؟ کون ہو تم اور یوں کیوں بیٹھی رو رہی ہو؟

لڑکی: میں ایک کہانی ہوں ۔۔۔۔ (روتے روتے)

کورس کی آواز

Background میں:

کہانیاں کہانیاں
آنیاں تے جانیاں
کدی اے ہسانیاں
تے کدی نے رُلانیاں

لڑکی کوئی جواب نہیں دیتی ۔۔۔۔ آنسو بہا رہی ہے

قریب سے وہی لفنگے گزرنے لگے

آوازیں:

(۱) کیا ہم آپ کی کوئی مدد کر سکتے ہیں۔

(۲) کہیے آپ کو کہیں چھوڑ دوں

(۳) بس میں تمہارا دکھ بانٹنا چاہتا ہوں

گھٹیا ٹھیک رہتا ہے

بڑی کہانی: یہ کمینے تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے۔ سڑکوں کے کتے۔ چلو بھاگو یہاں سے ۔۔۔۔ جوتا اٹھاتی ہے لفنگے بھاگ جاتے ہیں۔ (بیک گراؤنڈ میں کتوں کے چیاؤں چیاؤں کرنے کی آواز۔)

بڑی: دیکھو بیٹی۔ یہ مرد ذات مجھ جیسی بوڑھی کو چھیڑنے سے باز نہیں آتے تو تم تو جوان ہو، خوبصورت ہو، یوں تن تنہا شام کے وقت اکیلے یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ بتاؤ تو سہی کیا بات ہے؟ آخر ہوا کیا ہے

جوان لڑکی: بڑا ظلم ہوا ہے میرے ساتھ ۔۔۔۔

بڑی: کیا ہوا؟

جوان کہانی: میرے میاں نے مجھے مار کر گھر سے نکال دیا ہے ۔۔۔۔

بڑی کہانی: اوہ چچ چچ ۔۔۔۔ بڑے افسوس کی بات ہے مگر کیوں؟ ہوا کیا تھا؟

جوان کہانی: میں نے خرچہ مانگا تھا بس ۔۔۔۔ وہ خرچہ نہیں دیتا مجھے مار کر گھر سے نکال دیتا ہے

بڑی کہانی: پہلے بھی ایسا ہوا ہے؟

جوان کہانی: اکثر ۔۔۔۔ اسکے لیے تو یہ عام بات ہے ۔۔۔۔ مگر اب میں کہاں جاؤں ۔۔۔۔

بڑی کہانی کچھ سوچ کر: پہلے کہاں جاتی تھی ۔۔۔۔

جوہی کپاڈیا: امی ابو کے گھر۔۔۔۔

بڑی کپاڈیا: تو اب پھر چلی جاؤ۔۔۔۔

جوہی کپاڈیا: وہ مجھے پھر واپس بھیج دیں گے۔۔۔۔ وہ خود بھائی اور بھابھی کے در پر پڑے ہوئے ہیں۔

بڑی کپاڈیا: مگر تم یہاں کیسے اور کب تک بیٹھ سکتی ہو؟ شام کا اندھیرا پھیل رہا ہے۔۔۔۔ تم یہاں محفوظ نہیں ہو۔۔۔۔

جوہی کپاڈیا: اب میرے لیے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔۔۔۔ ہائے اللہ جی آپ نے میرے ہی ساتھ ایسا کیوں کیا؟ میں نے کوئی گناہ بھی نہیں کیا تھا؟

Why me?

Why me.

چیخنے لگتی ہے۔۔۔۔ بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کے روتی ہے۔۔۔۔

بڑی کپاڈیا: ?Why you ۔ بھئی یہ Why کا سوال بہت عجیب ہے۔۔۔۔ کیونکہ اس کا کوئی ایک جواب نہیں ہو سکتا۔ بے وقوف لڑکی کیا یہ صرف تمہارے ہی ساتھ ہوا ہے۔۔۔۔

Why any woman?

جوہی کپاڈیا: اب میرے لئے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔۔۔۔ اللہ میاں نے میرے ساتھ ہی ایسا کیوں کیا؟ اللہ جی میں نے تو کوئی گناہ بھی نہیں کیا۔۔۔۔ (بال نوچنے لگتی ہے) ہائے

Why me. Why me.

بڑی کپاڈیا: ?Why you ۔ بے وقوف لڑکی تمہارا کیا خیال ہے یہ صرف تمہاری کہانی ہے؟ اگر میں تمہیں بتاؤں کہ میرے شوہر نے مجھے بھی کسی دوسری عورت کی وجہ سے پندرہ سال پہلے مار کر گھر سے نکال دیا تھا تو۔۔۔۔ تم کیا کہو گی؟

جوہی کپاڈیا: حیرت سے بڑی کو بے یقینی سے دیکھتی ہے۔

آپ؟ یقین نہیں آتا نہیں ہے۔ (چند لمحے خاموش رہتی ہے) تو پھر آپ نے کیا کیا؟ آپ تو۔۔۔۔ اچھا تو پھر۔۔۔۔؟

بڑی کپاڈیا: کرنا کیا تھا۔ میں نے کہا To hell with you ہاتھ باندھ کر کیا ڈرتی ہے۔۔۔۔ پھر دیکھو خدا کیا کرتی ہے اپنی زندگی خود بنانے نکل کھڑی ہوئی۔

جوہی کپاڈیا: ہاں لیکن آپ تو پڑھی لکھی ہیں نا۔۔۔۔ میں صرف ایف اے پاس ہوں۔ میں کیا کر سکتی ہوں؟

بڑی کپاڈیا: F.A پاس؟ تو اتنی جلدی شادی کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی۔ اور پڑھتیں۔ شادی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ہی ہونا چاہیے۔

جوہی کپاڈیا روکر شرمندگی سے: مجھے عشق ہو گیا تھا۔۔۔۔ ہائے۔۔۔۔

بڑی ذلیل چیز ہے عشق۔ سب بکواس ہوتی ہے۔۔۔۔ اب پتہ لگ رہا ہے

!۔۔۔۔ تو پھر آپ نے کیا کیا؟ میرا مطلب ہے جب آپ کے شوہر نے آپ کو۔۔۔۔

بڑی کپاڈیا: کرنا کیا تھا۔۔۔۔ مجھے اپنے پیروں پہ کھڑا ہونا پڑا اور کیا؟ مکمل کر سالس لیے، جاب کی، خود کو، بچوں کو سپورٹ کیا اور اپنی محنت سے شکر خدا کا آج اس مقام پر ہوں کہ مجھے کسی کی اور کسی بات کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔

جوہی کپاڈیا: اکیلی؟ ہائے اللہ میں تو اکیلی نہیں رہ سکتی۔ میں تو مر جاؤں گی۔

بڑی کپاڈیا: کوئی نہیں مرتا کسی کے بغیر۔ تم ابھی جوان ہو۔ ہمت کرو۔ آگے بڑھو آگے بڑھو۔۔۔۔ خود کو سنبھالو ایک نئی زندگی کے خواب دیکھو۔ ورنہ واپس لوٹ جاؤ۔۔۔۔

جوہی کپاڈیا: میں تو بڑی کمزور اور بے بس لڑکی ہوں۔۔۔۔

بڑی کپاڈیا: بے بسی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ اور عورت۔۔۔۔ وہ تو طاقت کا دوسرا نام ہے۔ باہمت اور مضبوط۔۔۔۔ زندگی سے مار کھاتی ہے مگر ہارتی نہیں۔ گر کے پھر سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے (جوہی کپاڈیا حیرت سے اس کی باتیں سنتی ہے مگر پھر یکدم سسک سسک کر رونے لگتی ہے)

بڑی کپاڈیا: روتے روتے اس کڑی دھوپ میں کیا کرو؟ اچھا دیکھو لڑکی بہت ہے۔ یہاں قریب ہی میری ایک دوست کا گھر ہے۔ بہت بڑی نفسیات دان ہے بہت زبردست۔ پڑھی لکھی واقف کار، بڑی سمجھدار۔ چل کے وہاں چائے پانی پیتے ہیں اور تمہارے مسئلہ کے بارے میں اس سے ڈسکس کرتے ہیں۔ اسکے پاس کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ہوگا۔

سین (۳)

دونوں خواتین ایک خوبصورتی سے سجے سجائے گھر میں داخل ہوتی ہیں

Both women enter a house a nicely furnished drawing room.

گھر کی مالکہ 35-40 سال کی بھرے بھرے جسم کی عورت ہے جو انہیں دیکھ کر Welcome کرتی ہے۔

ماہرِ نفسیات کپاڈیا: السلام علیکم آج آپ کہاں سے راستہ بھول گئیں یہ ساتھ کون ہے آپ کے؟

بڑی کپاڈیا: ساتھی ہوں۔ میں پارک میں واک کر رہی تھی کہ

ماہرِ نفسیات کپاڈیا: ماشا اللہ ماشاللہ آپ کی واک کی عادت سے میں بڑی Inspiration لیتی ہوں مگر واک نہیں کرتی۔۔۔۔ ڈانس کرتی ہوں۔۔۔۔ ایسے ہی تھا۔ تھیٹ تھیٹ تھی۔ (وہ ہاتھ جوڑ کر ٹوڑے لیتی ہے اور ہنستی جاتی ہے)

بڑی کپاڈیا: یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اللہ کرے زور اور ڈانس اور زیادہ یہ لڑکی وہاں اندھیرے میں ایک بینچ پر بیٹھی رو رہی تھی۔

ماہرِ نفسیات کپاڈیا: رو رہی تھی؟ کیوں؟ خیریت؟

بڑی کہانی: دکھی ہے بے چاری۔ اس کے میاں نے اسے مار کر گھر سے نکال دیا ہے۔ دکھیاری کب سے روئے چلی جا رہی ہے۔ میں نے سوچا تمہارے پاس لے آتی ہوں۔ مل کر سوچتے ہیں کہ اسکا کیا کیا جائے؟

ڈیزائنر کہانی (بڑی سے مخاطب): آپا، یاد ہے پچھلی بار جو آپ نے بیرون وطن کا صوفہ دیکھا تھا ___ وہی جو اس کونے میں پڑا ہوا تھا ___ پتہ ہے میں نے اسے پچاس ہزار میں سیل کر دیا ہے ___ (خوشی سے آنکھیں چمکنے لگ جاتی ہیں) مزا آ گیا ___ I am great

(ہنستی ہے۔)

بڑی کہانی: واہ ___ very smart ___ مبارک ہو ___ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ یہ لڑکی ___

mute ___

اس دوران لڑکی مسلسل آنسو بہائے جا رہی ہے۔ بڑی کا دل اسے دیکھ دیکھ کر پسیج رہا ہے۔ وہ بار بار اس کو تھپکتی ہے پھر اشارہ کرتی ہے کہ اس کا کیا کریں۔ ڈیزائنر اپنے ہی دھیان میں ہے ___ اور اسکا دھیان اپنے کام اپنی Achievment پہ ہے۔

ڈیزائنر کہانی: ہائے آپا جی، نیا ارک سے نیا کیٹلاگ آیا ہے۔ فرنیچر کا دکھاؤں؟ ہائے کیا خوبصورت کلرز ہیں۔ بیرون گولڈ، برگنڈی ___ واؤ ___ موٹے موٹے Soft صوفے نرم نرم میری طرح ___ مضبوط اور پکے آپ کی طرح ___ (جھوم جھوم کر ادائیں کرتی ہے)

بڑی کہانی: وہ میں کہہ رہی تھی اس بے چاری کے پاس جانے کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے ___ کیوں نہ ہم دارالامان والوں سے کچھ مدد مانگیں۔ فون نمبر ہے تمہارے پاس؟ ___

جوان کہانی: نہیں دارالامان نہیں ___ وہاں تو پتہ نہیں کیا کیا ہوتا ہے۔ بیزاری ہوئی آواز ___ مجھے ڈر لگتا ہے۔

بڑی کہانی: ہمیں اس کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہو گا۔ بڑی پریشان ہے۔

فرنیچر ڈیزائنر اسی طرح چہرے مسکراتے گانے لگتی ہے

جائیں تو جائیں کہاں ___ سمجھے گا ___ کون یہاں

درد بھرے دل کی زباں ___

ایک دم سنجیدہ ہو کر اپنے maid کو آواز دیتی ہے ___

رشیدہ ___

رشیدہ ___ باجیوں کے لیے ٹھنڈا ٹھنڈا شربت لاؤ۔ بڑی پیاسی ہیں بے چاریاں ___

رشیدہ آتی ہے شربت کے دو گلاس رکھ کر جانے لگتی ہے

ڈیزائنر کہانی: آپ دونوں میری Exhibition پہ تو آ رہی ہیں نا ___ لگے ہوار ___ باجی آپ اپنی اس نئی دوست کو بھی ساتھ لائیے گا ___

بڑی کہانی: اس کے میاں نے ___ (پھر اس کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش ___)

ڈیزائنر کہانی: پہلی بار لڑکی کو مخاطب کر کے ___ آپ اپنے ماں باپ کے پاس چلی جائیں۔ ان کے سوا آپ کو کون سہارا دے سکتا ہے؟ آپ کے پرابلم کا بس یہی ایک حل ہے ___ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

جوان کہانی: وہیں جا رہی تھی مگر وہ ہر بار مجھے میرے میاں کے پاس واپس بھیج دیتے ہیں۔ بھائی بھابی کہتے ہیں میاں کے گھر سے تمہارا جنازہ ہی نکلنا چاہیے۔ تم پہلے کیوں آ جاتی ہو۔

ڈیزائنر کہانی: خیر جنازے میں تو میرا خیال ہے ابھی بڑا ٹائم ہے۔ اس دوران زندگی میں آپ کیا کریں گی؟ میرا مطلب ہے کچھ سوچا ہے۔

جوان کہانی: میں تو بڑی نماز روزے کی بڑی پابند ہوں۔ پھر پتہ نہیں اللہ نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ (رونے لگتی ہے)

ڈیزائنر پاس کھڑی رشیدہ کو مخاطب کر کے کہتی ہے

رشیدہ تو ذرا اس باجی کو اپنی کہانی سنا۔ تو یہاں کیوں کام کرنے آتی ہے آرام سے گھر کیوں نہیں بیٹھ جاتی؟

رشیدہ: بی بی جی کی دساں۔ او جیہڑا میرا گھر والا ہے نشہ کر کے مینوں مار دا اے۔ تے فیر گھروں وی کڈ دیندا اے۔ تے بچے نئیں دیندا۔ میں فیر گھار مڑ آئی آں کر بچے نیں میرے اونہ ہوندے تے میں کروں دی کجھ کھا کے سو رہندی ___ پائی دا تکل اپنے اے تیا لبھدی ___ (رونے لگ جاتی ہے)

تمہارے بچے ہیں؟ لڑکی کو مخاطب کرتی ہے

لڑکی: نہیں

رشیدہ: تے فیر لت مار تے دفع کر او نوں ___ میں کی ہوندی تے کدی نہ اوں دے نال رہندی۔ ساڈے غریباں دے تے نصیب ای خراب نیں۔ (کمرے سے باہر آنسو پونچھتی چلی جاتی ہے)

لڑکی: اس طبقے میں تو ایسی باتیں ہوتی ہیں مگر میں ___ بس میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ میں نے تو کبھی اپنے میاں یا ماں باپ کی نافرمانی تک نہیں کی۔ پھر اللہ مجھے کس بات پہ سزا دے رہا ہے ___

ڈیزائنر کہانی (بڑی سے خوش مزاجی سے): تائیں آپ کی Job کیسی جا رہی ہے آپکی پروموشن کا کیا ہوا؟ ___ یا چھوڑ دیا آپ نے؟

بڑی کہانی: ہاں سب ٹھیک ہے ___ اچھا تاؤ کسی NGO یا کسی آرگنائزیشن سے صحیح رابطہ کریں اس کیلئے۔

(Concerned لہجے میں) اسے ایسے کیسے چھوڑ دیں ___

ڈیزائنر کی بچی آتی ہے۔ سات آٹھ سال کی بچی ___

بچی: امی امی مجھے آئس کریم کھانی ہے۔۔۔۔

رشیدہ کی بی بی کی۔

ڈائریکٹر کہانی: اسے آئس کریم لے دو۔۔۔۔

ممی رشیدہ کے ساتھ جاتی ہے اور آئس کریم لے کر چاٹتی ہوئی واپس آجاتی ہے۔۔۔۔ (اچھلتی کودتی)

ڈائریکٹر کہانی: تو کیا آپ کی عمر پانچ تھی؟

لڑکی: ہاں مگر مجھے پتہ نہیں تھا کہ اس کے پہلے سے بیوی بچے موجود ہیں۔۔۔۔

ڈائریکٹر کہانی: بُری ہے۔۔۔۔

آجکل میں ایک ڈانس کلاس میں بھی جا رہی ہوں تا کہ میرا فگر کچھ کم ہو سکے؟ (اپنی موٹی کمر و پیٹ دکھاتی ہے) ممی ذرا ایک ٹھمکا تو لگاؤ۔ وہ ڈانس کر کے دکھاتی ہے۔۔۔۔ چھوڑو ہوا کہ ٹھاک کو آپ بھی میرے ساتھ اس ڈانس کلاس میں آئیں نا۔۔۔۔ سچ بڑا مزا آتا ہے۔ exercise بھی اور Fun بھی۔۔۔۔ (گھوم کر چکر لیتی ہے)

بڑی کہانی: پھر اس کا کیا کریں؟۔۔۔۔ پھر لڑکی کی طرف اشارہ

ڈائریکٹر کہانی: دیکھیں جی آپ اور ہمت سے کام لیں۔ حالات کا مقابلہ کریں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ گھر گھر کی کہانی ہے۔۔۔۔ ہائے اللہ میرے سٹار پلس کے ڈرامے کا آج کا اپی سوڈ اتنا fantastic تھا کیا بتاؤں۔۔۔۔

لڑکی اب چپ ہے۔۔۔۔ خاموش ہے۔۔۔۔

ڈائریکٹر بچی کو آواز دیتی ہے۔۔۔۔

ممی ادھر آؤ۔۔۔۔

بچی آئسکریم چاٹتی چلی آتی ہے

ڈائریکٹر کہانی: کم آن پیاری سویٹ آنٹیوں کو بتاؤ تمہارے پاپا مجھے کیسے مارتے ہیں؟

دونوں خواتین چونک کر اسے دیکھتی ہیں

ممی (معصومیت سے) وہ آپ کو کبھی جوتی اور کبھی ڈنڈے سے مارتے ہیں۔

ماں: اور اس روز کچن میں کیا ہوا تھا؟ (مسکرا کر)

بچی: انہوں نے پہلے آپ کے بال نوچے اور پھر زمین پہ دھکا دے کر گرایا بھی تھا۔

بڑی کہانی: (حیرت سے) تمہیں میں نہیں مانتی مگر کیوں؟ تم اتنی بڑی established فرنیچر ڈائریکٹر ہو۔ ہر طرح سے خوشحال ہو، آپ خود کماتی ہو تو پھر؟۔۔۔۔

ڈائریکٹر کہانی: شوہر وہ ہے میرا ایمان۔ پالتی ہوں اس کو پھر بھی دیکھ لو۔۔۔۔ دراصل اسے گھاٹ گھاٹ پانی پینے کا شوق ہے اور وہ بے جوڑ اوہ کہتا ہے عورتیں بس اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں تو وہ کیا کرے۔ بس اتنی بات!!!

☆

بقیہ: نقش بر سنگ

چھوٹا شہر تھا لوگ جلد سو جاتے تھے۔ ایک رات تقریباً دس بجے جب لوگ سونے کے لئے چلے گئے تھے باہر گلی میں شور مچا۔ رضیہ چیخ رہی تھی "ارے کوئی اسے بچاؤ ارے اسے روکو!!" لوگوں نے نکل کر دیکھا کہ اظہر نے رضیہ کی کھڑکی کے سامنے اپنے اوپر مٹی کا تیل چھڑک لیا ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اس کے نزدیک پہنچتا اس نے دیا سلائی جلا کر خود کو آگ دکھا دی۔ آگ کا آگ کے شعلوں نے اسکو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کوشش کے باوجود آگ پر قابو نہ پایا جا سکا اور چند لمحوں میں اس کا تمام جسم جھلس گیا۔ اسی سنگین حالت میں اسے ہمارے ہسپتال میں لایا گیا تھا۔

سنا ہے کمزوری اور بیہوشی کی وجہ سے جب تک اسکی آواز بند نہ ہو گئی وہ جلتے جلتے یہی کہتا رہا "دیکھو رضو آپا میں نے کہا تھا کہ مٹی کا تیل چھڑک کر خود کو آگ لگا لوں گا" میں، جس نے اپنے پیشہ میں سترہ اٹھارہ برس کے عرصہ میں یہ حلف اٹھایا ہے کہ ہر زندگی کو بچانے کی پوری پوری کوشش کروں گا اور دنیا میں انسانی زندگی سے زیادہ کسی اور چیز کو قیمتی یا اہم نہیں سمجھوں گا سوچتا ہوں جذبات کے تیز دھارے میں کیسی قیمتی زندگیاں چند لمحوں میں خاک میں مل جاتی ہیں۔ معلوم نہیں کیوں اور کیسے اظہر کے دل پر رضیہ کا ایک ایسا نقش ثبت ہوا جو مٹ ہی نہیں سکا اور وہ پتھر پہ نقش کی طرح راسخ ہو گیا۔ اسکو مٹانا ممکن ہی نہیں تھا اور اسے مٹانے کے لئے اظہر کو اپنی زندگی ہی کو مٹانا پڑا۔

"سورج کی صلیب" کے بعد

صبا اکرام

کی نظموں کا مجموعہ

"آئینے کا آدمی"

سن ۱۹۶۰ء کے بعد کی اردو نظم پر

تفصیلی بحث کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

رابطہ: C-102 روفی سوئٹ ہومز

گلشن عمیر و یلیں کلب

کراچی۔ 75280 (پاکستان)

رس رابطے — مجموعہ ترتیب و تدوین: وقار جاوید (راولپنڈی)

بھائی گلزار جاوید، سلام و رحمت

آپ نے چہارسُو کے تازہ شمارے میں ماہیت کی شخصیت و فن پر جس محنت، محبت، خلوص اور سلیقے و قرینے سے جو خاص گوشہ ترتیب دیا ہے اس سے دوست، دشمن سب اپنے اپنے ذوق کے مطابق لطف اٹھا رہے ہیں۔ یہ بھی آپ کی کامیابی اور ادبی صحافت پر آپ کی غیر معمولی گرفت کا ثبوت ہونے کے ساتھ اپنے کام سے آپ کی لگن کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ انٹرویو کی بابت تو آپ کے سوالات پڑھ کر میں بھی حیرت میں مبتلا ہو گیا کہ آپ تو مجھے خود مجھ سے بھی زیادہ جانتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ خداوند کریم آپ کو تا دیر سلامت رکھے اور آپ دونوں ملکوں کے درمیان اسی طرح رابطے کا وسیلہ بنے رہیں۔

خلیق انجم (دہلی بھارت)

گلزار جاوید، خوش رہو

چہارسُو حسب معمول بہتری کی جانب گامزن ہے کچھ تو چاہتا ہے کہ کہاں تک تمہاری تعریف کی جائے۔ ساتھ، چہارسُو میں جن احباب نے میری نظم "دھمکی" بابت بے نظیر بھٹو شہید کو پسند فرمایا ان سب کا تہہ دل سے شکریہ خاص کر جناب محمود شام جیسے معروف و معتبر سخن ور و سخن شناس کی پذیرائی بہت حوصلہ افزا ہے۔

شبنم شکیل (اسلام آباد)

محترم گلزار جاوید صاحب آداب و نیاز

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ یہ شمارہ اس اعتبار سے میرے لیے انمول ہے کہ اس کے مشمولات کا ایک چھوٹا سا حصہ میں بھی ہوں اور اس کے اوراق پر اپنی موجودگی کو میں قابل فخر و مسرت خیال کرتا ہوں۔ یہ شمارہ میری نگاہ میں اس لیے بھی بے حد اہم ہے کہ اسے میں اپنے اور چہارسُو کے درمیان ایک اٹوٹ ادبی رشتے کی بنیاد سمجھتا ہوں۔ قرطاس اعزاز پر ڈاکٹر خلیق انجم ماہ کامل کی مانند جگمگا رہے ہیں۔ استاد رسا دہلوی پر ڈاکٹر صاحب کا خاکہ بے حد دلچسپ ہے اک مختصر تحریر میں ایک پورے عہد کی عکاسی ہے۔ آپ کے ذریعے لیا گیا موصوف کا انٹرویو "براہ راست" پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ گفتگو کی ابتداء سے پہلے علامہ اقبال کے ایک مشہور و مقبول شعر کے ہمراہ آپ نے ایک پیراگراف کی جو تمہید پیش کی ہے وہ دلکش بھی ہے اور Impressive بھی۔ اس تین کوشے کے آئینے میں ڈاکٹر خلیق انجم کی شخصیت کے بہت سے اہم پہلو قارئین کے سامنے آتے ہیں۔ اس شمارہ کا قرطاس اعزاز کے نام کر کے ادارہ چہارسُو نے نہ صرف ادبی دیانتداری بلکہ ادب شناسی کا بھی بہترین اور روشن ثبوت پیش کیا ہے اس کے لیے یقیناً آپ تحسین کے مستحق ہیں۔ افسانوی صفحات پر ڈاکٹر رینو بہل، فرخندہ شمیم، جتندر بلو اور ناصر بغدادی کی تخلیقات متاثر کرتی ہیں۔ یہ بھی قلم کار مختلف رسائل و جرائد کے توسط سے اکثر میرے مطالعے میں آتے رہتے ہیں۔ محمود الحسن، سید مشکور حسین یاد، مظفر حنفی، ڈاکٹر انور سدید، کرشن کمار طور، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور غالب عرفان کی غزلیات ذہن میں روشنی بکھیر رہی ہیں۔ آپکا ڈرامہ "اندھے کو اندھا ملے کر کر لمبے ہاتھ" ایک خوبصورت اور بامقصد تحریر ہے اسلوب بیان کی کشش قاری کو پورا ڈرامہ ایک ہی نشست میں پڑھنے پر مجبور کر دیتی ہے اس کامیاب تحریر کے لیے مبارکباد قبول فرمائیں۔

مراق مرزا (ممبئی بھارت)

برادر عزیز گلزار جاوید صاحب سلام علیکم

چند روز قبل آپ کی سوغات ''چہارسُو'' کے تازہ شمارے کی صورت میں نظر نواز ہوا جس کے لیے ممنون ہوں۔ یقیناً ڈاکٹر خلیق انجم کے اعزاز میں آپ کا خصوصی نمبر بھی اپنی گراں قدر روایتوں کا امین ہی ٹھہرے گا۔ ان سے میری آخری ملاقات نومبر ۲۰۰۷ء میں نئی دہلی میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ہوئی تھی وہ اپنے ایک مختصر سے اس کمرے میں براجمان تھے جس کے اطراف کی زمین انجمن ترقی اردو کے دفتر کے لیے مختص تھی اور شاید تعمیراتی کام بھی شروع ہو چکا تھا اچھی طرح یاد نہیں لیکن آدھا گھنٹہ تو ہم نے ان کی خوش اخلاقیاں کھلی ہوئی شیریں گفتگو سے لطف اندوز ہونے کا شرف حاصل کیا تھا۔ اب آپ نے ان کا تعارف اس انداز میں کروایا ہے کہ بے اختیار ان کی ذات با صفات کے لئے ایک صحت مند طویل عمری کی دعائیں پر نکل رہی ہے آمین! یوں تو ان کی بذلہ سنجی مشہور ہی ہے لیکن اردو کے لئے انہوں نے جو کار ہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے اور ذوق کے حوالے سے ان کی تک وو بہت ہی اہم معلومات کا خزانہ ہے اور اس کی اگلی قسط کا انتظار ہے بہ لوکرم ہے اقتدا تک جاری رکھئے۔ ان کی خاکہ نگاری کے بارے میں کم دیکھا تھا لیکن استاد رسا دہلوی پر ان کی شگفتہ تحریر نے تو شروع سے آخر تک میری دلچسپی برقرار رکھی اور دلی کے ماضی کو قلم کی طرح میری نظروں سے گزار دیا۔ ناصر بغدادی تو ویسے بھی یکتائے روزگار بنا رہتے ہیں "وراثت" میں وہ ایک بار پھر اپنے قلم کی عظمت اور فکری بلندی کے ساتھ نظر آ رہے ہیں۔ آج کے مادر پدر آزاد معاشرے کا یہ چبھتا ہوا موضوع جسے مصنف نے افسانے کے روپ میں ڈھالا ہے یقیناً اندوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ جتندر بلو کا قلم اب جنس سے ہٹ کر انسانی وطن کے ملتے ہوئے موضوعات کی طرف مڑ گیا ہے "دیس پردیس" میں انہوں نے جس خوبی سے وطن کو بھول جانے والوں کے حشر کو نمایاں کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ افسانہ پسند آیا ان کا سفر اسی راستے پر جاری رہنا چاہیے۔

غالب عرفان (کراچی)

قابل قدر اور محترم جناب گلزار جاوید صاحب

''چہارسُو'' باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ یہ رسالہ اُردو زبان کی محبت کے لیے مرجع خلائق ہو رہا اور پڑھنے والوں کے لیے کتاب مقدس سے کسی قدر کم نہیں۔ رسالے کو پڑھتے ہیں بار بار پڑھتے ہیں اور ساتھ ساتھ اگلے شمارے کے انتظار میں آنکھیں بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پاکستان کی طرف سے ہندوستان کو یہ

ایک بیش بہا عطیہ ہے ہمیں۔ بیحد اچھا رسالہ ہے۔ خدا تعالیٰ سے التجا ہے
کہ وہ آپ سب کو ہمیشہ صحت یاب رکھے اور عمر خضر بخشے۔
راجندر ورما (سنگرور بھارت)

قابلِ احترام جاوید صاحب آداب
"چہارسُو" کا تازہ شمارہ (جولائی اگست 2008) بذریعہ ڈاک
موصول ہوا۔ "چہارسُو" کیا ہے بس یوں سمجھئے کہ خوبصورت اور دلنشین مضامین،
مقالوں، نظموں، غزلوں، افسانوں اور دیگر تحریروں پر مشتمل حسین گلدستہ ہے
جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ یوں تو شاعری کا سیکشن کئی خوبصورت
نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے لیکن مجھے میگزین کے صفحہ 85 پر محترم سرور انبالوی
کی غزل بڑی پسند آئی غزل کے درج ذیل دو اشعار تو واقعی لائق پسند ہیں۔

ہزار پردوں سے چھن کر نظر تک آ پہنچا
کبھی چھپا ہے بھلا حسن بھی حجابوں میں
سرور اشک بھی آنکھوں میں اب نہیں باقی
کسی کی یاد بھی آئی ہے کن سرابوں میں

بہرام طارق (اسلام آباد)

بھائی گلزار جاوید صاحب، اسلام علیکم
اس بار رالف رسل سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میں عموماً برٹرنڈ
رسل اور رالف رسل میں گڑبڑ کر جاتا تھا۔ اب ذہن میں رالف رسل کا تصور واضح
ہو گیا ہے۔ ماشاءاللہ کیسے کیسے ذہین اور بے ریا لوگ اردو ادب کی خدمت میں
لگے ہوئے ہیں۔ انھوں نے جن کتابوں کے کام گنائے ہیں ان میں سے بیشتر
ہمارے ایم اے کے طلبہ کے مطالعے میں کم ہی آئے ہوں گے۔ رالف رسل کا یہ
جملہ کڑوی سچائی کا غماز ہے یعنی "ہر سیاسی پارٹی کا ہر لیڈر جھوٹا ہوتا ہے"۔ رالف
نے ڈپٹی نذیر احمد کی کتابوں کے سلسلے میں "موعظۂ حسنہ" کا نام بھی لیا ہے۔ یہ
مجموعہ دراصل ان خطوط پر مشتمل ہے جو نذیر احمد نے اپنے بیٹے میاں بشیر احمد کو
لکھے تھے۔ میرے کتب خانے میں اس کا 1971 کا چھپا ایڈیشن ہے۔ ڈاکٹر وجئے
آرا نے رالف سے ملاقات اور پھر ان کی سوانح FINDINGS
KEEPINGS کا جو حصہ یابندہ کے عنوان سے اردو میں ترجمہ کرنے کا جو
احوال لکھا ہے وہ بہت دلچسپ ہے۔ مجھے سوانح عمریاں پڑھنے میں بہت دلچسپی
ہے۔ دوسروں کی زندگی کے واقعات کی روشنی میں ہم ایک بہتر زندگی گزار سکتے
ہیں۔ میں نے "چہارسُو" ایک نشست میں پڑھ لیا۔ نوید سروش کی کہانی کا عنوان
"مخبر" ہوگا۔ غلط نوازی کی پینگ کی حمایت ہوگی۔ "دشتِ نو لب" کے کیا کہنے۔
آپ کو تو اچھا لکھنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ آپ کا یہ انکسار اچھا لگا کہ آپ نے
اپنی کہانی آخر میں شائع کی۔ جب کہ یہ کہانی اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔
رؤف خیر (حیدرآباد)

برادرم گلزار جاوید صاحب آداب
"چہارسُو" مل گیا تھا۔ اب یہ پرچہ بھی اکثر مستقل اردو ادب کا نمائندہ
کہلا سکتا ہے۔ انٹرویو کا سلسلہ اچھا ہے اس شمارے میں آپ کا افسانہ بھی پڑھا۔
آپ نے اپنے اسلوب افسانہ نگاری میں انشا پردازی کو شامل کر کے ایک نیا
ذائقہ متعارف کروایا ہے جس طرح کرشن چندر نے رومانویت، منٹو نے بیباکی
جملہ بازی اور گہری طنز، ندیم نے شعریت اور یوں نہ صرف اپنی اپنی انفرادیت
بنائی بلکہ افسانے کو بھی نیا رنگ دیا۔ اب افسانے میں انشا پردازی کو شامل کر کے
آپ نے بھی عصری افسانے کو ایک نئے ذائقے سے بھی مالا مال کیا ہے اور اپنی
انفرادیت بھی بنائی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ شمارہ بھی بہت لائق تحسین ہے
اکبر حمیدی (اسلام آباد)

محترم گلزار جاوید صاحب، اسلام علیکم۔
زیرِ نظر شمارے میں ڈاکٹر خلیق انجم کا گوشہ قابل مطالعہ ہے۔ ڈاکٹر
صاحب کی تصنیفات و تالیفات کی فہرست دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کیا وہ ساری
زندگی لکھتے ہی رہے ہیں۔ بلاشبہ وہ ادب میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ ان پر لکھے
گئے مضامین اور انٹرویو سے ان کی ادبی خدمات سے واقفیت حاصل ہوئی۔ ایسے
نامور ادیب، محقق اور نقاد کا گوشہ نکال کر آپ ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ خدا
آپ کو ہمت و توانائی عطا فرمائے۔
صابر عظیم آبادی (کراچی)

محبِ گرامی قدر گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔
"چہارسُو" شمارہ جولائی اگست 2008ء نظر نواز ہوا۔ شکریہ۔ ہمیشہ کی
طرح اس بار بھی چہارسُو خوب بلکہ بہت خوب ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی
شخصیت طرح دار ہے جبکہ ان کے تحریر کردہ مضامین اور استاد رسا دہلوی کا خاکہ
خاصے کی چیز ہیں۔ آپ نے ڈرامہ "خوشبو کو ملاحظہ" کر کر لیے "ہاتھ" بھی
بڑی محبت سے تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر ساحر عاشق ہرگانوی، منظر حنفی، کرشن کمار طور،
ظہیر ناصری، کنول عاجزی پوری اور ویکیندر پٹیل تشنہ کا کلام دل کو بھا گیا ہے۔
حفیظ انجم (کریم نگر بھارت)

عزیز محترم، سلام و رحمت،
چہارسُو اس بار ملا تو کیلنڈر پر "یک ہندی گھون" معنی خیز
مسکراہٹ لئے کچھ یہی تاریخ ۔۔۔۔۔ سال آٹھ کے حصار میں تھے! یہ مقام
مسرت و اعزاز ہے کہ "چہارسُو" کی منظوم پذیرائی کی خوشگوار روایت پڑ گئی چلی
جارہی ہے۔ ظفر صہبائی صاحب کا منظوم خراجِ تحسین "مجاہد اردو" حقیقت کی
صداقت سے عکاسی کرتا ہوا محسوس ہوا۔ "براہِ راست" میں آپ کا ڈاکٹر خلیق
انجم صاحب سے مکالمہ بہت بھرپور بہت ہمہ گیر رہا۔ دراصل آپ اپنے ممدوحین
کی زندگی کا کوئی بھی نجی و فنی پہلو تاریکی میں رہنے نہیں دیتے اور صاحب
قرطاس اعزاز سے بالمشافہ تکلم کا احساس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب خوش قسمت ہیں
کہ انہوں نے والدۂ محترمہ کی دعاؤں و رہنمائی سے اپنی شخصیت کی تہذیب و
تربیت کے لیے بھرپور استفادہ کیا۔ فی زمانہ کسی کا صاحبِ عزت ہونا کسی نعمت
غیر مترقبہ سے کم نہیں کہ اس نایاب و کمیاب جنس سے بہت سے کڑوے پیچ
و ترش حالات و واقعات قابلِ برداشت کرتے جاتے ہیں یا ہو جاتے ہیں۔ اس

کی باتوں میں ـــــ سے بھی ڈاکٹر صاحب کی شگفتہ بیانی، بذلہ سنجی اور حاضر دماغی کا یہ ان احباب علم ہوا، "ہم سے مشتاق کہاں"ــــ ڈاکٹر صاحب نے جس سائنٹیفک انداز کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے "غالب کا سفر کلکتہ و غالب کے خطوط کے ضمن میں تحقیق و تنقید"، "ترتیب، تدوین کو دلائل و دستاویزات، تاریخی بیانات سے ماخوذ نتائج کو رواں دواں شگفتہ اسلوب میں پیش کیا بلاشبہ اس غیر معمولی محنت شاقہ اور جگر کاوی نے "غالب شناسی" کا حق ادا کر دیا جس کے لیے پوری دنیا اُردو داں کی منفرد و معتبر مسائل غالب کے لیے ممنون و مشکور رہے گی!

"دیس پردیس" سچے حقائق پر بنی کہانی اس حقیقت کے گرد گھومتی ہے کہ بدیس کی شہریت و حقوق کے حصول کے باوجود اپنے دیس کی ثقافت و چھاپ کو خود سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور بعض اوقات اس کی زد میں آ کر کسی بھی قسم کی صورت حال سے دوچار ہونا یقینی امر ہے ــــ "ایک خواہش، ایک سوال" کا انجام غیر متوقع نکلا۔ عجلت کیا گیا شاید ایسی ہی کسی تجسس کیلئے ساحر لدھیانوی کہہ گئے۔

وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اُسے اک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا

"ادب کا آدمی" میں اسد محمد خاں صاحب کی گفتگو بھر آسمان اور "یا سودے کی مریم" کے بارے میں تاثرات و تجربات پڑھنے لگے۔ یہ تو کچھ پڑھ کر رکھا تھا کہ بلا کو بلا ملے ــــ مگر ــــ "لوہے کو لوہا کاٹے" کا تعارف آپ کے ادارے سے ہوا جس میں ماہنجا پیر صاحب نے شیخ اور پیس وحاکی اور اُن کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا ــــ ایسے جعلی پیروں و جعلی مرشدوں کے مکروہ کا پیٹ ہو کہ توڑنا وقت کی اہم ضرورت اور معاشرے کی بہت بڑی خدمت ہے کیونکہ ایسی چشم کشا تحریروں سے آگہی بڑھتی ہے اور بھٹکنے والوں کو روشنی بھی ملتی ہے محترم احمد فراز صاحب کے دنیائے ادب سے رخصت ہونے کا ملال ہے انہی کے شعر کے ساتھ اجازت۔

سنا ہے اس کے لبوں کا تراش ایسا ہے
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں

شگفتہ نازلی (لاہور)

محترم گوہر جاوید صاحب، اسلام علیکم۔

تازہ "چہارسُو" کی ترسیل کے لیے آپکا بے حد شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر خلیق انجم عصر حاضر کے نابغۂ روزگار تحقیق کا درد و تحقیق ہیں اُن کے حوالے سے آپ نے جو قرطاس اعزاز محنت اور محبت سے ترتیب دیا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ "چہارسُو" کے قرطاس اعزاز ریسرچ اسکالرز کے لیے بنیادی ماخذ کا کام دیں گے۔

سجاد مرزا (گوجرانوالہ)

محترم بھائی گوہر جاوید صاحب! سلام و نیاز

اس بار آپ نے اردو کے ایک انگریز اسکالر اور ادیب پروفیسر رالف رسل کو قرطاس اعزاز سے نوازا ہے۔ بہت خوب! زندگی بھر کی محنتوں کا ثمر انہیں مل گیا۔ موصوف نے اردو کی جو بے لوث خدمات انجام دی ہیں ان کے عوض اس سے بہتر صلہ اور بھی کیا سکتا ہے۔ "براہ راست" کے عنوان سے آپ نے ان کے ساتھ جو مکالمہ کیا ہے اس سے ان کے بارے میں ڈھیر ساری بلکہ یہ کہیے کہ ساری کی ساری معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس طویل و بسیط مکالمے کے ذریعے پیش کی جانے والی ان کی باتوں پر یقین کیا جا سکتا ہے لیکن کہیں کہیں ایسی باتیں بھی ان کی زبان پر آ گئی ہیں کہ جنھیں تسلیم کرنے میں کچھ تامل ہوتا ہے۔ مثلاً اردو کے تعلق سے ایک تجربے کی بات انھوں نے یہ بتائی ہے کہ وہ اردو کی کسی تخلیق کا ترجمہ اردو میں کرتے ہیں تو ان کے ہم وطن انگریز قارئین ان سے پوچھتے ہیں کہ یہ اردو کن کی زبان ہے۔ میرے خیال سے یہ کچھ مبالغہ آمیز بات ہے۔ رالف رسل صاحب تو اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ برٹش حکومت کے عہد میں اردو ہندوستان کی سرکاری زبان تھی۔ انگریز ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کے حکمراں تھے اور یہاں کے مقامی لوگ محکوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ حکمراں قوم کے فرد محکوم قوم کے بارے میں کچھ جانیں یا نا جانیں لیکن ان کی زبان کے بارے میں وہ ضرور جانتے ہیں۔ ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد انگریز افسروں کو اردو سکھانے کے لیے ہی ڈالی تھی۔ ہندوستان کی انگریزی فوج میں بڑے عہدے پر فائز رہنے والے رالف رسل صاحب کو اس بات کا علم اچھی طرح ہوگا۔ پھر انگریز قوم تو بڑی ہوشیار اور چالاک قوم مانی جاتی ہے ایسے میں رالف رسل کے اس بیان پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے تمام لیڈروں کو غلط قرار دیا ہے یہ بھی ایک انتہا پسندانہ رائے ہے۔ "شادم از زندگی خویش" میں رالف رسل صاحب نے ملی اردو کی تحریر و تقریر میں در آنے والے کچھ الفاظ مثلاً "فرمایئے" اور "تشریف لایئے" وغیرہ سے بیزاری ظاہر کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو کے لوگ فرمایئے کی جگہ پر کہیے اور تشریف لایئے کی جگہ پر آیئے کیوں نہیں بولتے۔ رالف رسل صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہر زبان کا اپنا ایک مزاج اور اپنی ایک تہذیب ہوا کرتی ہے انھوں نے اردو کے جن الفاظ پر اعتراضات جتائے ہیں ان کا تعلق اردو کے مزاج اور اس کی تہذیب سے ہے۔ رالف رسل صاحب اردو کے اسکالر تو بن گئے لیکن اردو کے مزاج اور اس کی تہذیب سے واقف نہ ہو سکے۔ انھوں نے انگریزی کے آئینے میں اردو کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی ہے لہٰذا انھیں نتیجہ خاطر خواہ نہیں مل سکا۔ بہر حال ان تسامح اور تساہل کے باوجود گوشہ بہت بھرپور اور معلوماتی ہے۔ رالف رسل صاحب نے پروفیسر خورشید الاسلام صاحب کے اشتراک سے Three Mughal Poets کے نام سے جو کتاب قلمبند کی ہے ان کا بڑا کارنامہ انجام دیا جا سکتا ہے۔ ان کی خود نوشت کو ڈاکٹر ارجمند آراء نے خوبصورت اردو کا جو جامہ عطا کیا ہے اس کے بارے میں معلومات ان کے مضمون "جو نہ رہا بندہ" سے حاصل ہوئیں۔ محمود ہاشمی صاحب کا مضمون "گنج گرانمایہ" بھی رالف رسل کی شخصیت کا بھرپور جائزہ اور تعارف پیش کرتا ہے کہنے کا مطلب یہ کہ اس سے بہتر گوشے کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔

ایوب واقف (ممبئی، بھارت)